DR ZORE KI ADABI NIGARISHAT KA TAHQUEQI WO TANQEEDI JAEZA

THESIS

Submitted to the **UNIVERSITY Of HYDERABAD**
In partial fulfillment of the requirement for the
award of the degree of **DOCTOR OF PHILOSOPHY**
In Urdu
November 2015

SUBMITTED
BY

Nikhat Aara Shaheen
M.A,M.Phil, (Urdu)

SUPERVISED
BY

Dr. Mohammed Anwaruddin
Professor Department of Urdu
University of Hyderabad

DEPT. OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD, HYDERABAD –500046

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD,
HYDERABAD 500046

CERTIFICATE

This is to certify that dissertation entitled **DR ZORE KI ADABI NIGARISHAT KA TAHQUEQI WO TANQUEEDI JAEZA**(Research and Critical Study of the Literary Writings of Dr Zore)submitted by **Nikhat Aara Shaheen**, bearing Reg No 04HUPH 04 in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu is original and the work has been carried out by her under my supervision and guidance. The dissertation has not been previously in part or in full submitted for any degree or diploma to this University or any other institution.

Hyderabad:
Date:

Prof. **Mohammed Anwaruddin**
(Research Supervisor)

Head Department of Urdu,
University of Hyderabad.

Dean, School of Humanities,
University of Hyderabad.

DEPARTMENT OF URDU
SCHOOL OF HUMANITIES
UNIVERSITY OF HYDERABAD,
HYDERABAD 500046

DECLARATION

I hereby declare that the work embodied in this dissertation entitled **DR ZORE KI ADABI NIGARISHAT KA TAHQUEQI WO TANQUEEDI JAEZA**(Research and Critical Study of the Literary Writings of Dr Zore) is carried out by me under the supervision of **Prof Mohammed Anwaruddin**, Department of Urdu University of Hyderabad, is original and this has not been submitted for any other degree to this University or any other University.

Hyderabad:
Date:

Nikhat Aara Shaheen,

Reg No 04HUPH 04

ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی اردو

مقالہ نگار

نکہت آرا شاہین

نگران

پروفیسر محمد انور الدین

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔ تلنگانہ اسٹیٹ

فہرست ابواب

☆ پیش لفظ 6

☆ پہلا باب۔ڈاکٹر زور حالات زندگی، شخصیت اور کارنامے 22

حالات زندگی اور شخصیت

ڈاکٹر زور کے آباء واجداد، والدین۔ ڈاکٹر زورؔ کی ولادت۔ابتدائی تعلیم۔اعلی تعلیم۔ملازمت۔ڈاکٹر زورؔ کشمیر میں۔شادی۔ شریک حیات۔اولاد۔بیماری اور وفات۔ڈاکٹر زور کی شخصیت۔سراپا۔روزمرہ کے معمولات۔غذائی عادات۔ دوست احباب سے برتاؤ۔شاگردوں سے برتاؤ۔ مزاج کی دیگر خوبیاں

سماجی وتہذیبی خدمات

دکنی تہذیب کے محافظ۔ادارہ ادبیات اردو کا قیام۔سب رس کا اجراء اور اس کی علمی وادبی خدمات۔خانقاہِ عنایت الٰہی کا قیام۔ قلی قطب شاہ تقاریب۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام۔ ایوانِ اُردو کی تعمیر، مختلف ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستگی

☆ دوسرا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات 77

ڈاکٹر زور کی لسانیاتی نگارشات کا جائزہ

لسانیات کی کی تعریف۔ لسانیات کی شاخیں۔صوتیات: معنی ومفہوم۔

ہندوستان میں لسانیات کا آغاز وارتقاء۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات۔

ہندوستانی صوتیات کا تنقیدی جائزہ۔ ہندوستانی لسانیات کا تنقیدی جائزہ

☆ تیسرا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق 112

ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کا جائزہ
تحقیق کی تعریف۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق۔اردو شہ پارے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ دکنی ادب کی تاریخ۔طالب و موہنی کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ تاریخ ادب اردو۔ رمز سخن۔ بادۂ سخن۔ فیض سخن۔متاع سخن۔مرقع سخن

☆ چوتھا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد 152

ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ
تنقید کی تعریف۔تنقید کی روایت۔ ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ۔ روح تنقید۔ اردو کے اسالیب بیان۔ تین شاعر۔ جواہر سخن۔ ادبی تاثرات۔ ادبی تحریریں

☆ پانچواں باب۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری 171

ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری کا جائزہ
دیباچہ نگاری کی تعریف۔ دیباچہ و مقدمہ نگاری کی اقسام۔
اردو میں دیباچہ نگاری کی روایت۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

☆ چھٹواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب 187

ڈاکٹر زور کی مرتبہ کتابوں کا جائزہ
تذکرہ مخطوطات جلد اول۔تذکرہ مخطوطات جلد دوم۔تذکرہ مخطوطات جلد سوم۔
تذکرہ مخطوطات جلد چہارم۔تذکرہ مخطوطات جلد پنجم

☆ ساتواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ 199

ڈاکٹر زور کی سوانحی و تاریخی نگارشات کا جائزہ
سوانح نگاری کی تعریف۔ڈاکٹر زور کی سوانحی نگارشات کا جائزہ۔حیات
سلطان محمد قلی قطب شاہ۔حیات میر محمد مومن۔گارساں دتاسی اور اس کے ہم
عصر بہی خواہان اردو۔ سرگذشت حاتم۔سرگذشت غالب۔ داستان ادب
حیدرآباد۔فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب

☆ آٹھواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار 215

ڈاکٹر زور کی افسانوی نگارشات کا جائزہ
افسانے کی تعریف۔افسانے کی روایت۔ ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کی ابتدا
۔ڈاکٹر زور کے افسانوی مجموعوں کا جائزہ۔طلسم تقدیر۔سیر گولکنڈہ۔گولکنڈے
کے ہیرے۔ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کا عمومی جائزہ

237 ☆ نواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

ڈاکٹر زور کے مکاتیب کا جائزہ
ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار
اردو میں مکتوب نگاری کی روایت
ڈاکٹر زور کے مکاتیب

251 ☆ دسواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

ڈاکٹر زور کی شاعری کا جائزہ
تخلص۔اساتذہ سخن: ابتدائی شاعری۔نمونہ کلام

263 ☆ اختتامیہ

266 ☆ کتابیات

پیش لفظ

پیش لفظ

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو ساری دنیا میں شہر اردو اور گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار شہر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اس شہر اردو میں آنکھ کھولی۔ اپنے گھر کے گہوارے سے اپنی مادی زبان اردو کی مٹھاس لئے اردو ذریعے تعلیم سے اپنا علمی سفر جاری رکھا۔ ایم اے کے بعد یونیورسٹی آف حیدرآباد کے شعبہ اردو سے پروفیسر سیدہ جعفر کی نگرانی میں ''عصمت چغتائی کے ناولوں میں عورتوں کے مسائل''، موضوع پر ایم فل کیا اور پھر اسی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے داخلہ لیا۔ دوران تعلیم مجھے حیدرآباد کی علمی، ادبی، تہذیبی وثقافتی تقاریب میں شرکت کا موقع ملا۔ ایوان اردو اور اردو ہال میں اردو کے سمیناروں اور ادبی اجلاسوں میں شرکت کی۔ مختلف جامعات کے ادبی مقابلوں میں حصہ لیا۔ محفل خواتین کے اجلاسوں اور گنبدان قطب شاہی میں منعقدہ یوم قلی قطب شاہ تقاریب میں عملی طور پر حصہ لیا۔ حیدرآباد میں اردو زبان وادب اور اردو تہذیب کے فروغ میں جامعہ عثمانیہ اور اس کے فرزندان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور اپنے علمی وادبی کارناموں سے نہ صرف ادب کے دامن کو وسیع کیا بلکہ دنیا بھر میں حیدرآباد کی شناخت بنائی۔ حیدرآباد قدیم دور سے ہی دکنی زبان وتہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ قلی قطب شاہ کے بسائے اس شہر کو آصف جاہی سلاطین نے ہر لحاظ سے ترقی عطا کی اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس جامعہ سے فارغ ہونے والے لائق سپوتوں نے دکنی زبان وادب کے تحفظ اور ترویج میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ حیدرآباد کے ایک ایسے ہی لائق سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ہیں جو نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق فرزند ہیں بلکہ ادارہ ادبیات اردو کے قیام اور دکنی زبان و تہذیب کے فروغ میں اپنی گراں بہا خدمات کے سبب وہ دکنی ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں تدریس کی خدمات انجام دیں اور لسانیات، تحقیق، تنقید، تدوین و ترتیب، افسانہ، شاعری وغیرہ کے ذریعے ایک ہمہ جہت شخصیت ہونے کے ان مٹ نقوش چھوڑے۔ دوران طالب علمی میں نے ڈاکٹر زور کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور یوم قلی قطب شاہ تقاریب اور دیگر مواقع پر ڈاکٹر زور کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔ ڈاکٹر زور پر پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر مغنی تبسم اور دیگر اساتذہ اردو نے تحقیقی کام کیا۔ لیکن ڈاکٹر زور کی نگارشات کے تفصیلی مطالعے پر مبنی تحقیقی کام کی گنجائش باقی تھی اور میں اپنے پسندیدہ ادیب ومحسن دکن ومحسن اردو ڈاکٹر زور پر تحقیقی کام کرتے ہوئے ان کی نگارشات کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لانا چاہتی تھی۔ چنانچہ یونیورسٹی آف

حیدرآباد میں پی ایچ ڈی اردو کی ڈگری کے لئے داخلے کے بعد جب میں نے اپنے اساتذہ سے ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' موضوع پر تحقیق کی خواہش ظاہر کی تو موضوع کی افادیت کے پیش نظر اساتذہ نے اس موضوع کو منظور کیا۔ اور میری خواہش پر شعبہ اردو کے ہر دلعزیز استاد پروفیسر محمد انورالدین نے میرے تحقیقی سفر کے دوران میرے نگران کے فرائض انجام دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ موضوع کے انتخاب کے بعد میں نے حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں اور ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے سے ڈاکٹر زور کی تصانیف اور ان سے متعلق مواد اکھٹا کرنا شروع کیا۔ ادارہ ادبیات اردو اور حیدرآباد کی نامور علمی وادبی شخصیات سے ملاقاتوں اور مختلف کتب خانوں سے مواد کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس مقالے کی تیاری میں مواد کے حصول کے لئے جن کتب خانوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں۔

۱۔ اندرا گاندھی میموریل لائبریری	یونیورسٹی آف حیدرآباد۔ گچی باؤلی حیدرآباد
۲۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری	عثمانیہ یونیورسٹی کیمپس حیدرآباد
۳۔ کتب خانہ آصفیہ	افضل گنج حیدرآباد
۴۔ نظام ٹرسٹ لائبریری	ملک پیٹھ' حیدرآباد
۵۔ ادارہ ادبیات اردو لائبریری	پنجہ گٹہ' حیدرآباد
۶۔ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ لائبریری	شیورام پلی' حیدرآباد
۷۔ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی لائبریری	یونیورسٹی کیمپس گچی باؤلی حیدرآباد
۸۔ اردو ہال لائبریری	حمایت نگر' حیدرآباد
۹۔ سٹی گرندھالیہ	نارائین گوڑہ' حیدرآباد
۱۰۔ سٹی گرندھالیہ	نامپلی حیدرآباد
۱۱۔ نجی کتب خانہ ڈاکٹر مغنی تبسم	پنجہ گٹہ' حیدرآباد
۱۲۔ نجی کتب خانہ پروفیسر محمد انورالدین۔	آغا پورہ' حیدرآباد

مواد کی فراہمی اور ابتدائی تحقیقی کام کے بعد میرے مقالے کے ابواب کے تعین کا مرحلہ پیش آیا۔ میرے نگران استاد محترم پروفیسر محمد انورالدین صاحب اور استاذ الاساتذہ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے مشورے سے میرے تحقیقی

مقالے ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے ابواب اس طرح قرار پائے۔

☆ پہلا باب۔ڈاکٹر زور حالات زندگی، شخصیت اور کارنامے

☆ دوسرا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات

☆ تیسرا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق

☆ چوتھا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد

☆ پانچواں باب۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

☆ چھٹواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب

☆ ساتواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ

☆ آٹھواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار

☆ نواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

☆ دسواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

☆ کتابیات

تحقیقی مقالے ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے دس ابواب میں پیش کردہ مواد کا اجمالی تعارف اس طرح ہے۔

☆ پہلا باب۔ڈاکٹر زور حالات زندگی، شخصیت اور کارنامے

تحقیقی مقالہ کے پہلے باب میں ڈاکٹر زور کے مفصل حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔اور مختلف ضمنی عنوانات جیسے ڈاکٹر زور کے آباء واجداد، والدین۔ ڈاکٹر زورؔ کی ولادت۔ابتدائی تعلیم۔اعلی تعلیم۔ملازمت۔ڈاکٹر زورؔ کشمیر میں۔ شادی۔ شریک حیات۔اولاد۔بیماری اور وفات۔ڈاکٹر زور کی شخصیت۔سراپا۔روزمرہ کے معمولات۔غذائی عادات۔ دوست احباب سے برتاؤ۔شاگردوں سے برتاؤ۔ مزاج کی دیگر خوبیاں، سماجی وتہذیبی خدمات، دکنی تہذیب کے محافظ۔ادارہ ادبیات اردو کا قیام۔سب رس کا اجراء اور اس کی علمی وادبی خدمات۔خانقاہِ عنایت الٰہی کا قیام۔ قلی قطب شاہ تقاریب۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام۔ ایوانِ اُردو کی تعمیر، مختلف ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستگی وغیرہ کے ذریعے ڈاکٹر زور کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں اور ان کی علمی وادبی خدمات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زور کا سلسلہ نسب ان کے جداعلیٰ سید شاہ سانگڑے سلطان کے وسیلے سے حضرت قطب الاقطاب سید احمد رفاعیؒ سے ملتا ہے۔ سید شاہ سانگڑے سلطان کے اولاد میں چوتھی پشت کے ایک بزرگ حاجی سید عنایت اللہ شہید ڈاکٹر زور کے دادا تھے۔ ان کے فرزند سید غلام شاہ قادری زعم ڈاکٹر زور کے والد تھے اور حیدرآباد کے نامور شاعر تھے۔ ڈاکٹر زور کی والدہ شبیر النساء بیگم نیک سیرت خاتون تھیں۔ ڈاکٹر زور ۷۔ دسمبر ۱۹۰۴ء کو حیدرآباد کے محلے شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ ایک بزرگ حضرت محمد عبدالوہاب نقش بندی کے کہنے پر ڈاکٹر زور کا نام محبوب سبحانی کے نام کی مناسبت سے محی الدین قادری رکھا گیا۔ بعد میں زور تخلص اختیار کرنے کے بعد وہ سید محی الدین قادری زور اور عرف عام میں ڈاکٹر زور کے نام سے اردو دنیا میں مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر زور کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ مدرسہ مفیدالانام سے مڈل کا امتحان کامیاب کیا۔ خانگی طور پر میٹرک کامیاب کیا۔ سٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۲۵ء میں بی اے اور ۱۹۲۷ء سے ایم اے کیا۔ حکومت آصفیہ کی جانب سے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ پر برطانیہ جانے کا موقع ملا۔ لندن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ''ہندوستانی لسانیات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ انڈیا آفس لائبریری سے دکنی ادب سے متعلق مواد جمع کیا اور اردو شہ پارے کے نام سے کتاب شائع کی۔ صوتیات کے موضوع پر خصوصی تعلیم حاصل کیا۔ ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد واپس آئے۔ ان کی تعلیمی قابلیت دیکھتے ہوئے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں ان کا تقرر بہ حیثیت ریڈر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۵ء میں انہیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ملی۔ بعد میں ان کی خدمات کو چادرگھاٹ کالج منتقل کیا گیا۔ جہاں بہ حیثیت پرنسپل انہوں نے خدمات انجام دیں۔ دسمبر ۱۹۶۰ء میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کشمیر کے وزیراعلیٰ بخشی غلام محمد نے انہیں کشمیر بلایا اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کی صدارت پیش کی۔ وہاں رہ کر بھی انہوں نے اردو کے فروغ کے کام انجام دئے۔

ڈاکٹر زور کی شادی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد کے ایک ممتاز گھرانے کی خاتون تہنیت النساء بیگم سے ہوئی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور نیک خاتون تھیں۔ اور ایک اچھی نعت گو شاعرہ بھی تھیں۔ ان سے ڈاکٹر زور کو پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر زور اور ان کی اہلیہ نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اچھے انداز میں کی۔ ان کے تمام فرزندان تقی الدین قادری، سید علی الدین قادری، صفی الدین قادری، رفیع الدین قادری اور رضی الدین قادری نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر زندگی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی بیٹیوں تہذیب النسا بیگم، توقیر النسا بیگم، توفیق النساء بیگم اور تسنیم النساء کی شادیاں بھی معزز گھرانوں میں ہوئیں۔ اور انہوں نے اپنے والدین کا نام روشن کیا۔

ڈاکٹر زور ایک زندہ دل شخصیت تھے۔اپنے دوستوں میں بے حد مقبول تھے۔ان کے دوستوں اور شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع رہا۔ڈاکٹر زور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ملازمت' بچوں کی دیکھ بھال' گھر کے کام کاج کے علاوہ وہ فروغ اردو کے کام کرتے رہے۔انہوں نے حیدرآباد میں دکنی زبان کے علمی وادبی سرمایے کے فروغ اور تحفظ اور اردو زبان وتہذیب کے فروغ کے لئے ادارہ ادبیات اردو قائم کیا۔ادارے کا ترجمان رسالہ سب رس جاری کیا۔مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔خانقاہ عنایت الٰہی کی بنیاد رکھی۔یوم محمد قلی قطب شاہ کا اہتمام کیا۔اور تحقیق' تنقید' لسانیات' سوانح' تاریخ' تدوین وترتیب' افسانہ نگاری اور شاعری میں اپنی بیش بہا تخلیقات چھوڑیں۔اور جو کام کئی افراد مل کر صدیوں نہیں کر پاتے انہوں نے اپنی ذاتی قابلیت سے تن تنہا کیا۔کشمیر میں ان کا قیام دوسال رہا۔ مختصر سی علالت کے بعد ۲۳ اور ۲۴ ستمبر کی راست ان کا انتقال ہوگیا۔اور دکن کی سرزمین سے اٹھنے والا یہ کوہ نور کشمیر میں خانیار شریف کی مٹی میں دفن ہوگیا۔ڈاکٹر زور کی حیات اور ان کے علمی وادبی کارنامے رہتی دنیا تک اردو دنیا کہ لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

☆ دوسرا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات

تحقیقی مقالے کے دوسرے باب سے ڈاکٹر زور کی نگارشات کے جائزے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔چنانچہ مقالے کے اس دوسرے باب میں بہ حیثیت ماہر لسانیات ڈاکٹر زور کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لسانیات کے شعبے میں ان کی شاہکار تصانیف ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ابتدا میں لسانیات کی تعریف بھی دی گئی ہے کہ زبان کے سائنسی مطالعے کو علم لسانیات کہتے ہیں۔ڈاکٹر زور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے تین سال لندن اور پیرس میں رہے اور وہاں انہیں پروفیسر آرایل ٹرنر اور ہندوستانی زبان کے ماہرین گراہم بیلی سے مشاورت کا موقع ملا۔اپنے مطالعے کی روشنی میں ڈاکٹر زور نے اپنی شاہکار تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کو ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔یہ کتاب مطبوعہ شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۲ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی وسابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے لکھا ہے۔اس کتاب میں لسانیات کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور کو اس بات پر اولیت حاصل ہے کہ اردو میں لسانیات کے موضوع پر انہوں نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ڈاکٹر زور کے نزدیک لسانیات کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ زبانوں کا تجزیہ ان کی تاریخ،ان کے باہمی نقاط ارتباط،ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم وگروہ بندی پر غور وخوض کیا جائے۔اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنا

نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ اس زبان سے جوان دونوں کی مشترکہ سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ میں رہے ہیں۔ اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی''۔ (ہندوستانی لسانیات ص ۹۵) اس تصنیف کا مختلف ماہرین لسانیات نے خیر مقدم کیا۔

لسانیات کے موضوع پر ڈاکٹر زور کی دوسری تصنیف ''ہندوستانی صوتیات'' ہے۔ یہ کتاب عملی لسانیات میں اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں دکنی صوتیات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دکنی صوتیات میں اس کتاب کو معتبر درجہ حاصل ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں دکنی صوتیات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی یہ دو کتابیں اردو میں لسانیات کے موضوع پر ابتدائی نقش ہونے کے سبب بے حد مقبول ہوئیں۔ اور ڈاکٹر زور ایک ماہر لسانیات کے طور پر جانے گئے۔

☆ تیسرا باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق

تحقیقی مقالے کے اس تیسرے باب میں ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور مختلف عنوانات جیسے تحقیق کی تعریف ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق۔ اردو شہ پارے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ طالب و موہنی کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ تاریخ ادب اردو۔ رمز سخن۔ بادۂ سخن۔ فیض سخن۔ متاع سخن۔ مرقع سخن وغیرہ کے تحت ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو شہ پارے تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کی پہلی تصنیف اردو شہ پارے ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ انھوں نے دکن کے کئی ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرایا۔ دکنی ادب کی تاریخ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کتاب میں دکن کے شعراء فیروز، محمود، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، احمد، خدانما، محمد قطب شاہ شوقی، خیالی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، مقیمی، سلطان، جنیدی، ابن نشاطی، میراں یعقوب، طبعی امین، فائز، لطیف نوری شاہی مرزا اور غلام علی جیسے شعراء کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعرا کے تعارف بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔

''تذکرہ گلزار ابراہیم'' ڈاکٹر زور کی ایک کامیاب تحقیقی کاوش ہے۔ جسے 1934ء میں ترتیب دے کر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو کے تحت شایع کیا۔ ڈاکٹر زور نے ''تذکرہ گلزار ابراہیم'' کو مرتب کر کے اردو کے قدیم و جدید تذکروں میں ایک اہما ضافہ کیا ہے۔ اس تذکرہ میں 320 شعراء کا تذکرہ شامل

ہے۔ان میں سے بیشتر شعراء کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔جیسے مرزا بیدل،تانا شاہ، ولی اللہ اشتیاق، رنگین کاشمیری، سیتارام،عمدہ کشمیری،قبول کاشمیری منشی کشن مجروح کاشمیری وغیرہ۔

''دکنی ادب کی تاریخ''دکن کی علمی وادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں میں متعارف کرانے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں بہت زیادہ طویل مباحث نہیں ہیں بلکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

''طالب و موہنی'' بھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو ۱۹۵۷ء میں ادارہ ادبیات اردو سے شایع کرایا۔ ''طالب و موہنی'' دراصل مہاراشٹرا کے ایک تاریخی شہر پرینڈہ کی پرانی داستان عشق ہے جس کو سید محمد والہ موسوی نے ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء سے قبل منظوم کیا تھا۔

''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' ڈاکٹر زور کا ایک اہم تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔جس سے ان کی تحقیقی و ترتیب متن کی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔اس کلیات کا مقدمہ بھی بہت ہی وقیع ہے۔جس کے مطالعہ کے بغیر دکنی اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ تین حصوں پر مبنی ہے۔ پہلے حصہ میں ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ۲۲۰ نظمیں اور ۱۶۳۹ اشعار ہیں۔دوسرے حصہ میں ۲۹۶ صفحات میں ۳۱۲ غزلیں ۱۲۲۵۴ اشعار ہیں۔تیسرے حصہ میں دیگر اصناف سخن یعنی قصائد، رباعیات، مراثی، ریختی اور مثنویاں ۱۳۸۹ اشعار میں کہی گئی ہیں۔ڈاکٹر زور کے مقدمے سے ان کی تحقیق وتنقید اور ان کی بلند پروازی اور وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے۔اردو ادب کی کتابوں میں جتنے مقدمے لکھے گیے ان میں ڈاکٹر زور کے مقدمہ کو مبسوط مربوط اور سیر حاصل کہا جاسکتا ہے۔اس مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے شاعر کے تمام زندگی کے پہلوؤں کو حسین انداز میں پیش کیا ہے۔کلیات محمد قلی قطب شاہ کے جائزے کے علاوہ اس باب میں ڈاکٹر زور کے دیگر تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اردو تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کی گراں بہا خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

☆ چوتھا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد

تحقیقی مقالے کے اس چوتھے باب میں ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ابتدا میں تنقید کی تعریف اور اردو میں تنقید کی روایت بیان کی گئی ہے اس کے بعد ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات روح تنقید۔اردو کے اسالیب بیان۔تین شاعر۔جواہر سخن۔ادبی تاثرات ادبی تحریریں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''روح تنقید'' (۱۹۲۵ء) تنقید پر ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔اس کتاب کا تعارف عمر یافعی لکھا ہے۔ دیباچہ خود ڈاکٹر زور نے لکھا ہے،اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ مبادی تنقید سے متعلق ہے جس میں تنقید وادب کی تعریف،ادب کی پیدائش،ادب کی تقسیم،ادب کا مقصد،تنقید کا مقصد،تنقید نگاری کے فرائض،تنقید نگار کی نگہداشت،اصول تنقید میر حسن اوران کی مثنوی ''سحرالبیان'' پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس کتاب کا دوسرا حصہ ارتقائے تنقید سے متعلق ہے۔اس حصہ میں مشہور یونانی اور روم کے فلاسفر کے تنقیدی تصورات کو پیش کرتے ہوئے فرانس وانگلستان میں تنقید کے ارتقا کو پیش کیا ہے۔اس کے بعد اٹھارویں صدی کے بعد تنقید کی ترقی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پھر کولرج ورڈ سورتھ،میاتھیو آرنلڈ جیسے مشہور نقادوں کی تنقیدی تصورات کو پیش کیا ہے۔آخر میں کتاب میں درج مصنفین اور مصنفات کی فہرست دی گئی ہے۔''روح تنقید'' میں ڈاکٹر زور نے اردوداں طبقہ کو مغربی اصول تنقید سے واقف کرانا۔اوراس کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی تنقیدی تصورات کا سراغ لگایا۔

ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری ''اردو کے اسالیب بیان'' میں بھی ملتی ہے۔ان کی یہ تصنیف ۱۹۲۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ تصنیف اردو نثر کی تنقیدی تاریخ ہے۔اس کتاب کے میں ڈاکٹر زور نے اردو کے قدیم وجدید اساتذۂ فن کے طرز واسلوب پر ناقدانہ رائے زنی کی ہے اور اردو نثر کے ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

''جواہر سخن'' ڈاکٹر زور کا مختصر کتابچہ ہے۔ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف بھی تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔اس تصنیف میں قصہ ملک مصر،قصہ لال وگوہر کو ایک ہی شاعر کی تخلیقات قرار دیا ہے۔''جواہر سخن'' دراصل ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے حکم سے مولوی محمد مبین عباسی چریا کوٹی نے چار جلدوں میں اردو شاعری کا انتخاب مرتب کیا تھا۔جس پر ڈاکٹر زور نے طویل تبصرہ کیا تھا جسے بعد میں کتابی شکل میں شایع کیا گیا۔

''ادبی تحریریں'' ڈاکٹر زور کی تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔کشمیر اور اردو،اردو اور قومی یکجہتی،دکنی ادب، ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں،قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام،مولانا رومی اور علامہ اقبال، صف شعرا وسری نگر،رسا جاودانی،مخمور حسین بدخشی،تمکین کاظمی، بھارت چند کھنہ، بانو طاہرہ سعید،اردو ہندی اور پنجابی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان مضامین کو ترتیب دے کر شائع کیا اور ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے بحیثیت تنقید نگار فن تنقید نگاری پر اس وقت لکھا جب کہ تنقید اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ نیز انھوں نے اردو ادب کو مغربی تنقیدی تصورات سے بھی آشنا کرایا۔ڈاکٹر زور نے تنقید

نگاری میں عملی تنقید اور نظری تنقید دونوں میں اپنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری اردو ادب میں ایک اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے۔

☆ پانچواں باب۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

تحقیقی مقالے کے پانچویں باب میں دیباچہ نگاری کی تعریف اور روایت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری کے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔دیباچہ نگاری کو اس وقت مقبولیت ملی جب کتابوں کی طباعت عام ہونے لگی اور ادیب اور شاعر ماہرین ادب سے دیباچہ کی شکل میں تعارفی اور توصیفی مضامین لکھا کہ اپنی کتاب میں شامل کرنے لگے۔ ڈاکٹر زور نے بھی کئی ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کے دیباچے لکھے۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری یا پیش لفظ ایسے ہوتے ہیں جن کے مطالعہ سے کتاب کی اصل روح سمجھ میں آجاتی ہے۔قاری کتاب کے مطالعہ سے قبل اس کا مرکزی خیال سمجھ جاتا ہے۔ان کے اکثر دیباچے عمیق مطالعے اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہیں کہیں کہیں مصروفیتوں کے باعث سرسری بھی ہیں لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ڈاکٹر زور نے جن کتابوں کے دیباچے تحریر کیے ہیں ان کے موضوعات شعر وادبی، تاریخی معاشرتی، اقتصادی وسائنسی، تنقیدی ولسانی اور نفسیاتی اور فلسفیانہ ہیں۔ان کے علاوہ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ان تمام دیباچوں میں ان کے وسیع مطالعے اور مختلف موضوعات پر ان کی دسترس کا بین ثبوت ملتا ہے۔

☆ چھٹواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب

ڈاکٹر زور نے قدیم مخطوطات کی ترتیب کا اہم کام انجام دیا۔ اور تذکرہ مخطوطات جلد اول۔تذکرہ مخطوطات جلد دوم۔تذکرہ مخطوطات جلد سوم۔تذکرہ مخطوطات جلد چہارم۔تذکرہ مخطوطات جلد پنجم کے نام سے پانچ کتابیں ترتیب دیں۔ان تذکروں کا جائزہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔اس کے چوبیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں محمد اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر دونوں کے اشتراک عمل سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ڈاکٹر زور نے نہ صرف قلمی کتابوں کی فہرست بنائی بلکہ ان مخطوطہ کے تعلق سے دستیاب مواد اور متن کو فہرست میں شامل کر دیا۔انھوں نے جو مخطوطات جمع کیے ہیں ان میں اردو، عربی، ہندی، سنسکرت زبان کے مخطوطات ہیں۔ڈاکٹر زور نے مخطوطہ کے تعارف کے سلسلہ میں احوال وکوائف کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرے ایک عام آدمی کے لیے بھی مفید

ہو سکتے ہیں کیوں کہ اس میں صرف کتابوں کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ مصنف، کتابت اور متعلقہ اشخاص و مقامات کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔ کئی شعراء کے کلیات اور دیوان، مذہبی کتابیں، تاریخی مواد اور تذکرے اور اصحاب علم وفن کے بیاض و یادداشتیں اور خطوط کی تفصیل بھی فراہم کردی ہے۔ ڈاکٹر زور نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ ریزی سے پانچ جلدوں میں مخطوطات کی تفصیل فراہم کردی۔ ڈاکٹر زور سے قبل بھی مخطوطات پر دیگر شخصیتوں پروفیسر سروری، شمس اللہ قادری، نصیرالدین ہاشمی وغیرہ نے کام کیا لیکن ڈاکٹر زور نے تشنہ طلب امور کو مکمل کیا اور مخطوطے کی ظاہری حالت جیسے تقطیع اوراق، نہج خط، مسطر، سنہ تصنیف، سنہ کتابت، کاتب کا نام، کاغذ روشنائی وغیرہ تک کا تذکرہ کیا اور مخطوطے تمام ناقص پہلوؤں کی حالت کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ اس کی سدھار اور استحکام کے لیے بھی کوشش کی اور اس کو محفوظ کردیا۔

☆ ساتواں باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ

تحقیقی مقالے کے اس باب میں سوانح نگاری کی تعریف اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر زور کی تحریر کردہ سوانحی تصانیف حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ حیات میر محمد مومن۔ گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو۔ سرگذشت حاتم۔ سرگذشت غالب۔ داستان ادب حیدرآباد۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ: اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، بانی شہر حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء ۱۶۱۱ء) کی مکمل تاریخی، سوانحی اور ادبی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ایک بادشاہ کی مکمل سوانح حیات ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے اردو کی سوانح عمری میں اضافہ ہوا اور بحیثیت مورخ ڈاکٹر زور کی شناخت ہوئی۔ تاریخی موشگافی کر کے بڑی تحقیق کے بعد واقعات قلمبند کی ہیں۔ قطب شاہی عہد کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشرتی زندگی ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے حیات محمد قلی قطب شاہ لکھ کر اردو ادب کی دنیا میں سلطان قلی قطب شاہ کو ہمیشہ کی زندگی عطا کردی۔

''حیات میر محمد مومن'' ڈاکٹر زور کی تاریخی سوانحی و ادبی تصنیف ہے اور ان کی تحقیقاتی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۵۸ء میں اس ادارہ سے چھپی۔ کتاب اردو سوانح حیات کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہے۔ میر محمد مومن قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں پیشوائے سلطنت اور وزیر اعظم تھے اور وہ اپنے وقت کے بہتر عالم، آرکیٹکٹ، معلم و سیاست داں بھی تھے۔

''گارساں دتاسی۔ اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو''۔ ڈاکٹر زور کی ایک اور سوانحی تصنیف ہے جس میں اردو

کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقہ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کے یورپ کی درسگاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

''سرگذشت حاتم'' استادالعشر اظہورالدین حاتم کے حالات زندگی اور ان کے اردو و فارسی کلام پر تبصرہ پر مبنی ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو ۱۹۴۴ء میں شائع کروایا۔

''سرگذشت غالب'' ڈاکٹر زور کی ایک مختصر تصنیف ہے جس میں غالب کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کی اردو و فارسی نثر و نظم کا اجمالاً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی حیات اور ادبی کارناموں کے علاوہ غالب کے احباب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آرزدہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ غالب کے شاگردوں میں ہرمہدی مجروح اور ہرگوپال تفتہ کو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر زور کی دیگر سوانحی اور تاریخی کتابوں کا جائزہ پیش کیا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے سوانحی اور تاریخی کتابیں لکھ کر ماضی کی نامور شخصیات کے کارناموں کو محفوظ کر دیا۔

☆ آٹھواں باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار

تحقیقی مقالے کے اس باب میں ڈاکٹر زور کی افسانوی نگارشات۔ طلسم تقدیر۔ سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈے کے ہیرے۔ میں شامل افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے یہ افسانے تاریخی ہیں۔ انہوں نے دکن کی تاریخ کو افسانوں کی شکل دی اور تاریخی افسانہ نگاری کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۲۵ء سے پہلے ہوتا ہے جب کہ انھوں نے مختلف افسانے لکھ کر ادبی رسالوں میں چھپوایا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر زور ایم اے کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر زور کے افسانوں کے کل تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ طلسم تقدیر (۱۹۲۶ء)، سیر گولکنڈہ (۱۹۳۷) اور ''گولکنڈہ کے ہیرے'' (۱۹۳۷ء)۔

''سیر گولکنڈہ'' ڈاکٹر زور کا دوسرا افسانہ ہے۔ سیر گولکنڈہ پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے سرسری مطالعہ کے طور پر نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سیر گولکنڈہ میں کل ۱۱۶ افسانے اور صفحات ۱۶۰ ہیں۔ یہ افسانے گولکنڈہ کے پس منظر میں ۱۰۱۰ھ سے ۱۰۹۸ھ کے

واقعات پر مشتمل ہیں۔افسانے سن وقوع کی ترتیب کے ساتھ اس طرح درج کیے گیے ہیں۔

(۱) مشک محل ۱۰۱۰ھ (۲) مکہ مسجد ۱۰۲۳ھ (۳) کھویا ہوا چاند ۱۰۳۶ھ (۴) ملک خوشنود ۱۰۳۶ھ (۵) شہزادی کا عقد ۱۰۴۵ھ (۶) انار کے چودہ دانے ۱۰۹۰ھ (۷) اورنگ زیب وتاناشاہ (۸) کاغذی برج (۹) غیبی امداد (۱۰) آخری سرفروش (۱۱) خاصے کا وقت (۱۲) مٹی کی کلھیا۔آخری کے چھ افسانے سقوط گولکنڈے کے متعلق ہیں۔

''گولکنڈے کے ہیرے'' ڈاکٹر زور کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔جس میں چھ افسانے ہیں۔جس میں افسانہ بالا۔پانچ گنڈے اور پانچ اشرفیاں وغیرہ شامل ہیں۔اردو کے نقادوں نے ڈاکٹر زور کے تاریخی افسانوں کی ستائیش کی ہے اور ان کے افسانوں کو تکنیک کے اعتبار سے مکمل افسانے قرار دیا ہے۔

☆ نواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

مقالے کے اس باب میں ڈاکٹر زور کی مکتوب نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور نے اپنے دوست احباب کو جو خطوط لکھے ان میں اپنے دور کے ادبی حالات کے علاوہ حیدرآباد کی تاریخ اور تہذیب کے بہت سے نقوش پائے جاتے ہیں جن پر ان کے خطوط کی روشنی میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

☆ دسواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

مقالے کے اس آخری باب میں بہ حیثیت شاعر ڈاکٹر زور کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے زور تخلص اختیار کیا اور نظمیں اور غزلیں کہیں۔ڈاکٹر زور کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک دور جامعہ عثمانیہ کا ہے یعنی ڈاکٹر زور جامعہ میں زیر تعلیم تھے۔یہ دور ان کی شاعری کا ابتدائی دور بھی ہے۔دوسرا دور قیام کشمیر کا ہے جب وہ وہاں فارسی اور اردو کے معلم تھے۔ ڈاکٹر زور کی ابتدائی شاعری میں ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر داخلی ہے اور ذوق سخن روایتی اور عمومی تھا ان میں غالب اور مومن کا سا رنگ پوری طرح نہیں چڑھا تھا۔ان کی نظموں اور غزلوں میں شب مہتاب،شب وصال،محبوب،نگہہ ناز،دیدۂ گریاں،انفاس مسیحا جیسی اصطلاحیں ہمیں ملتی ہیں۔ان کی مشہور نظم نونہالان دکن ہے۔ڈاکٹر زور کی ابتدائی نظمیں ہلکی پھلکی اور عشقیہ مزاج کی حامل ہیں۔عنفوان شباب کے لطیف اور معصوم جذبات سے معمور ہیں۔ان کی ایک اور مشہور نظم ''جامعہ عثمانیہ'' ہے۔انہوں نے غزلیں بھی کہیں۔ڈاکٹر زور کے کلام میں رجائیت کا احساس ملتا ہے۔وہ زندہ دلی اور متحرک زندگی کے قائل ہیں۔قنوطیت اور نا امید سے وہ بیگانہ ہیں۔انسان کو دعوت عمل دیتے ہیں۔زندگی میں ایسا کچھ کر جانے کے قائل ہیں جو انھیں حیات جاویداں بنا دے۔

ڈاکٹر زورؔ نے جتنی بھی شاعری کی وہ انھیں اردو کے بلند پایہ شاعر باور کرانے کے لیے کافی ہے۔لیکن ان کی دوسری ادبی وتحقیقی کاوشوں کی بدولت شاعرانہ روپ مدھم نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر اہل قلم ادیب حضرات نے زیادہ توجہ نہیں کی۔لیکن پھر بھی ڈاکٹر زور اپنے قلیل سرمایہ کے باوجود شعراء کی صف میں مقام پانے کے ضرورت مستحق ہیں۔

اس طرح تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' اختتام کو پہونچتا ہے۔

☆ کتابیات

اس مقالے کی تیاری میں جن کتابوں' رسائل اور انٹرویوز سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل کتابیات کے عنوان سے مقالے کے آخر میں دی گئی ہے۔

چونکہ یہ مقالہ کمپیوٹر پر کمپوز کیا گیا ہے۔اس لئے حوالہ جات کی تفصیل ہر باب کے آخر میں دی گئی ہے۔

تحقیق کی وادی میں قدم رکھنا جس قدر دل خوش کن ہے اسی طرح تحقیق کے فریضہ کی انجام دہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔اور ایک محقق جب طے شدہ مفروضات کی راہ پر چلتے ہوئے اپنے تحقیقی مقالے کو تسلی بخش طریقے پر ختم کرتا ہے تو یہ مرحلہ اس کے لئے بڑی مسرت اور شادمانی کا ہوتا ہے۔ایک تحقیقی مقالہ فرد واحد کی کوشش سے مکمل نہیں ہوتا۔اس کے لئے اساتذہ کی رہبری کے علاوہ کئی افراد کی کاوشیں اور عزیز واقارب کی نیک تمنائیں اور حصول علم کے قابل بنانے والی ذات رب العالمین کے فضل وکرم کی ضرورت ہوتی ہے۔چنانچہ ایک تحقیقی مقالے کی تکمیل کی مسرت میں ایک مقالہ نگار کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ سب کے حق میں شکریہ ادا کرنے کا خوشگوار فریضہ انجام دے۔

سب سے پہلے میں اپنے مالک حقیقی رب العالمین کی شکر گذار ہوں کہ اُس نے مجھ پر بڑا فضل وکرم کیا۔علمی گھرانے میں پیدا کیا۔اور مجھے اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرنے اور اور یہ تحقیقی مقالہ لکھنے کا حوصلہ اور صلاحیت دی۔کیوں کے خدا کے فضل کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا۔میں اپنے رب سے ہمیشہ دعا گو رہوں گی کے وہ مجھے ہمیشہ علم صحیح اور عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔اور میرے علم سے دوسروں کو مستفید ہونے کا موقع دے۔میں اپنے استاد محترم میرے تحقیقی سفر کے نگران پروفیسر محمد انور الدین شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔یہ میرے شفیق' مہربان اور ہردلعزیز اُستاد ہی نہیں بلکہ دنیائے ادب وصحافت کے نامور محقق اور نقاد

ہیں۔ اردو صحافت پر آپ کی گہری نظر ہے اور حیدرآباد کے علمی و ادبی رسائل جیسے موضوع پر تحقیقی کام کرتے ہوئے آپ نے حیدرآباد دکن کی مجلّاتی صحافت کو اپنے مقالے میں سمو دیا ہے۔ استادمحترم پروفیسر محمد انورالدین صاحب کے فیض علم کا دریا ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے۔ اور جس سے سینکڑوں تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھاتے رہے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ استادمحترم کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ ایم فل کے دوران ہی طریقہ تحقیق اور دیگر موضوعات پر آپ نے سیر حاصل معلومات فراہم کیں۔ پی ایچ ڈی میں داخلہ کے لئے حوصلہ افزائی کی اور میری خواہش پر نگران بننا منظور کیا۔ اور موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تسوید تک ہر موقع پر میری بھرپور رہنمائی کی۔ اور ہر وقت اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ استادمحترم کے گراں قدر مشوروں اور بے پایاں تعاون کے بغیر یہ مقالہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔ جب کبھی میں کسی مسئلہ کو لے کر ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوتی تو وہ اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے قیمتی وقت سے مجھے زیادہ سے زیادہ حصّہ دیتے۔ اور پرسکون انداز میں مسئلہ کا ایسا حل نکالتے کہ الجھن میں ڈوبا ہوا محقق اطمینان وسکون کے ساتھ اپنا کام جاری رکھتا۔ دوران تحقیق پروفیسر محمد انور الدین نے مجھے کئی مفید مشورے دئے۔ تجاویز پیش کیں لیکن کبھی اپنی رائے کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور مجھے دوران تحقیق کام کی آزادی دیتے رہے۔ پروفیسر صاحب کی یہ خوبی ہے کہ وہ طلباء کے اختلاف رائے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں۔ اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تاکہ طلباء میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ طلباء کے ساتھ دوستانہ فضاء اور برادرانہ ماحول فراہم کرتے ہیں تاکہ طلباء کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع مل سکے۔ استادمحترم نے مجھے اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادے کا بھرپور موقع دیا۔ اور دیگر خزائن کتب سے مجھے اپنی مطلوبہ کتابیں حاصل کرنے میں تعاون کیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ تدریسی مصروفیات، سمیناروں سمپوزیموں اور جامعات میں بحیثیت ممتحن شرکت اور دیگر علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی مصروفیتوں کے دوران تحقیق کے طالب علموں کی تشفی بخش رہنمائی کرنا آپ کے ہی بس کی بات ہے۔ ایک ایسے وقت جب کہ میرا تحقیقی کام تعطل کا شکار تھا استادمحترم نے میری ہر لحاظ سے حوصلہ افزائی کی اور کام کی تکمیل کے لئے حوصلہ دلایا اور درکار رہبری کی۔ پروفیسر محمد انورالدین صاحب کے علمی و ادبی احسانات کے لئے ''شکریہ'' کا لفظ قطعی ناکافی اور روایتی ہے. میں خدا کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے وقت میں برکت دے۔ زیادہ سے زیادہ تشنگانِ علم کو سیراب کرنے کا موقع دے اور تحقیق وتنقید کے کہکشاں میں آپ جیسے ستارے کی تابناکی میں اضافہ کرے۔ امید ہے کہ تحقیق کے آنے والے طلباء بھی پروفیسر محمد انورالدین صاحب کے فیض تحقیق سے مستفید ہونگے۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے مقالے کے موضوع کی شخصیت ڈاکٹر زور کی قابل شاگردہ پروفیسر سیدہ جعفر سے بھی درس لیا۔ شعبے کے قدیم اساتذہ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور دیگر کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے مجھے اردو ادب کی تدریس اور تحقیق کے مضامین پڑھائے۔ میں شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے موجودہ اساتذہ صدر شعبہ ڈاکٹر مظفر شہ میری، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر رضوانہ معین، ڈاکٹر عرشیہ جبین، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر کاشف ڈاکٹر نشاط، ڈاکٹر زاہد اور شعبہ کے دفتر کے ذمہ داروں کی مشکور ہوں کہ ان کے مفید مشورے میرے لئے کارآمد رہے۔

میں اس مقالے کی تیاری کے دوران تعاون کرنے والوں اور نیک خواہشات کا اظہار کرنے والے رشتے داروں، عزیز و اقارب اور تمام دوست احباب کی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی تحقیق کے کٹھن مراحل میں مجھے ہمت اور حوصلہ دلاتے رہے۔ میں اس مقالے کے مواد کے حصول کے لئے تعاون کرنے والے مختلف کتب خانوں کے ذمہ داران اور حیدرآباد کی نامور ادبی شخصیت پروفیسر مغنی تبسم مرحوم کی بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری رہنمائی کی۔

تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ایک تحقیق مزید تحقیق کی راہیں کھولتی ہے۔ اس لئے تحقیق کو تحقیق کی دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ زیر نظر مقالہ بھی موضوع پر حرف آخر نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور کی فکر اور فن پر سابق میں بھی تحقیقی کام ہوا ہے اور مستقبل میں بھی اس موضوع پر مزید تحقیق کے امکانات ہیں۔ تاہم راقم الحروف نے دستیاب وسائل اور ذرائع استعمال کرتے ہوئے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ مقالے کے ہر باب اور ہر موضوع سے بھرپور انصاف کیا جائے تاکہ موضوع سے متعلق کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے اور نہ ہی کسی پہلو میں تشنگی باقی رہے۔ تاہم امکان ہے کہ ''انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے'' نکتہ کے پیش نظر اس مقالہ کے کسی موضوع سے متعلق کوئی بات چھوٹ گئی یا ادھوری رہ گئی ہو جس کے لئے میں معافی کا خواستگار رہوں گی اور مقالے کی کوتاہیوں سے قطع نظر اس کی خوبیوں پر نظر رکھنے کی گذارش کروں گی۔ امید ہے کہ یہ مقالہ ڈاکٹر زور کی نگارشات پر مبسوط مطالعہ ثابت ہو۔ اور موضوع سے متعلق کوئی تشنگی نہ رہنے پائے۔ یہی اس مقالے کے محقق کی آرزو رہے گی۔

مقالہ نگار

نکہت آرا شاہین

☆ پہلا باب

ڈاکٹر زور حالات زندگی

شخصیت اور کارنامے

ڈاکٹر زور حالات زندگی۔شخصیت اور کارنامے

سرزمین حیدرآباد دکن کو اپنے جن مایہ ناز سپوتوں پر ناز رہا ہے ان میں ایک ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، دکن کے دوسرے کوہِ نور تھے۔ دکنی زبان وادب اور دکنی تہذیب کے فروغ میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں ایک قد آور شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نامور ماہر لسانیات، بلند پایہ محقق اور نقاد، ادیب، شاعر، افسانہ نگار، مرتب و مدون، سوانح نگار، مورخ، ادارہ ادبیات اردو کے بانی اور دکنی تہذیب کے امین و پاسدار ہمہ پہلو شخصیت تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سراپا دکنی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی اردو زبان کی ترویج اور دکنی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانے میں گذار دی۔ ان کی حیات، شخصیت اور کارنامے ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔

آباواجداد

ڈاکٹر زور کا سلسلۂ نسب ان کے جداعلیٰ سید شاہ سانگڑے سلطان کے وسیلے سے قطب الاقطاب سید احمد کبیر رفاعی سے ملتا ہے۔ سید احمد کبیر رفاعی محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بھانجے تھے۔ سید شاہ سانگڑے سلطان کی اولاد میں ایک سید شاہ سالار تھے۔ جن کی چوتھی پشت میں ایک بزرگ عالم حاجی سید شاہ عنایت اللہ شہید گذرے ہیں۔ یہ ڈاکٹر زور کے دادا تھے۔

ڈاکٹر زور کے والد سید غلام محمد شاہ رفاعی القادری زعمؔ کے مطابق ''ان کا سلسلہ حضرت امام ابی عبداللہ حسین کے پوتے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ہوتے ہوئے ۳۸ ویں ستون میں حضرت سیدنا علیؓ سے ملتا ہے''۔ [۱]

امام موسی کاظم کے دو فرزند تھے۔ سید علی السکرل اور سید مہذب الدین۔ سید مہذب الدین کی نویں پشت میں سید ابراہیم ہیں جو محمد تغلق کی افواج کے سپہ سالار تھے۔ وہ نظام الدین اولیاء کے فیض صحبت سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے انھیں ''شیخ'' کا لقب عطا کیا تھا۔ سید ابراہیم مختلف فتوحات کرتے ہوئے قندھار شریف دکن پہنچے وہیں تالاب کے مغربی حصے میں سکونت اختیار کرلی۔ ان کا مزار آج بھی قندھار دکن میں موجود ہے۔ حضرت

سید ابراہیم کے فرزند سید محمد تھے۔ وہ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت مخدوم نے انھیں ''شیخ زکریا'' کا لقب عطا کیا تھا۔ حضرت سید محمد زکریا کے فرزند سید شیخ احمد زکریا رفاعی تھے۔ وہ بھی بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ ان کی دو اولادیں ہوئیں۔ سید علی شاہ سانگڑے سلطان مشکل آسانؒ اور دختر جو حضرت شیخ ضیاء الدین عبدالکریم بیابانیؒ کی والدہ تھیں۔

حضرت سید علی شاہ سانگڑے سلطان آٹھویں صدی کے اواخر میں ناندیڑ کے شہر قندھار میں پیدا ہوئے۔ ابتداء ہی سے تعلیم و تعلم سے شغف رہا، علوم ظاہری و باطنی پر انھیں دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کو سلسلۂ قادریہ اور رفاعیہ دونوں سے خلافت حاصل تھی۔

سانگڑے لقب کے تعلق سے یہ مشہور تھا کہ انھوں نے تبلیغ دین کے سلسلہ میں سارے دکن کے علاقوں کا دورہ کیا۔ اس کے علاوہ شمالی ہند کے بعض صوبوں کا بھی دورہ کیا تھا۔ خصوصاً سندھ میں کچھ مدت سنگڑھ نامی مقام میں مقیم رہے۔ وہاں کے عوام ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر انھیں سانگڑے سلطان کے لقب سے یاد کرنے لگے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ دولت آباد کے قلعہ میں ایک جادوگر رہا کرتا تھا جو اپنے جادو سے عوام کو بے دین کر دیتا تھا۔ حضرت سانگڑے سلطان نے اس کے سحر کو توڑا اور عوام کو اس سے نجات دلائی۔ اسی بناء پر انھیں سانگڑے سلطان کہا جانے لگا۔ ایک تیسری روایت یہ ہے کہ سانگڑے سلطان ہمیشہ جہاد کے لیے مستعد رہتے تھے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں دو سانگ (لمبے برچھے) رکھتے تھے۔ سانگ چلانے میں انھیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اسی نسبت سے آپ کو سانگڑے سلطان کہا جانے لگا۔

حضرت سانگڑے سلطان کی کئی تصانیف ہیں۔ لیکن قندھار کی تاراجی کے سبب ضائع ہو گئیں۔ ضیاء الدین بیابانی نے اپنی کتاب ''مطلوب الطالبین'' میں اور مولانا شاہ رفیع الدین نے حضرت سانگڑے کے کئی اقوال، ملفوظات اور ارشادات جمع کیے ہیں۔ نمونۃً ارشادات کا ایک اقتباس درج ہے۔ جو ترجمہ شدہ ہے:

> ''متوکل کو چاہیے کہ فراغت اور کشادہ دستی سے شاد نہ ہو اور تنگی و عسرت میں غم گین نہ ہو، ہمت بلند رکھے۔ کبھی سست نہ ہو۔ دل پر ملال نہ لائے۔ بے مانگے اور بغیر خواہش کے جو مال دیا جائے اسے قبول کرے واپس نہ کرے۔ کہا گیا ہے کہ ''الفتوح لا ردو لا مد ولا کد'' یعنی جو غیب سے ملے اسے رد نہ کرے کہیں ایسا نہ ہو کہ خود اس کو خدا مردود قرار دے کیوں کہ آمدنی خدا ہی بھیجتا ہے

.....اور اگر کچھ ملے تو اور زیادہ کی خواہش نہ کرے۔ سکّے کو پاؤں کے نیچے نہ
آنے دے کیوں کہ اس پر خدا کے نام کندہ ہوتے ہیں اور اگر خدا کا نام نہ ہوتو
بادشاہ کا نام ہوتا ہے اور خلیفۃ اللہ کا نام بھی پاؤں کے نیچے نہ آنا چاہیے۔ اگر
بادشاہ کا نام بھی نہ ہوتو حروف ہوں گے''۔(ترجمہ) ۲

حضرت سانگڑے نے مختلف بلاد اسلامیہ کا سفر بھی کیا تھا۔۸۳۳ھ کو خراسان کے سفر سے لوٹے اور ۸۴۶ھ میں انتقال فرمایا۔''مشکل کشاء دین و دنیا'' سے وفات کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ان کا مزار قندھار کے تالاب کے کنارے موجود ہے۔

حضرت سانگڑے کی دو بیویاں تھیں۔ایک جمال بی بی صاحبہ اور دوسری تارابی بی صاحبہ۔ جمال بی بی صاحبہ سے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ان کے نام یہ ہیں: سید عظیم الدین، سید احمد اور سید معین الدین، سید عظیم الدین سب سے بڑے تھے۔سلطان احمد شاہ بہمنی کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔آخری عمر میں دولت وحکومت سے متنفر ہوکر عبادات اور ذکر واذکار میں مشغول ہوگئے۔دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، کچھ دنوں بعد انتقال ہوگیا۔قندھار میں محلّہ غازی پورہ میں مدفون ہوئے، شاہ دھڑک کے لقب سے وہ عوام میں مشہور ہوئے۔تیسرے فرزند سید معین الدین تھے۔ وہ صاحب کرامات وجلالی بزرگ تھے،ان کا مزار بھی غازی پورہ میں موجود ہے، وہ شاہ کڑک کے لقب سے مشہور ہوئے۔ منجھلے فرزند حضرت سید احمد صاحب ایک عالم و فاضل کے ساتھ ساتھ متقی و پرہیزگار تھے۔اسی بناء پر حضرت سانگڑے نے انھیں خلافت عطا کی۔ والد کی رحلت کے بعد یہی سجادہ نشین مقرر ہوئے۔حضرت سید شاہ احمد کے انتقال کے بعد ان کے فرزند سید شاہ معین الدین سجادہ نشین ہوئے۔آپ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند شاہ میراں جی سجادہ نشین ہوئے۔شاہ میراں جی کے تین فرزند تھے۔سید شاہ برہان، سید شاہ سالار اور سید شاہ حسین۔ڈاکٹر زور کا خاندانی سلسلہ دوسرے فرزند سید شاہ سالار سے جاملتا ہے۔

سید شاہ کے فرزند نجم الدین تھے اور ان کے فرزند جلال الدین تھے۔جلال الدین کے فرزند سید محمد رفاعی بڑے عالم وصوفی گزرے ہیں۔ان کے فرزند سید شاہ بدیع الدین رفاعی ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔آپ کے بے شمار تلامذہ اور معتقدین تھے۔اپنے آخری دور حیات میں حیدرآباد چلے آئے۔یہیں ان کے فرزند سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہید سکونت پذیر تھے۔۵/محرم ۱۳۰۹ھ کو سید شاہ بدیع الدین رفاعی کا اسّی سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بدیع الدین رفاعی کے فرزند سید شاہ عنایت اللہ حسینی ۱۲۷۳ھ میں قندھار شریف میں پیدا ہوئے۔تحصیل علم کی غرض سے ۱۲۸۸ھ میں حیدرآباد کا رُخ

کیا، دوران تعلیم انھوں نے دارالانشا کے دفتر میں محمد صدرالدین کی خواہش پر ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں ان کو دفتری اور قانونی معاملات میں کافی تجربہ حاصل ہوگیا بسا اوقات جاگیردار کے مقدمات کی پیروی بھی کرتے جس سے ان کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگیا۔ دولت کی فراوانی بھی ہوگئی۔ عنایت اللہ شہید بہت فیاض، سخی اور خداترس انسان تھے۔ دل کھول کر ضرورت مندوں اور مختلف اداروں کی امداد کرتے تھے۔ ۱۳۱۹ھ میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ ۱۳۲۶ھ میں رودِ موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی میں گر کے تمام افراد بے رحم طغیانی کے شکار ہوگیے۔ یہی حاجی سید شاہ عنایت اللہ شہید ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے دادا تھے۔ رودموسی کی طغیانی میں صرف ان کے فرزند سید غلام محمد شاہ قادری والد ڈاکٹر زور اور دختر اس جانکاہ حادثہ سے محفوظ رہے۔

والدین

ڈاکٹر زور کے والد اور حاجی سید شاہ عنایت اللہ شہید کے فرزند سید غلام شاہ قادری ۵/محرم ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہونے کے بعد مدرسہ نظامیہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ جوانی میں شعر وسخن، انشا پردازی اور ڈراما نگاری کا شوق رہا، شاعری میں میر تراب علی زورؔ کے شاگردی اختیار کی، زعمؔ تخلص کرتے تھے۔ حضرت داغ سے بھی اپنی غزلوں پر اصلاح لیتے تھے۔ ان کا کوئی دیوان اب تک دستیاب نہ ہوا۔ ان کے بعض اشعار نمونۃً درج کیے جاتے ہیں۔

یا میرے گھر میں وعدہ فراموش آ کبھی
یا اپنی بزم ناز میں مجھ کو بلا کبھی
ہوتا نہیں نوشتۂ قسمت کو انقلاب
مٹتا نہیں لکھا ہوا تقدیر کا کبھی
ممنونِ چارہ گر نہ ہوا درد ، شکر ہے
اچھا ہوا کہ میں نہیں اچھا ہوا کبھی
ہم نے بھی زعمؔ ان کو سزا دی تھی ایک دن
باندھے تھے ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی [۳]

حضرت زعمؔ کو ڈراما نگاری اور ناٹک سے خاص دلچسپی رہی۔ وہ کبھی کبھی ناٹک کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ آخری عمر میں ان پر مذہبیت غالب آ گئی۔ تبلیغ دین کے سلسلہ میں انھوں نے اقطاع عالم کا سفر کیا اور لوگوں کو احکام اسلامی کی تلقین کی۔ سید غلام شاہ قادری زعمؔ کی شادی منشی وقار الدین فاروقی خطیب بودھن کی دختر بشیر النساء بیگم سے ہوئی۔

بشیر النساء بیگم کے والد منشی محمد وقار الدین ایک پائے کے عالم وخطیب ہونے کے علاوہ صاحب تصنیف بھی تھے۔ ''چار گلزار'' ان کی تصنیف ہے جس کا مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان کے والد محمد محسن بھی ادیب وشاعر تھے۔ ان کی فارسی تصنیف ''گل دستہ محسنی'' بھی ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ جو نواب شمس الامراء کی فرمایش پر ۱۲۶۹ھ میں لکھی گئی۔ اس طرح ڈاکٹر زور کا دادھیال اور ننھیال دونوں مشائخین کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بشیر النساء بیگم کو تین اولادیں ہوئیں۔ سب سے بڑے فرزند سید محی الدین قادری زور تھے۔ چھوٹے فرزند سید جلال الدین حسینی اور ایک دختر تھیں۔ جو سلیم الدین وکیل سے بیاہی گئی تھیں۔ ڈاکٹر زور کے والد سید شاہ غلام قادری زعمؔ نے آخری ایام تبلیغ دین میں گذارے۔ آپ کے وعظ سن کر بے شمار لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے ایک آپ بیتی بھی لکھی جس میں ان کے اسفار کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ۶ مارچ ۱۹۴۲ء م/۱۸ صفر المظفر ۱۳۶۱ھ بہ روز جمعہ آپ کا انتقال ہوا۔[۴] مسلم جنگ پل حیدر آباد کے قریب آپ کا مزار ہے۔ ڈاکٹر زور نے مزار سے متصل ایک خانقاہ تعمیر کی۔ جس میں اسلامی علوم کا ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی ولادت

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدر آباد کے محلے شاہ گنج میں ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ مطابق ۷ ڈسمبر ۱۹۰۴ء بروز چہار شنبہ کو پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر زور کا نام محمد عبدالوہاب نقش بندی کی ہدایت پر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نام پر سید غلام محی الدین عرف چاند باشاہ اور کنیت ابوالحسنات رکھی گئی۔ ڈاکٹر زور کے والد ماجد حضرت زعمؔ کہتے ہیں کہ:

> جب یہ لڑکا پیدا ہوا اور حضرت تشریف لائے تو میں نے اس نومولود کو آپ کی آغوش میں دیا۔ حضرت نے پیار کیا اور دیر تک دُعا دیتے رہے اور ''سید غلام محی الدین'' نام تجویز فرمایا۔ حضرت محدث نے اس لڑکے کو بارہا دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا صاحب اقبال ہوگا۔ اس کی پیشانی پر علائم پائے جاتے ہیں۔ چوں کہ

اس کے لیے حضرت ممدوح نے اور میں نے بھی سفر و حضر میں خاص طور پر
دعائیں مانگی ہیں، اس لیے مجھے اُمید ہے کہ یہ ضرور صاحبِ اقبال اور نامور
لوگوں میں سے ہوگا اور مدارج ترقی طے کرے گا''۔ ۵؎

حضرت مولانا عبدالوہاب نقشبندی کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور اُن کے والد کی دعاؤں کے طفیل انھوں نے زندگی کے ہر قدم پر ترقی کے مدارج طے کئے۔

ابتدائی تعلیم

ڈاکٹر زور کے آباء واجداد میں کئی لوگ صوفی بزرگ اور علم وفضل کی دولت سے مالا مال تھے اور کئی اہل سیف اور اہل خانقاہ بھی تھے۔ جب ڈاکٹر زورؔ چار سال کے ہوئے تو اُن کے نانا مولوی وقارالدین نے تسمیہ خوانی کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تسمیہ خوانی کے بعد انھیں دیوڑھی کے قریب ہی ایک معمولی مدرسہ میں بھیجا گیا جہاں محلّہ کے بچے بھی ابتدائی کتابیں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر زور:

''وہاں میں نے شائد قاعدہ اور قرآن مجید کے شروع شروع پارے ختم
کئے تھے۔ اسی اثناء میں وہ مولوی صاحب کہیں چلے گئے۔ ان کے جانے کے
بعد مولوی اکبر حسینی صاحب اس مدرسہ کو قائم کیے اور معمولی تعلیم برابر جاری
رہی''۔ ۶؎

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی ابتدائی تعلیم مدرسہ ''ظہیرالعلوم'' میں عربی میں ہوئی۔ بہت عرصہ تک عربی کے علاوہ اردو اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ مگر بقول خود ڈاکٹر زورؔ وہ تعلیم بھی ناقص تھی جس سے انھیں کچھ زیادہ فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر زورؔ کے والد مشرقی علوم میں تعلیم دلوانا چاہتے تھے جبکہ اُن کے نانا حضرت وقارالدین انھیں انگریزی تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انگریزی تعلیم دلانے کا رجحان شروع ہو چکا تھا جو آج عام ہو چکا ہے۔ اسی اثناء میں شہر حیدرآباد میں مرض ''طاعون'' کی وباء پھیل گئی تھی۔ کچھ عرصہ کے لیے ان کی تعلیم کا سلسلہ ترک ہوگیا کیوں کہ ان کا خاندان اورنگ آباد منتقل ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ اپنی نجی ڈائری میں کہتے ہیں:

''بلدہ حیدرآباد میں طاعون پھیل رہا تھا، اس لیے تبدیل مقام کے لیے

۱۳۳۳ ہجری (۱۵۔۱۹۱۴ء) میں اورنگ آباد کا سفر کیا۔ وہاں بہونروں کے
کٹہرے کے مقام پر قریب ۱۱ ماہ کے عرصہ تک مقیم رہے اور والد صاحب کے
وعظ کا سلسلہ برابر جاری رہا''۔ ۷

اسطرح تقریباً ایک سال اورنگ آباد میں قیام پذیر ہونے کے بعد اُن کا خاندان حیدرآباد واپس آیا۔ اس کے بعد انہوں نے ''مفیدالانام'' میں Infant سے Upper Infant تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۳۲۵ فصلی مطابق ۱۹۱۶ء میں کائستھ مدرسہ بارہ گلی SECOND STANDARD میں شریک کردیا گیا یہاں انھوں نے FOURTH STANDARD تک تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ کائستھ سے پھر نکال کر مدرسہ فوقانیہ میں داخل کرادیا گیا کیوں کہ اُن دنوں مدرسہ فوقانیہ کا معیار اچھا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے CITY HIGH SCHOOL میں داخلہ لیا۔ یہاں چند مہینے تعلیم پانے کے بعد ۲۵/اگست ۱۹۱۸ء میں سٹی ہائی اسکول سے نکل کر ''مدرسہ بلند وسطانیہ'' گڈہ چارمحل میں مڈل کی جماعت (6th,7th) میں شریک ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے بھی نکل گئے اور مدرسہ دھرم ونت میں شریک ہوگئے۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۱۹ء میں مڈل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے علاوہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک لائبریری قائم کی جس میں تقریباً ۵۰۰ کتابیں جمع کی گئیں اور ایک انجمن ''انجمن اتحاد'' کے نام سے قائم کی۔

مدرسہ دھرم ونت میں ڈاکٹر زورؔ کے ایک استاد ''بھگوان پرشاد صاحب'' ترقی پاکر بیدر تشریف لے جارہے تھے تو اس وقت ''انجمن اتحاد'' کی جانب سے ایک جلسہ کیا گیا جس میں زور نے اپنی تخلیق کردہ نظم پیش کی تھی۔ پروفیسر سید محمد جو ڈاکٹر زورؔ کے ہم جماعت رہے ہیں اُن کے اس قول کی تردید ہوتی ہے کہ

''زور صاحب اسکول کی زندگی میں مفیدالانام اور سٹی ہائی اسکول میں
میرے ہم مکتب تھے۔ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں تو کوئی بات ایسی نمایاں
نہیں معلوم ہوتی جو اُن کی ابتدائی ادبی زندگی کی نشاندہی کرنے والی ہو''۔ ۸

تاہم ڈاکٹر زورؔ میں طالب علمی کے زمانے سے ہی تخلیقی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔

پروفیسر سید محمود کے مطابق ڈاکٹر زورؔ نے اسکول میں باقاعدہ تعلیم پاتے ہوئے خانگی طور پر میٹرک کا امتحان دیا۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے میٹرک کامیاب کیا۔ اس کے بعد عثمانیہ کالج میں داخلہ لے کر انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے (B.A) کے امتحان میں درجہ اول سے کامیابی حاصل کی۔ بی اے میں ان کے مضامین اردو اور

فارسی تھے۔ ہر طالب علم دورِ طالب علمی میں کسی نہ کسی استاد کو اپنا ''Ideal'' بنالیتا ہے۔ اساتذہ بھی طلباء و طالبات کے اندر چھپی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتدائی دور میں ڈاکٹر زورؔ اپنے استاد وحیدالدین سلیم سے بہت متاثر تھے اور وہ ڈاکٹر زورؔ کے مثالی استاذ تھے۔ بقول ڈاکٹر زور:

> ''ہمارے کالج کے استاد وحیدالدین سلیم ہمیشہ اردو کی جدید ضرورتوں کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے میں نے بھی عام راستے سے ہٹ کر نئے کام کرنے اور مادر جامعہ کا نام روشن کرنے کی خاطر شاعری کی جگہ نثر اور اس میں بھی تنقید و تحقیق کی طرف بطور خاص توجہ کی''۔ [۹]

اعلیٰ تعلیم

اُس وقت کے تقاضے کے مطابق ڈاکٹر زور بھی تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا ابتدائی اہم کارنامہ ''روح تنقید'' کی اشاعت ہے۔ روح تنقید کی اشاعت کے وقت وہ بی اے (B.A) میں زیرِ تعلیم تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ایم اے (M.A) کے امتحان میں درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ دورِ طالب علمی میں جامعہ سے نکلنے والے رسالہ ''مجلّہ عثمانیہ'' کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ رسالہ ''ارتقاء''، ''مجلّہ مکتبہ''، ''مجلّہ طیلسانین'' کے ادارتی کاموں میں مصروف رہے۔ اس مختصر سے دورِ طالب علمی میں ڈاکٹر زورؔ نے نہ صرف کئی مضامین لکھے بلکہ دوسروں سے بھی لکھوائے۔ اس دور میں وہ ایک شاعر، مصنف، محقق اور ایک بلند پایا مضمون نگار کی حیثیت سے ادبی اُفق پر جلوہ افروز ہونے لگے۔

سر نظامت جنگ جو یوروپین اسکالرشپ کمیٹی Europian Scholarship Committee کے صدر تھے۔ ڈاکٹر زورؔ کی علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے حکومت سے اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ منظور کروایا۔ اس طرح ڈاکٹر زورؔ ۳۱/اگست ۱۹۲۷ء کو اطالوی جہاز ''کرکویا'' کے ذریعہ یوروپ روانہ ہوئے۔ لندن یونی ورسٹی میں داخلہ لے کر ''اردو زبان کے آغاز و ارتقاء'' پر Ph.D کا مقالہ ڈاکٹر گراہم بیلی کی نگرانی میں صرف دو سال کے مختصر عرصہ میں یعنی ۱۹۲۹ء میں مکمل کیا جسے بہت سراہا گیا۔ اپنی تحقیق کے دوران انھوں نے برٹش میوزیم کے کتب خانے اور انڈیا آفس لائبریری سے دکنی ادب پر بہت سارا مواد جمع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد لوٹ کر صرف تین ماہ کے اندر اس مواد کو ترتیب دے کر ''اردو شہ پارے'' کے نام سے کتاب شائع کی۔ اس کے بعد دوبارہ وہ لندن گئے وہاں ''اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز'' اور ''یونی ورسٹی کالج آف لندن'' میں صوتیات کی تعلیم حاصل کی۔

لسانیاتی تحقیقات کے سلسلے میں ابتدائی سنسکرت اور لسانیات کی تعلیم پروفیسر اے لائڈ جیمس سے حاصل کی۔ اس سلسلہ میں پروفیسر لائیڈ جیمس نے لکھا ہے:

> ''مسٹر ایس جی ایم قادری نے اس مدرسہ میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے سال انھوں نے صوتیات پر میرے درسوں میں شرکت کی۔ English Phonetics کی عملی جماعتوں میں یہ حاضر رہے اور میری ذاتی نگرانی میں انھوں نے اردو صوتیات پر کام کیا جس میں دکنی صوتیات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس عرصہ میں یونی ورسٹی کی انگریزی صوتیات کی بعض جماعتوں میں بھی وہ شریک رہے اور میری نگرانی میں انھوں نے اپنی زبان کا تجزیہ کیا۔ یہ کام جب تکمیل کو پہنچے گا تو علم زبان میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا''۔[۱۰]

لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ''پیرس'' پہنچے۔ وہاں صوتیات کی تعلیم کے لیے پروفیسر دینیل جونس Dainil Johns اور مس لی لیاس Miss Le Liyas اور ای آر مسٹر انگ E.Armstrong کے شاگرد رہے۔ ۱۹۳۰ء میں صوتیات پر اپنا تحقیقی مقالہ "Hindustani Phonetics" کو Institute of Phonetics میں مکمل کیا۔ ۲۱ر ڈسمبر ۱۹۳۰ء میں جینوا سے روم پہنچے۔ روم کے سیپلس فیلس سے ۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کو جہاز اورنٹس (ORINTS) میں سوار ہوئے۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو کولمبو پہنچے۔ کولمبو سے مدراس کا سفر کیا اور پھر وہاں سے سیدھے حیدرآباد آئے۔ اس طرح اُن کا تعلیمی سفر ختم ہوا۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک ڈاکٹر زور کا قیام یوروپ میں رہا۔ اپنے چار سالہ قیام کے دوران ڈاکٹر زورؔ نے لسانیات میں دسترس حاصل کی اور اہم تصانیف پیش کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے لسانیات کے جدید اصول اور اطلاقی لسانیات Applied Linguistics پر زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پیرس میں قومی مدرسہ السنۂ مشرقیہ (National School of Oriental Studies) میں ڈاکٹر جیولس بلوک Dr. Joles Bloch (رکن ادارہ تحقیقات عالیہ پیرس یونی ورسٹی) کے لکچرز سے استفادہ کرتے ہوئے ''ڈی۔لٹ'' کے لیے کام کرنا شروع کیا جو نامکمل رہ گیا۔ ڈاکٹر زور اردو کی گجراتی شکل پر ڈی لٹ کرنا چاہتے تھے جو کسی وجہ سے مکمل نہیں کر پائے۔

ملازمت

ڈاکٹر زور جب 1931ء میں لندن میں اپنی تعلیم اور تحقیق مکمل کر کے وطن واپس ہوئے تو ان کی اعلیٰ تعلیمی قابلیت کی قدر کرتے ہوئے حیدرآباد کی نظام حکومت نے ان کا تقرر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت ریڈر کر دیا۔ اس وقت بابائے اردو مولوی عبدالحق صدر شعبہ اردو تھے۔ 1945ء میں ڈاکٹر زور کو پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ بعد میں وہ صدر شعبہ اردو اور فارسی کے ساتھ ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینٹ اور ینٹل لینگویجس بھی مقرر ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے ڈاکٹر زور کی خدمات کو چادر گھاٹ کالج منتقل کیا گیا۔ 1950ء سے دس برس تک وہ اس کالج کے پرنسپل رہے بعد میں 7 دسمبر 1960ء کو وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

ڈاکٹر زورؔ میں ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ملازمت کے دوران دفتر کا عملہ اور چپراسیوں کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے تھے۔ اگر کوئی اہلکار اپنے کام سے جی چراتا تو اُسے سمجھاتے تھے۔ اگر کوئی حقیقت میں کسی بات کو لے کر پریشان ہوتا تو اس کی پریشانی دور فرماتے لیکن اس بات کا احساس تک اُسے ہونے نہیں دیتے تھے یعنی وہ ہمیشہ صلہ رحمی سے کام لیتے تھے۔ بقول پروفیسر محمود حسین:

> ''اکثر ایسا ہوا کہ دفتر کے کسی اہلکار سے کوئی غلطی سرزد ہوئی یا کسی استاد سے متعلق جامعہ سے کوئی سرزنش ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے اسے اپنے پر لے لیا اور اہلکار ہو کہ لکچرار اس کو بچالیا۔ کبھی غصہ میں آکر کسی کی شکایت لکھ دی مگر مراسلہ جاری ہونے سے پہلے ہی اس کو منگوا کر اپنے پاس رکھ لیا''۔[11]

کہتے ہیں کہ انسان کسی کو اپنالے یا کسی کا ہو کر رہے لیکن ڈاکٹر زورؔ میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ وہ ہر شخص کو چاہتے تھے۔ سیکولرازم کی وہ زندہ مثال تھے۔ انھوں نے نہ صرف لوگوں کو اپنایا بلکہ وہ خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو اُن کے اعزاز میں ایک وداعی جلسہ ہوا۔ اس میں زورؔ صاحب کے دوست احباب، شاگرد اور چادر گھاٹ کالج کے اساتذہ اور عملے کے لوگ سبھی موجود تھے۔ اس وقت کا حال پروفیسر محمود حسین لکھتے ہیں:

> ''تقریریں ہوئیں، تحفہ دیا گیا اور پُرتکلف ڈنر ہوا۔ کئی کالجوں کے پرنسپلوں نے تقاریر کیں۔ خواجہ حمیدالدین شاہد پاکستان سے اس میں شرکت کے لیے آئے تھے وہ تقریر کرتے ہوئے رو پڑے لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے

تقریر کی تو معلوم ہوا کہ وظیفہ پر علیحدہ ہوتے ہوئے بھی اُن کی اُمنگیں اتنی ہی جوان تھیں جتنی کہ اس شخص کی جو ابھی اپنی زندگی شروع کر رہا ہو'' ۔۱۲؎

ڈاکٹر زورؔ عملی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اگر آج کے اساتذہ میں ڈاکٹر زورؔ کی چند خوبیاں بھی ہوتیں تو آج اردو تعلیم کے معیار میں مزید اضافہ ہوتا۔ ڈاکٹر زورؔ کو نہ صرف ملازمت میں عزت ملی بلکہ ہر نعمت سے انھیں اللہ نے نوازا۔ وقار خلیل مرحوم لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر زورؔ کو شہرت ملی، ناموری ملی، عزت ملی اور دولت بھی ملی لیکن جو کچھ انھیں ملا اس سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے لیے انھوں نے کسی کو دھکیلا نہیں، کسی کے آگے کنواں نہیں کھودا بلکہ انھوں نے دوسروں سے الگ ایک راہ منتخب کی'' ۔۱۳؎

ڈاکٹر زورؔ کشمیر میں!

ڈاکٹر زورؔ چادر گھاٹ کالج سے پرنسپل کے عہدہ پر ۷ار ڈسمبر ۱۹۶۰ء کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے تو جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر نے انھیں بہت اصرار کے ساتھ کشمیر آنے کی دعوت دی جس کو ڈاکٹر زور نے قبول کیا اور ۳۰ر مئی ۱۹۶۱ء کو جموں و کشمیر یونی ورسٹی میں بہ حیثیت پروفیسر اردو و صدر شعبۂ اردو کے علاوہ DeanofFacultiesArtand Oriental Studies کے عہدہ کا جائزہ لیا۔ یہاں کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے نیز یہاں کے ادیبوں کی مشکلات دور کرنے کا جذبہ لے کر کشمیر آئے۔ اس دوران شعبۂ اردو کو وسعت دے کر اس کو فعال اور کارکرد بنایا۔ یہاں بھی طلبہ اور اساتذہ کی تخلیقی صلاحیتوں پر زور دیا۔ ہندوستان میں کشمیر ہی وہ واحد ریاست تھی جہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ کشمیر میں انھوں نے ملازمت اس لیے قبول کی تھی کیوں کہ وہاں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے امکانات روشن تھے۔ لیکن ان کی حیات نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ وہ یہاں کے ادیبوں کو گوشہ گمنامی سے نکال کر منظر عام پر لانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے مخمور حسین بدخشی کے افسانوں کا مجموعہ ''نیل کمل مسکائے'' اور مزاحیہ شاعر قاضی غلام محمد کا مجموعہ کلام ''ادارہ ادبیات اردو'' سے چھپوایا۔ ''نیل کمل مسکائے'' کا دیباچہ خود ڈاکٹر زورؔ نے تحریر کیا وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کے قابل قدر شعراء اور ادباء کی کتابوں کو ادارے کی طرف سے شائع کرائیں۔

سری نگر میں قیام کے ابتدائی دنوں میں ہی ادب کو فروغ دینے کے لیے ایک جامع اسکیم بنائی اور اسے ''اردو اکادمی'' کا نام دیا لیکن یہاں پہلے ہی سے ''کلچرل اکادمی'' کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جس کے اغراض و مقاصد کے دائرے میں ''اردو اکادمی'' کے مقاصد بھی تھے۔ اس بناء پر یہ اسکیم آگے نہ بڑھ سکی۔ کچھ عرصہ بعد انھیں کلچرل اکادمی کی مرکزی کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ انھوں نے کشمیر کی ادبی اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ کئی مضامین لکھے، شاعری کی اور سری نگر کے اطراف و اکناف میں فارسی اور اردو کے شعراء کے مزاروں کی کھوج لگاتے رہے۔ ''صفہ شعرائے سری نگر'' کے موضوع پر ایک مضمون لکھا جو ''تعمیر'' میں چھپا۔

ڈاکٹر زور کشمیری زبان کے دلدادہ تھے۔ وہ اُس زبان کے کئی فقرے سیکھ چکے تھے۔ کشمیری زبان کو سیکھنے کی انھوں نے ایک ترکیب ڈھونڈی۔ بقول عبدالاحد رفیق:

> ''اپنے مکان کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بچیوں اور بچوں کو جمع کر کے انھیں کشمیری میں بولنے کو کہتے اور مٹھائی بانٹ کر اُن کی حرکات و سکنات سے محظوظ ہوتے تھے''۔[۱۴]

ڈاکٹر زور کشمیر میں صرف قریب ڈیڑھ سال رہے۔ اس قلیل عرصہ میں انھیں کشمیری زبان و ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہاں کے ادباء، شعراء، نقادوں اور افسانہ نگاروں کو اپنی اپنی تخلیقات شائع کرانے کی نہ صرف ہمت اور حوصلہ افزائی کرتے رہے بلکہ اُن کی دامے، درمے اور سخنے مدد کیا کرتے تھے۔ زور صاحب کے الفاظ دہراتے ہوئے جناب عبدالاحد رفیق کہتے ہیں:

> ''آپ (زورؔ صاحب) کہا کرتے تھے کہ جس طرح کشمیر گزشتہ دور میں علم و ادب کا گہوارہ تھا اور طالب علم بخارا، سمرقند اور تاشقند سے علمی پیاس بجھانے کے لیے آتے تھے اُسی طرح یہاں از سرنو ہونا چاہیے کیونکہ کشمیر میں قدرتی سکون حاصل ہے''۔[۱۵]

الغرض ڈاکٹر زورؔ حسن پرست تھے۔ کشمیر کی ہر چیز میں ایک بے پناہ حسن انھیں نظر آتا وہ کشمیر کے باغات اور وادیوں میں گھومتے اور محظوظ ہوتے تھے لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ کشمیر والوں کو زورؔ صاحب کی شخصیت سے فیض یاب ہونے کا بہت کم موقع نصیب ہوا۔ اگر ڈاکٹر زور کچھ عرصہ اور بقید حیات رہتے تو کشمیر یونی ورسٹی کے بعد ''حجاز'' یونی ورسٹی کے صدر شعبہ ہوتے۔

شادی

ڈاکٹر زور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب لندن سے حیدرآباد لوٹے تو جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت ریڈر شعبہ اردو سے ان کی ملازمت کا آغاز ہوا۔ ملازمت کے آغاز کے ایک سال بعد ڈاکٹر زورؔ کی شادی حیدرآباد کے ایک ممتاز گھرانے میں جناب ضیاء الحق فصیح الدین احمد رفعت یار جنگ ثانی کی صاحبزادی تہنیت النساء سے ۱۵ر نومبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔ تہنیت النساء ایک قابل خاتون اور ادب کا اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ وہ ڈاکٹر زور کی شریک حیات ہی نہیں بلکہ شریک کار بھی تھیں۔

شریک حیات

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی شریک حیات تہنیت النساء صاحبہ ۲۵ر مئی ۱۹۱۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ڈاکٹر زورؔ کی شریک حیات اُن ہی کی طرح ایک باصلاحیت شیریں گفتار، باذوق اور حساس دل کی مالک تھیں۔ انھوں نے ''محبوبیہ گرلز اسکول'' حیدرآباد سے سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کیں۔ بچپن سے انھیں مطالعہ کا شوق تھا۔ تہنیت صاحبہ کی تعلیم و تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی۔ گھر پر مختلف دینی و دنیوی علوم کی کتابوں کا مطالعہ کرتی تھیں۔ وہ نہ صرف ایک بہترین شاعرہ تھیں بلکہ زندگی کے ہر اہم کام اور ہر نئے موڑ پر انھوں نے ڈاکٹر زور کا ساتھ دیا اور ان کی رہنمائی کی۔ مگر وہ کبھی منظر عام پر نہ آئیں۔ زندگی کے اس سفر میں وہ ہمیشہ شانہ بہ شانہ رہیں۔ انھوں نے گھریلو ذمہ داریوں کا اثر ڈاکٹر زورؔ کی مصروفیتوں پر ہونے نہ دیا۔ ڈاکٹر زور کو اس بات کا احساس تھا۔ قاضی ایاز انصاری کو انٹرویو دیتے ہوئے وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

> ''دن رات میں لکھنے پڑھنے کے سوا کسی اور معاملے کو کبھی دخل ہی نہیں رہا اور اس کے لیے میں اپنی بیوی کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے سارے گھریلو کاروبار سے مجھے آج تک بے نیاز رکھا۔ نہ صرف یہی بلکہ میری علمی و ادبی کاموں میں بھی انھوں نے دور دور تک ہاتھ بٹایا''۔[۱۶]

تہنیت صاحبہ نے نہ صرف ہر قدم پر ڈاکٹر زور کا ساتھ دیا بلکہ نو بچوں کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت، صحت و تندرستی کا خاص خیال رکھتی تھیں اور محبت و شفقت سے اپنی اولاد کی پرورش کرتیں۔ محترمہ تہذیب یحییٰ فاروقی اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

''اکثر ہماری تربیت اشعار کے ذریعہ کرتی تھیں۔ بچپن کی بات آج
تک یاد ہے کہتیں ایسی بات نہ کہو کہ کوئی چپ کہے، ایسی چال نہ چل کہ کوئی رُک
کہے۔ ایسی جا نہ بیٹھ کہ کوئی اُٹھ کہے''۔ ۱۷

تہنیت صاحبہ نہ صرف ایک اچھی ماں تھیں بلکہ پردہ میں رہ کر ادارۂ ادبیات اردو کی تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ وہ شعبۂ خواتین کی سرگرم رکن رہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے جو امتحانات منعقد کئے جاتے تھے ان میں خواتین کے امتحانی مراکز کی نگرانی وہ خود کیا کرتی تھیں۔ کام کرنے کا جتنا جذبہ اور شوق ڈاکٹر زورؔ میں تھا اتنا ہی شوق تہنیت صاحبہ میں بھی تھا۔ اسی جذبہ کے زیر اثر انھوں نے کروڑوں مالیت کی زمین ''ایوان اردو'' کے لیے وقف کر دی تھیں۔ جناب سید رضی الدین قادری اپنی ماں کے متعلق لکھتے ہیں:

''۱۹۳۴ء سے والد کے ساتھ زندگی تمام اُن کے علمی و ادبی کاموں میں
ممد و معاون رہیں۔ کوئی کام ایسا نہیں ہوتا جو والد صاحب والدہ سے مشورہ لیے
بغیر کرتے۔ جو بھی کتاب لکھتے یا مضمون لکھتے اس کا مسودہ پہلے بیگم صاحبہ کو
دکھلاتے، قابل باپ کی لائق بیٹی اپنے مفید مشوروں سے نوازتیں''۔ ۱۸

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی ادبی زندگی میں ان کی اہلیہ نے بھرپور تعاون کیا جس کی وجہ سے ڈاکٹر زورؔ ہر قدم پر کامیابی کے زینے طے کرتے گئے، انھیں اپنی بیوی پر ناز تھا اور انھیں بے حد چاہتے تھے۔ تہنیت صاحبہ نہ صرف ایک اچھی بیوی تھیں بلکہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ نعتیہ شاعری کا ذوق انھیں ورثہ میں ملا، ان کی شاعری کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

۱۔ ''ذکر و فکر'' تہنیت زورؔ صاحبہ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۵۵ء کو شائع ہوا۔ اس مجموعہ کلام میں (۷۶) نعتیں شامل ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے آپ کو ''طوطیٔ دکن'' کے لقب سے نوازا تھا۔

۲۔ ''صبر و شکر'' آپ کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں ۹۱ نعتیں شامل ہیں۔

۳۔ ''تسلیم و رضا'' یہ تیسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں (۳۸) نعتیں، (۲) حمد اور (۹) منقبتیں شامل ہیں۔

آپ ایک سچی عاشق رسول تھیں۔ شائد اسی لیے انھیں زندگی میں دو دفعہ حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہوں نے ایوان اردو کی تعمیر کے لئے اپنی قیمتی زمین بہ طور عطیہ دی۔ ادارے کے شعبہ نسواں کے جلسوں میں

شریک رہتی تھیں۔ بعد میں انہیں ادارے کا سرپرست بھی نامزد کیا گیا تھا تہنیت النساء بیگم نے زندگی کے ہر موڑ پر ڈاکٹر زور کا بہ خوبی ساتھ دیا۔ ان کا انتقال بروز جمعہ ۸/نومبر ۱۹۹۶ء کو ہوا۔

ان کا ایک شعر ہے:

الٰہی یہ ہے تہنیت کی تمنا
رہے ہر گھڑی سبز گنبد نظر میں

ڈاکٹر عرشیہ جبین لکچرر یونی ورسٹی آف حیدرآباد نے تہنیت النساء صاحبہ کی شاعری پر تحقیقی مقالہ پیش کیا اور ایم فل کی سند حاصل کیں۔

اولاد

ڈاکٹر زور اور تہنیت النسا بیگم کو اللہ تعالیٰ نے کثیر الاولاد بنایا۔ انھیں نو اولادیں قدرت نے عطا کیں۔ جن میں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ ذیل میں لڑکوں کے نام اس طرح ہیں۔

لڑکے:

۱۔ سید تقی الدین قادری مرحوم

ڈاکٹر زورؔ کے یہ بڑے فرزند تھے۔ زور صاحب نے آپ کو اپنے والد حضرت سید شاہ غلام محمد قادری کی درگاہ کا سجادہ نشین بنایا۔ آپ نے اپنی آخری سانس تک اس کی ذمہ داریاں بہ خوبی نبھائی۔

۲۔ سید علی الدین قادری

ڈاکٹر زور کے دوسرے فرزند سید علی الدین قادری نظام آباد کے گری راج گورنمنٹ کالج میں شعبہ معاشیات کے لیکچرر رہے۔

۳۔ سید صفی الدین قادری مرحوم

ڈاکٹر زور کے تیسرے فرزند سید صفی الدین قادری حکومت آندھرا پردیش کے سکریٹریٹ میں اگریکلچر ڈپارٹمنٹ میں

سیکش آفیسر تھے۔

۴۔سید رفیع الدین قادری

ڈاکٹر زور کے چوتھے فرزند سید رفیع الدین پہلے زیڈ پلاسٹک انڈسٹریز کے مالک تھے۔اب ادارہ ادبیات اردو کے جوائنٹ سکریٹری ہیں۔

۵۔سید رضی الدین قادری

ڈاکٹر زور کے پانچویں فرزند سید رضی الدین قادری دبئی میں الیکٹریکل انجینیر ہیں۔

لڑکیاں:

۱۔ ڈاکٹر زورؔ کی بڑی صاحبزادی مرحومہ تہذیب النساء ہیں۔آپ نے عربی سے M.A کیا۔ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں عربی کی لکچرر تھیں۔ڈاکٹر زورؔ کو ان ہی سے اُمیدیں وابستہ تھیں کہ آگے چل کر یہ ادارۂ ادبیات اردو کی ذمہ داریاں سنبھالے گیں۔آپ کی شادی ڈاکٹر یحییٰ علی احمد فاروقی سے انجام پائی جو بعد میں پاکستان کراچی منتقل ہوگئے۔

مرحومہ تہذیب النساء وہاں بھی درس وتدریس میں مشغول رہیں۔وہ ایک اچھی شاعرہ تھیں۔بقول رضی الدین صاحب کہ

> ''وہ نہایت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔بابا انھیں بے حد چاہتے تھے۔اُن میں والد کی تمام خوبیاں موجود تھیں''۔

۲۔ دوسری صاحبزادی توقیر النساء بھی پاکستان کے میجر قاضی عبدالقیوم سے بیاہی گئیں۔راقمۃ الحروف کو انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ آج میں ایوان اردو کو نئے روپ میں دیکھ رہی ہوں۔جب ہم یہاں سے گئے تھے تو یہ اپنی ابتدائی منزل میں تھا۔آج بھی ہمارے ذہنوں میں وہی نقش مرتسم ہے۔انھیں یادوں نے پردیس میں اردو کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے پر اُکسایا ہے۔

۳۔ تیسری صاحبزادی توفیق النساء بھی کراچی میں عبدالعزیز انجینئر سے بیاہی گئیں۔

۴۔ چوتھی صاحبزادی تسنیم النساء ARCHITECT آرکیٹکٹ ہیں جو عبدالقیوم خاں سے بیاہی گئیں۔ اب امریکہ کے شہر ورجنیا میں قیام پذیر ہیں۔ اب بھی انھوں نے اردو سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ تسنیم زورؔ صاحبہ ''حیدرآباد اسوسی ایشن آف واشنگٹن'' کی صدر ہیں۔ ''ارمغانِ زورؔ'' کی مرتبہ بھی ہیں۔

''مشرق اور مغرب کے دو کناروں سے یکساں ربط رکھنا مشکل ہے۔ باوجود سرحدوں کی دوری کے اپنی تہذیب، زبان اور مذہب سے اپنا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ دیارِ غیر میں بھی یہ اردو کی خدمات انجام دے رہی ہیں''۔

ڈاکٹر زور اپنے بچوں کو بے انتہا چاہتے تھے۔ ہمیشہ ان کے مستقبل کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اکثر خطوط میں اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ راقمۃ الحروف کو ڈاکٹر زور کی صاحبزادیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ سبھی اپنے والد کو ''بابا'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

بیماری اور وفات

ڈاکٹر زورؔ نے صحت منداور خوش حال زندگی گذاری۔ انتقال سے قبل وہ کسی کہنہ مرض میں مبتلا نہیں رہے۔ کشمیر میں قیام کے دوران بھی وہ چاق و چوبند رہا کرتے تھے۔ اور یونیورسٹی کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ انتقال سے ایک دن قبل بھی وہ اچھے بھلے تھے۔ کشمیر میں بارش بہت ہوئی تھی۔ سیلاب کی صورتحال تھی۔ اس حالت میں بارش کے دوران اپنے ملازم کی خیریت دریافت کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلے۔ ملازم سے مل کر گھر آئے۔ رات میں چھوٹے فرزند رضی الدین کو پڑھا کر سو گئے۔ آدھی رات کو سینے میں درد کی شکایت ہوئی۔ رات بھر بے چین رہے۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ انہوں نے معائنے کے بعد کہا کہ قلب پر حملہ ہوا ہے۔ دوسرے دن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے دیکھا۔ کچھ علاج بھی ہوا لیکن یہ 24 ستمبر 1962 کی سیاہ رات تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے شب اچانک قلب پر پھر حملہ ہوا اور ڈاکٹر زور کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور دکن میں اردو سے محبت کرنے والے اس فرزند دکن نے اپنی آخری سانس وطن سے دور لی۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے لیکن سری نگر میں پیوند خاک ہوئے۔ ڈاکٹر ابرارالباقی ڈاکٹر زور کے جلوس جنازے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''انتقال کی خبر سنتے ہی کشمیر کے وزیراعلیٰ بخشی غلام محمد صاحب زور کے گھر پہونچے۔ ان کی اہلیہ اور بچوں کو پرسہ دیا۔ دوسرے دن تک شہر کے سبھی معززین، اساتذہ اور طلباء ان کے گھر پہونچے۔ یونیورسٹی اور کالج ان کی یاد میں

بند رہے۔ زور صاحب کی اہلیہ اپنے شوہر کی میت کو حیدرآباد لانا چاہتی تھیں۔ موسم کی خرابی اور ہوائی جہاز کی عدم دستیابی کے سبب یہ ممکن نہ ہوسکا۔ چنانچہ مشورہ ہوا کہ وہیں تدفین عمل میں لائی جائے۔ زور صاحب کی آخری آرام گاہ کے لئے خانیار شریف کا مقام طے کیا گیا۔ جو غوث اعظمؒ کے سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔ بارش اور خراب موسم کے باوجود سینکڑوں لوگ زور صاحب کے جلوس جنازہ میں شریک ہوئے۔ بالآخر خانیار شریف میں زور صاحب کی تدفین عمل میں آئی۔'' ۱۹

کشمیر آئے ہوئے ڈاکٹر زور کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں بھی ان کی کھوج اور تحقیقی مزاج نے انھیں چین سے رہنے نہ دیا۔ قاضی غلام محمد صاحب لکھتے ہیں:

''ایک روز شعبۂ اردو میں قبور الشعراء کے سلسلے میں بات چلی۔ زورؔ صاحب بہ نفس نفیس سری نگر کے اُن محلوں میں گھومتے پھرتے جہاں اُنھیں اس بارے میں اطلاعات ملنے کی توقع تھی''۔ ۲۰

ڈاکٹر زورؔ چاہتے تھے کہ کشمیری شعراء پر ایک کتاب لکھے اسی لیے وہ تمام مواد جمع کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ کشمیری شعراء کے مزاروں پر جاتے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک دن وہ بھی سری نگر کے ایک مزار میں سپرد خاک کیے جائیں گے جہاں وہ کچھ دن قبل کشمیر کے شعراء کی قبروں کا کھوج لگایا کرتے تھے۔ فرزند زورؔ سید رفیع الدین قادری صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''یہ (خانیار شریف) متبرک جگہ جانی جاتی ہے اور چونکہ بابا قادری تھے اس لیے اس مناسبت سے یہ جگہ تجویز کی گئی اور وہیں سپرد خاک کیا گیا۔ دفن کے وقت لوگ مٹی دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ بڑی صاف ستھری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی نیک ہستی تھی مسلسل کئی دن کی بارش کے باوجود اتنی خشک مٹی نکلی''۔ ۲۱

اہل دکن کو اس بات پر رنج رہا کہ دکن کا کوہِ نور کشمیر کی وادیوں میں کھو گیا۔

جنوں کی آگ پر بے چین پارہ تھا
بلندی پر سے جو چمکے وہ تارہ تھا

تری سعی عمل کا زورؔ کیا کہنا
تو اپنی ذات سے اک ادارہ تھا

عظیم الدین محبت

ڈاکٹر زورؔ کی زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم کا نمونہ تھی اور ہر اسکالر اور محقق کے لیے ان کا یہ شعر دعوت عمل دیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے انھیں زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ ع

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

ڈاکٹر زور کی شخصیت

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنی اہلیہ کے لئے چاہنے والے شریک حیات تھے۔ بچوں کے لئے ہمدرد اور رفیق باپ، دوستوں کے لئے جگری دوست، اردو زبان و ادب اور دکنی تہذیب کے فروغ کے سچے بہی خواہ تھے۔ ان کی حیات جہد مسلسل کی داستان ہے۔ اپنی وفات کے بعد بھی انہوں نے اپنی شخصیت کے ان مٹ نقوش چھوڑے۔

سراپا

جن لوگوں نے زور صاحب کو قریب سے دیکھا اپنی تحریروں میں ان کے سراپا اور شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریروں سے بھی ان کی شخصیت کے مختلف نقوش جھلکتے ہیں۔ وہ ایک وجیہہ شخصیت کے حامل خوبرو انسان تھے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل اپنے مضمون میں ان کی سراپا نگاری اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''خوش وضع سے زیادہ خوش پوش۔ لانبی لانبی زلفیں، شانوں پر چھٹی ہوئیں۔ اونچی پیشانی اقبال مندی کی نشانی، پان کی گلوری سے رخسارہ اُبھرا ہوا، چکلی چکلی پٹیوں کے کپڑے کی شیروانی، شیروانی کیسی پٹا پٹی کا پردہ اوڑھ رکھا ہے۔ پاؤں میں زرکا سلیم شاہی، وضع قطع جس قدر شاعرانہ بات کرنے کا انداز اسی غیر غیر شاعرانہ، قہقہہ اس سے کہیں زیادہ غیر شاعرانہ، پان اس طرح چباتے ہیں جیسے سپاری کی سختی سے مقابلہ ہو رہا ہے، بات اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی ٹھیٹ دکنی ترنگ میں آکر باتیں کر رہا ہے''۔۲۲

حیدرآباد کی اردو تہذیب کی ایک اور قد آور شخصیت پروفیسر مغنی تبسم نے بھی زور صاحب کا سراپا کچھ ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

> ''چوڑی پیشانی، چھوٹی موچھیں، لمبے بکھرے بال، چہرہ آفتابی، مسکراہٹ لبوں پر کھیلتی ہوئی، آنکھوں میں چمک جس سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ گورا رنگ، لمبا

قد، چوخانے دار حیدرآبادی وضع کی ڈھیلی شیروانی اور اسی کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی، ہونٹوں پر پان کی سرخی، نرمی کے ساتھ دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے، گفتگو کے دوران کوئی پرلطف بات کہہ دیتا یا وہ کوئی پر مزاح بات چھیڑ دیتے تو بے ساختہ قہقہہ لگا دیتے''۲۳

مندرجہ بالا سراپا نگاری سے ڈاکٹر زور کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔انھیں صوفیانہ روایتیں ورثہ میں ملی تھیں۔وہ خلوص ومحبت اور شفقت کے مجسم پیکر تھے۔بچپن ہی سے انھیں کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔اپنا زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔

روزمرہ کے معمولات

ڈاکٹر زور وقت کے پابند، اپنا کام خود کرنے کے عادی اور ایک حرکیاتی انسان تھے۔انہوں نے اپنے روزمرہ کے معمولات طے کر لئے تھے۔گھر والوں کے ساتھ وقت گذارنا، ملازمت کے کام، ڈاک دیکھنا، لوگوں کے خطوط کے جواب دینا، دوست احباب سے ملاقاتیں، بچوں کی تعلیم وتربیت، باغ بانی کرنا اور دیگر مشاغل کی انجام دہی میں پابند وقت تھے۔ ڈاکٹر زور کا قیام تہنیت منزل واقع پنجہ گٹہ حیدرآباد میں تھا۔یہ مکان ان کے خسر رفعت یار جنگ کی کوٹھی کے احاطہ میں موجود ایوان اردو کے پیچھے واقع تھا۔اس مکان میں کشمیر روانگی سے قبل انہوں نے زندگی کے اکتیس سال گذارے۔زور صاحب کے معمولات میں شامل تھا کہ روز صبح فجر کی نماز کے بعد اوراد و وظائف پڑھتے۔چائے نوشی اور ضروریات سے فراغت کے بعد اخبارات کا مطالعہ کرتے۔ہفتہ میں دو بار عبدالرشید پہلوان سے مالش کرواتے۔ اوپری منزل سے نیچے اترتے۔بچوں کے احوال معلوم کرتے۔انہیں عربی پڑھانے کے لئے بٹھاتے۔ناشتے سے فراغت کے بعد ریڈیو پر خبریں سنتے۔خطوط کا مطالعہ کرتے۔ضروری خطوں کا جواب لکھتے۔ٹیلیفون پر احباب سے گفتگو کرتے۔صبح ساڑھے نو بجے بچوں کو ان کے اسکول چھوڑ آتے۔چادر گھاٹ کالج روانہ ہوجاتے۔کالج جانے سے قبل درگاہ جاتے۔شام میں واپس ہوتے وقت بچوں کو اسکول سے گھر لاتے۔منہ ہاتھ دھوکر چائے نوش فرماتے۔ادارے کی ڈاک دیکھتے۔جواب لکھتے۔تھوڑا وقت چمن میں گذارتے۔پودوں کی دیکھ بھال کرتے۔مغرب کے بعد چہل قدمی کے لئے نکلتے۔ادارے کی ترقی کے لئے غور وفکر کرتے۔چھٹیوں میں بچوں کو گولکنڈے کی سیر کرتے۔بہرحال ڈاکٹر زور کا سارا دن گھر کے کام، ملازمت اور دیگر فروغ اردو کے کاموں میں صرف ہوتا۔

اکبرالدین صدیقی جواُن کے دور کے رشتہ دار تھے اپنے والد کے ساتھ ڈاکٹر زورؔ کے گھر میں ایک ماہ مہمان رہے۔وہ زورؔ صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔انھوں نے اس وقت کے مشاہدات اور تاثرات قلم بند کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''ایک مہینے کے قیام کے دوران میں نے انھیں کبھی گپ شپ اڑاتے، دوست احباب میں وقت ضائع کرتے یا دن میں سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی کمرے پر پہنچا تو یا تو مطالعے میں مصروف نظر آتے یا لکھتے ہوتے۔ دسترخوان پر بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ خوردن برائے زیستن پر عمل پیرا ہیں''۔۲۴

درج بالا حوالہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ زور صاحب بچپن ہی سے اصولی شخصیت کے مالک تھے۔بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو نوجوانی کی عمر میں دوستوں کا حلقہ زیادہ نہیں رکھتے اور ہمہ تن مصروف رہتے۔

غذائی عادات

ڈاکٹر زور حیدرآبادی روایات کے پاسدار اور امین تھے۔غذا کے معاملے میں بھی وہ خوش خوراک واقع ہوئے تھے۔عمدہ اور لذیذ غذا کے شوقین تھے۔حیدرآبادی غذاؤں کے علاوہ انہیں میٹھا بہت پسند تھا۔وقت پر کھانا کھاتے۔ کثرت سے چائے پیتے۔وہ اچھے مہمان نواز بھی تھے۔گھر آنے والے مہمانوں کی بھی لذیذ پکوانوں سے ضیافت کرتے۔بچوں کو بھی اچھا کھانے کے لئے کہتے۔رزق کے معاملے میں انہیں اللہ کے رزاقیت پر پورا بھروسہ تھا۔

دوست احباب سے برتاؤ

ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کو بہت جلد اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ان کی شخصیت میں جاذبیت اور کشش تھی۔جو بھی ان سے ایک بار ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔اس لیے بچپن ہی میں اپنے خاص دوستوں میں بہت مقبول رہے۔ان کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔جس میں مختلف مذاہب اور قوموں کے لوگ شامل تھے۔ زور صاحب سے ان کی دوستی صرف اردو کی بنیاد پر تھی۔ڈاکٹر زور کے حلقہ احباب میں شامل اہم شخصیات میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر ہارون خان شیروانی، پروفیسر سید محمد، مولوی نصیرالدین ہاشمی اور دیگر شامل تھے۔

شاگردوں سے برتاؤ

زور صاحب کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا۔ ان کے اہم شاگردوں میں سکندر علی وجد، میر عابد علی خان، مخدوم محی الدین، خواجہ حمید الدین شاہد، صاحب زادہ میکش، جہاں بانو نقوی، ڈاکٹر حفیظ قتیل، محمد اکبر الدین صدیقی، عزیز احمد، محمد بن عمر، میر حسن، مرزا قدرت اللہ بیگ، سید مبارز الدین رفعت، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، سیدہ جعفر، سید اشفاق حسین، یوسف ناظم، احمد جلیس اور بھگوان داس وغیرہ شامل ہیں۔ زور صاحب کے تقریباً تمام شاگردوں نے آگے چل کر زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اور زور صاحب نے اپنی قابلیت سے علم و دانش کا جو چراغ روشن کیا تھا وہ ان کے شاگردوں کی بدولت سینکڑوں شاگردوں کو روشن کر گیا اور علم و ادب کی دنیا اس سے منور ہوگئی۔

مزاج کی دیگر خوبیاں

ڈاکٹر زور کے مزاج میں خودداری اور سادگی تھی۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ہر بڑے اور چھوٹے سے سادگی سے ملتے تھے۔ ہر کسی سے عزت سے پیش آتے تھے۔ وہ محفلوں کے آدمی تھی۔ ان کے اطراف ہمیشہ لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ بات چیت میں بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ طالب علموں کو مطالعے کا ذوق دلاتے اور کچھ لکھنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔

اگر کسی سے کسی بات پر اختلاف ہوجاتا تو اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کر لیتے۔ اس صلح کل کی پالیسی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف کر دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے ایک کامیاب زندگی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے یوروپ میں قیام، وہاں سے آنے کے بعد جامعہ عثمانیہ و چادر گھاٹ میں ملازمت کے زمانے سے لے کر کشمیر میں قیام تک اپنے گرد خاص دوستوں کے علاوہ شاگردوں اور ملاقاتیوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے۔

ڈاکٹر زورؔ کی طبیعت میں عجلت پسندی تھی۔ کسی کام میں تاخیر گوارا نہ کرتے۔ اگر انھیں کوئی بات سخت ناگوار گزرتی تو فوراً غصہ آجاتا تھا اور بعض وقت آپ سے باہر ہوجاتے لیکن تھوڑی ہی دیر میں غصہ فرو ہوجاتا تھا۔ جب انھیں اپنی زیادتی کا احساس ہوتا تو اس شخص کی دل جوئی کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے تھے۔ عفو و درگزر ان کے مزاج کی خاص خوبیاں تھیں۔ وہ صاف دل کے انسان تھے۔ اگر کسی سے انھیں اختلاف بھی ہوتا تو اُن کی عظمت اس بات سے ظاہر

ہوتی تھی کہ نہ تو کبھی اُن کو بُرا کہتے اور نہ کبھی اُن کا بُرا چاہتے۔کوئی شخص ان کے سامنے اُن کے کسی مخالف کو بُرا کہتا تو فوراً روک دیتے اس بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ وہ دہلی سے ہوتے ہوئے کسی یونی ورسٹی میں ریڈر کے تقرر کے سلسلے میں جارہے تھے۔زورؔ صاحب انٹرویو بورڈ کے ممبر تھے۔امیدواروں میں ایک ایسے بھی تھے جو اُن کے مخالف گروپ کے آدمی تھے۔ مجھے کچھ ایسا یقین تھا کہ زورؔ صاحب کبھی اُن صاحب کو پسند نہ کریں گے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے اُس امیدوار کا نام لیا۔فرمانے لگے جانتا ہوں کہ وہ میرا مخالف ہے مگر امیدواروں میں سب سے بہتر بھی وہی ہے۔ اگر اس کا انتخاب نہ ہوا تو طالبِ علموں پر ظلم ہوگا''۔۲۵

ان کی شخصیت میں ایک جادو سا تھا۔ ہر کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔آدمی چاہے چھوٹا ہو یا بڑا وہ مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک کہ گھریلو ملازمین سے بھی اچھا برتاؤ کرتے۔وہ کبھی کسی کا دل نہیں توڑتے تھے چاہے اُس میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے۔اپنے سے چھوٹوں کی بہت دلجوئی کرتے اور دوسروں کی رائے کا احترام کرتے۔

ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت میں ''انا پرستی'' نہیں تھی۔ ہر کام میں اپنی شریک حیات کے علاوہ دوسروں سے بھی مشورہ ضرور کرتے تھے۔ پان خریدنا ہو یا کوئی اور چیز یہاں تک کہ کیلوں کی خریدی کے بعد نوکروں سے پوچھ گچھ کرتے بھی پائے گئے۔ان کے ہاں ایک ایک پائی کی اہمیت تھی۔ نہ صرف وہ ایک اچھے شوہر تھے بلکہ ایک مشفق باپ بھی تھے۔وہ اپنے بچوں کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ان کی بیٹی تسنیم زور کہتی ہیں:

''بابا ہم بیٹیوں کو بے حد چاہتے تھے۔ زیادہ تر کام بھائیوں سے لیا کرتے تھے۔ پردے کے پابند تھے۔عید پر ہم سب کو Shoping لے جایا کرتے۔حیدرآباد چھوڑ کر جب بھی کسی دوسرے مقام پر جاتے تو ہمارے لیے ڈھیر سارے تحفے نشانی کے طور پر لے آتے۔بابا کو باغ بانی کا بے حد شوق تھا۔ وہ ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔گھر میں محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی تصویر خود بابا نے آرٹ کی ہے''۔۲۶

ڈاکٹر زور نہ صرف ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو بھی لاڈ و پیار اور وقت دیتے تھے یہاں تک کہ باغ بانی کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتے اور ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔ان کی مصروفیات میں سے کچھ گھنٹے شام کے وقت اپنے بچوں کو ساتھ لے کر چہل قدمی کرتے۔وہ بہت اصول پسند واقع ہوئے تھے۔انہوں نے اپنے روز مرہ کے معمولات کو تقسیم کر لیا تھا۔گھر والوں کے ساتھ وقت گذارنا' ملازمت کی مصروفیات' ڈاک کا مطالعہ' دوست احباب سے ملاقاتیں' گھر میں باغبانی کرنا ان کی روزانہ کی مصروفیات میں شامل تھا۔

وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ڈاکٹر زور کی بیٹی توقیر النساء بیگم کہتی ہیں:

> ''ہمیں کبھی کبھی فلم بھی دکھانے لے جایا کرتے۔دکھانے سے قبل خود جانتے تھے کہ فلم اچھی ہے یا نہیں۔بابا کو بڑے غلام علی اور شکیلہ بانو کے پروگرام پسند تھے''۔۲۷

جب میں نے توقیر صاحبہ سے دریافت کیا کہ آپ نے کون کونسی فلمیں دیکھیں تو انھوں نے ''مرزا غالب'' اور ''مغل اعظم'' کا نام لیا۔ایک شخص میں اتنی خوبیوں کا پایا جانا ہم سب کے لیے حیرت کی بات ہے۔اکثر بڑے سے بڑے مفکر یا فلاسفر کی زندگیوں کا جائزہ لیں تو وہ ہمیشہ وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں یہاں تک کہ بیوی بچوں کے حقوق بھی برابر ادا نہیں کرتے لیکن ڈاکٹر زورؔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔اولاد کے تئیں ان کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔بچوں کو بہت محبت سے نصیحت کرتے۔وہ ایک اصولی انسان تھے اس لیے اپنے بچوں کو بھی نظم وضبط اور عمل کی تلقین کرتے۔

اپنی بیگم تہنیت النساء سے بے حد محبت کرتے۔ڈاکٹر خلیق انجم اپنے مضمون ''حیات زورؔ'' میں لکھتے ہیں:

> انھیں اپنی بیگم صاحبہ سے بہت محبت تھی۔اکثر بیگم صاحبہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی جو ایک نئے شادی شدہ نوجوان کی آنکھوں میں ہوتی ہے''۔۲۸

ڈاکٹر زور ایک ہمہ جہت اور باعمل شخص تھے۔اپنی اولاد کی طرح اپنے شاگردوں کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ان کی ہمت افزائی کرتے اور انھیں اس قابل بنانے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے شاگرد ان ہی کی طرح اچھے ادیب بن جائیں۔وہ اپنے شاگردوں سے مضامین لکھواتے تھے۔املا کی غلطیوں کو درست کرتے اور اس پر اپنی رائے بھی دیتے۔اگر انھیں کوئی مضمون پسند آجاتا تو آفس میں دوسرے پروفیسروں اور کلرکوں کو جمع کر کے انھیں سناتے۔ان کی شخصیت

میں جہاں نرمی تھی وہیں سختی بھی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے طالب علموں سے ناراض بھی ہوجاتے تھے۔ یہ کیفیت صرف وقتی تھی۔ غصہ کرنے کے بعد طالب علموں سے اس قدر خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے کہ طلباء اپنی غلطی پر نادم ہوجاتے۔ بقول مخمور حسین بدخشی:

''وہ اپنے شاگردوں کی غلطیوں اور کمزوریوں پر انھیں ٹوکتے تھے مگر ان کا دل نہیں توڑتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یونی ورسٹی کے ایک ایک طالب علم کو ان کے غصے میں بھی ہمدردی کے چشمے اُبلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی ناراضگی میں بھی شفقت اور محبت کے گلزار مہکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے''۔ ۲۹

ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ خود کام کرتے اور دوسروں سے بھی کام کرواتے تھے۔ انھیں جس کسی کے بارے میں پتہ چلتا کہ اسے لکھنے لکھانے کا شوق ہے تو اس کی ہمت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ وہ ہر شخص کے لیے اس کی موزونیت سے کچھ نہ کچھ کام سوچ لیتے تھے اور عملی طور پر بھی کام لیتے تھے۔ انھیں صلاحیتوں کی بنا پر انھوں نے ''یوم قلی قطب شاہ'' منا کر حیدرآباد کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں قومی یکجہتی کی ایک نئی لہر دوڑادی اور سماجی تعلقات کو خوشگوار بنائے رکھا۔ بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر:

''ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت بارعب، متین اور پُر وقار تھی۔ ان کے لہجے میں بڑی گونج اور آواز گرجدار تھی۔ وہ ایک سیکولر مزاج کے حامی تھے۔ انھیں قلی قطب شاہ کی شخصیت اور کارناموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ یوم قلی قطب شاہ منا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد کا درس دیا۔ ان کی نظر وسیع اور کافی روشن خیال تھے''۔ ۳۰

ڈاکٹر زورؔ نے اپنے لیے ایک الگ راہ منتخب کی۔ انھوں نے کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔ کبھی کسی کو اپنی راہ میں رکاوٹ بننے دیکھ کر ڈھکیلا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر انھیں کامیابی و کامرانی ملی اور ہر قدم پر ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ انھوں نے شہرت، عزت اور دولت سبھی کچھ اپنی محنت، خلوص اور لگن سے حاصل کیا۔ انھیں اپنی راہ میں دقتیں اور مشکلات بہت کم ملیں۔ اگر کہیں مخالفتیں اور مشکلات حائل بھی ہوگئیں تو اپنے حسن سلوک سے دوچار کردیا۔ ان کے اس رویہ سے ان کا مخالف خود پشیمانی کا شکار ہوتا تھا۔ انھیں اردو زبان و ادب کی دنیا میں عہد ساز شخصیت بھی کہا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف لکھتے تھے بلکہ دوسروں میں بھی لکھنے کا شوق پیدا کرتے تھے۔

ڈاکٹر زورؔ کو سستی شہرت اور پروپگنڈے سے نفرت تھی۔ ساری عمر کڑی محنت برداشت کر کے اپنی بلند و ممتاز شخصیت خود بنائی تھی۔ انھوں نے بے شمار ادیبوں کو اردو دنیا سے متعارف کروایا۔ ایسے لوگ جو کچھ نہیں جانتے تھے ڈاکٹر زورؔ کی بدولت صاحب تصنیف یا صاحب دیوان کہلائے۔ جب وہ دکن سے کشمیر گئے تو وہاں کے نوجوانوں اور طالب علموں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا، ان کی ہمت افزائی کی۔ ادارۂ ادبیات اردو سے ان کی تحقیقات کی اشاعت کا انتظام کیا۔ اگر ان میں تعصب ہوتا یا علاقہ واریت کے شکار ہوتے تو نہ کشمیر جاتے اور نہ وہاں اردو کا چراغ جلاتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اردو نے دِلّی اور لکھنو میں جنم لیا لیکن حیدرآباد کے گہوارے میں پروان چڑھ کر جوانی میں قدم رکھا۔

ڈاکٹر زورؔ ایک زندہ دل انسان تھے۔ خود ہنستے اور ہنساتے بھی تھے اور ہنس مکھ چہرے کو پسند کرتے تھے۔ احباب کی محفل میں فوراً بے تکلف ہو جاتے۔ ادبی موضوعات سے لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے تکلفی اور شگفتگی سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان کے نام سے زیادہ ان کا تخلص مشہور تھا۔ اس تعلق سے عرش ملسیانی لکھتے ہیں:

> ''وہ بڑے ہنسوڑ بھی تھے۔ ایک دن کہنے لگے کہ ''آج کل'' (رسالہ) مجھے باقاعدگی سے ملتا ہے لیکن پتہ انگریزی میں لکھا ہوتا ہے۔ ''Zore'' کے عوض ''Zoor'' لکھا ہوتا ہے۔ زورؔ واو معروف سے بہت خراب معنی کا حامل ہے۔ اس معروف سے تو ہم مجھول ہی اچھے!''۔[۳۱]

نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ محفل میں کسی نہ کسی دوست کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے۔ خود قہقہے لگاتے اور تمام محفل کو زعفران زار کرتے۔ ان کے طنز و مزاح میں زندہ دلی، بشاشت اور شگفتگی و شائستگی ہوتی تھی۔ بعض اوقات خوش مذاقی کے موڈ میں کچھ اس طرح کے عجیب سوال بھی کر بیٹھتے تھے۔

> ''فارسی شعبے کے لکچرر شمس الدین احمد جب پہلی بار ڈپارٹمنٹ آئے تو سلام علیک کے بعد فوراً زورؔ صاحب نے پوچھا کیوں جناب سنا ہے آپ کی دو عدد بیویاں ہیں؟ کیسے سنبھالتے ہیں آپ اُن کو؟ شمس حیرت سے انھیں دیکھتے رہے اور دوسرے لمحے محفل قہقہہ زار بن گئی''۔[۳۲]

خوش مذاقی، ہنسنا ہنسانا، لوگوں کے بارے میں دلچسپ انکشافات سے لطف اندوز ہونا یہ تمام باتیں ان کی شخصیت میں زندہ دلی کا ایک وصف بن گئی۔ کوئی نئی یا تعجب خیز بات سن کر آپ ''ایسا ہے'' کہتے۔ بقول حامدی کاشمیری

''ایسا ہے'' کہنا آپ کے فطری تجسس اور بچوں کی سی معصومیت کا غماز ہے۔ ہر کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ طبعاً منکسر المزاج کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں ان کے والد کی صوفیانہ تربیت کا تقدس شامل تھا۔ ان کی شخصیت اور کردار میں رعب تھا۔ انھیں دیکھنے والا احتراماً خود بہ خود اپنی آنکھوں نیچی کر لیتا۔ ان کی ذہانت خداداد تھی۔ وہ اُن اساتذہ میں سے تھے جو نہ صرف اپنے طالب علموں بلکہ جو کوئی بھی اُن سے ملتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنا علم بخشتے بلکہ اپنی شخصیت کردار اور اخلاق کے گہرے نقوش بھی ان کے دلوں پر چھوڑ جاتے۔

ڈاکٹر زورؔ حیدرآبادی تہذیب وتمدن کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے تاریخ ساز سے بڑھ کر تاریخ کو بدل دیا اور اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ دلّی اور دوسری ریاستوں میں بھی اُن کی قابلیت، ملنساری اور مہمان نوازی کے چرچے ہوتے رہتے تھے۔ شمالی ہند سے جو بھی ادبی شخصیت دکن آتی تھی اُن سے ملاقات کیے بغیر نہیں جاتی۔ وہ نہ صرف اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے بلکہ ان کی سیر وسیاحت میں بھی اُن کی رہنمائی کرتے تھے۔

ملک کی تقسیم ہوئی بابائے اردو مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے اور وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ڈاکٹر زور اردو کے اتنے بڑے اسکالر تھے کہ پاکستان میں اُن کی بڑی عزت ہوتی مگر اُن کے دماغ میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا کہ وہ پاکستان میں قیام پذیر ہوں گے۔ وہ حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب وتمدن کے پرستار تھے۔

انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہر انسان میں صرف خوبیاں نہیں ہوتیں بلکہ چند خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں ایسا کونسا انسان ہے جو غلطیوں سے مبرا ہو یا جس میں کوئی خامی ہی نہ ہو؟ اگر کوئی ایسا انسان ہے تو وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے مگر ایک انسان کو فرشتہ ہونے سے بہتر ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بنے۔ ڈاکٹر زور کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ کہنے والوں نے انھیں عاشق مزاج کہا۔ قاضی عبدالقیوم جو ڈاکٹر زورؔ کے داماد ہیں۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ ڈاکٹر زورؔ ایک فارن لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اگر ڈاکٹر زورؔ چاہتے تو ضرور ایسا کر سکتے تھے مگر انھوں نے نہیں کیا۔ خاندانی تقدس کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

خود ڈاکٹر زورؔ کا عزم تھا کہ:

> ''میرا تعلق تصوف وعرفان کے خاندان سے ہے اور میں کبھی نا اُمید نہیں ہوسکتا''۔

ان کی شخصیت کی یہ ہمہ گیریت انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

ڈاکٹر زور کی جدائی پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ان کے فرزند سید صفی الدین قادری زور اپنے والد کو ان

الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

''ہمیں فخر ہے کہ ہم اس برگزیدہ ہستی کی خاک پا ہیں جس نے اردو زبان وادب کی تادم آخر خلوص، جرات اور بے باکی کے ساتھ بے لوث اور ان تھک خدمت کی۔ کبھی نام ونمود اور شہرت کے طلب گار نہ ہوئے۔ اور کبھی دولت و ثروت اور اما رو راحت کی طرف دوڑے۔ کیوں کہ وہ خود اس کا اظہار اس شعر میں کرتے ہیں:

اے زور نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے یہ سب دھوکے کی جگہ
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

ڈاکٹر زور صاحب کی زندگی قلندری اور سادگی کی ایسی مثال ہے جس سے ہم کو سبق لینا ضروری ہے

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے ۳۳

سماجی وتہذیبی خدمات، دکنی تہذیب کے محافظ

ڈاکٹر زور اپنی ذات میں انجمن ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے دکنی زبان کے تحفظ اور فروغ اور حیدرآبادی تہذیب کو پروان چڑھانے میں نمایاں کام انجام دیا۔ وہ دکنی زبان وادب اور دکنی تہذیب کے سچے پرستار اور عاشق تھے۔ اور اس کے تحفظ کے لئے انہوں نے دل وجان سے کام کیا۔ دکن کے علاقے میں قطب شاہی، عادل شاہی، برید شاہی، بہمنی سلطنت اور سلاطین آصفیہ نے دکنی تہذیب کو پروان چڑھایا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کی زبان دکنی تھی۔ یہاں چار سو سال کے عرصے میں اردو شعر وادب پروان چڑھتا رہا۔ دکن کے لوگوں کے رسم ورواج، شادی بیاہ، تہوار، عید برات سے دکنی تہذیب جھلکتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی تصانیف، اپنے افسانوں اور ادارہ ادبیات اردو کے قیام اور دیگر گوشوں سے دکنی ادب اور تہذیب کی شناخت محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ دکنی تہذیب کے تحفظ میں ڈاکٹر زور کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر مجید بیدار لکھتے ہیں:

ڈاکٹر زور دکنی تہذیب کے نہ صرف دلدادہ رہے بلکہ آخری عمر تک
انہوں نے اسی تہذیب کی نمائندگی کی۔ اس تہذیب میں ملنساری، بھائی چارگی

اور خلوص و محبت کو بڑا دخل تھا۔ دکنی تہذیب کی ان ہی خصوصیات کو زندہ رکھنے کے لئے انہوں نے ''یوم محمد قلی'' کی بنیاد رکھی تا کہ اس کے توسط سے دکنی تہذیب کو زندہ رکھا جائے۔ ۔ڈاکٹر زور نے تین سو سال بعد قطب شاہی تہذیب و ثقافت اور اس دور کی شاعری کو دوبارہ زندہ کیا۔ یہی ان کی دکنی تہذیب کی ترویج اور اس کے تحفظ کی علامت ہے'' ۳۴

ڈاکٹر زور کے تہذیبی اور سماجی کارناموں میں ادارہ ادبیات اردو کا قیام، رسالہ سب رس کا اجراء، یوم قلی قطب شاہ تقاریب کا اہتمام اور دیگر سرگرمیاں شامل ہیں۔ جن کا اجمالی تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کا قیام

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی زندگی میں یوں تو کئی کارنامے انجام دیئے لیکن ادارہ ادبیات اردو کا قیام اُن کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو یوروپ سے واپس لوٹنے کے ساتھ ہی آپ نے انجام دیا۔ حیدرآباد دکن کا علاقہ ایک عرصے سے اردو زبان و ادب اور مشرقی تہذیب کا گہوارہ رہا۔ اردو زبان کا آغاز تو شمالی ہند میں ہوا۔ لیکن جنوب میں دکن کے علاقے میں یہ زبان پروان چڑھتی رہی۔ اور اردو شعر و ادب کی قدیم اصناف جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، داستان وغیرہ کے ابتدائی اور شاہکار نقوش یہیں ملتے ہیں۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ بھی دکن سے تعلق رکھتا ہے۔ کتابوں کی طباعت کے فن کی ایجاد سے قبل شعرا اور ادیب اپنی شعری و نثری تخلیقات کو مخطوطوں کی شکل میں پیش کیا کرتے تھے اور کتب خانے اور دیگر ادارے ان فن پاروں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری سنبھالتے تھے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ان قیمتی مخطوطات کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ دکنی زبان کے سرمایے کے تحفظ کی شعوری کوشش شروع ہوئی۔ اور دکنی زبان و ادب کے نامور محقق و نقاد، ادیب و ماہر لسانیات، دکن کے مایہ ناز سپوت ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اس جانب پیش قدمی کی۔

1930ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے تو انہیں شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ حیدرآباد میں اردو زبان کے لئے سازگار ماحول موجود ہے۔ کیوں نہ یہاں ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس کے ذریعے دکنی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کا تحفظ و ترویج ہو۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے ابھرتے

ہوئے مصنفین اور شعراء کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار اور تخلیقات کی پیشکشی کے لئے بھی ایک پلیٹ فارم مہیا ہو۔

بعض کم نظر اصحاب نے اس ادارہ کو انجمن ترقی اردو کا مدمقابل قرار دیا تھا۔ان کی نظر میں ''انجمن ترقی اردو'' کے ہوتے ہوئے ادارہ کے قیام کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ حقیقت سے بعید ہے۔دراصل انجمن ترقی اردو مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں ان کے مخصوص دائرہ کی حد تک محدود تھی۔ڈاکٹر زورؔ کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ جنوبی ہند کے ادیب،شعراء و مصنفین کو ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جہاں یہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکے۔لہذا انھوں نے اپنے اس مقصد کے لیے ملک ے ہر طبقہ کو اپنے ساتھ رکھا جس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔اس ادارے کے اغراض و مقاصد اس طرح ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے اغراض و مقاصد:

ادارۂ ادبیات اردو کو قائم کرنے کا سب سے بڑا مقصد بلا لحاظ مذہب وملت نہ صرف اردو زبان کی خدمت بلکہ مشترکہ قومی تمدن کی حفاظت بھی ہے جو ڈاکٹر زورؔ کے خوابوں کی تعبیر ہے۔اس ادارہ کے قیام کا ایک اور سبب یہ بھی ہوا کہ شہر حیدرآباد کے اہم عہدوں پر شمالی ہند کے لوگ چھائے ہوئے تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ادبی سرگرمیوں حیدرآبادی اصحاب بڑھ چڑھ کر حصہ لیں کیوں کہ اگر حیدرآبادی لوگ ان سرگرمیوں آگے بڑھ جائیں تو جو مقام انھیں حاصل تھا وہ باقی نہ رہے گا۔اس لیے انھوں نے سر اکبر حیدری کے آگے حیدرآبادی نوجوانوں کی شکایت کی۔

محمد اکبرالدین صدیقی کہتے ہیں:

> ''یہ حضرات انجمن بنا کر ریاست کے مفاد کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ اگر ابھی سے اس کا انسداد نہ ہو تو پانی سر سے اونچا ہو جائے گا اور پھر کچھ بنائے نہ بن سکے گا''۔۳۵

اس جھوٹی شکایت کے بعد سر اکبر حیدری جیسا مدبر ان کی باتوں میں آ گیا۔یوروپ سے واپس آئے ہوئے حضرات کو فرداً فرداً چائے پر بلا کر تنبیہ کی۔اُن نوجوانوں نے بہت سمجھایا کہ ہم صرف مضامین پڑھتے ہیں۔شعر کہتے ہیں اور علمی بحث و مباحثے کرتے ہیں لیکن اس کا تعلق ''سیاست'' سے نہیں ہے۔لیکن پھر بھی ان نوجوانوں کی نہیں سنی گئی۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنے شاگردوں اور دوست احباب کو ساتھ لے کر جو علمی انجمن کی بناء ڈالی تھی برخاست کر دی گئی۔اس سانحہ کے بعد بعض اصحاب نے ہمت ہار دی اور بعض نے ہمت جٹائی۔ڈاکٹر زورؔ نے انتہائی ناموافق حالات میں اپنے

چند ساتھیوں کے ساتھ جس میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی، عبدالقادر صدیقی، عبدالقادر سروری اور نصیرالدین ہاشمی کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں ''ادارہ ادبیات اردو'' قائم کیا۔ اس وقت ڈاکٹر زورؔ کی عمر صرف ۲۷ سال کی تھی۔ اس طرح انھوں نے شعراء، ادباء اور قلم کاروں کو ایک مرکز پر لانے کی کامیاب کوشش کی۔

ڈاکٹر زور نے نئی نسل میں اردو زبان کے لیے کام کرنے کا نہ صرف جذبہ پیدا کیا بلکہ اُن میں ہمت بھی پیدا کی اور اُس وقت پھیلی ہوئی بے چینی اور احساس کمتری سے نجات دلائی۔ ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد میں اردو زبان کے فروغ و اشاعت کا کام، شعراء و مصنفین کی حوصلہ افزائی اور انھیں تصنیف و تالیف کی سہولتیں فراہم کرنا، عوام کو اردو تعلیم سے روشناس کروایا، اردو زبان و ادب کو وسعت دینا، ملک کی تاریخ، قدیم آثار و ادب کے شہ پاروں کی حفاظت کرنا، ایک سہولت بخش کتب خانے کا قیام اور خواتین کے اندر کتب بینی کے ذوق کو پروان چڑھانا شامل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے ذریعہ اس ادارہ کو انتہائی کارکرد بنایا اور بہت کم عرصہ میں ادارہ کی کئی شاخیں قائم ہوگئیں۔ آج برصغیر ہند کے محققین و دانشوران اردو اس ادارہ سے استفادہ کررہے ہیں۔ اس عالی شان عمارت کی تعمیر کرکے انھوں نے ہزاروں بیش قیمت مخطوطات، مطبوعات، دکن کی تاریخ، دکنی تہذیب و تمدن کے علاوہ نوادرات اور ادبی آثار کا ایک گنج ہائے گراں مایہ بنادیا ہے جو آج بھی لاثانی ہے۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے حسب ذیل مقاصد قرار پاتے ہیں۔

- ☆ اردو زبان و ادب کی توسیع و حفاظت
- ☆ اہل سرزمین دکن میں اردو زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔
- ☆ ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا۔
- ☆ عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا۔
- ☆ اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرانا۔
- ☆ دکن کے تاریخی و ادبی ورثے کی حفاظت کرنا۔
- ☆ ایک ایسا کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور سے دکن کی قدیم کتابیں، مخطوطات اور علمی و سرمایے محفوظ رہ سکیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے قیام کے لئے لائحہ عمل:

- ☆ ادارہ کے بنیادی مسلک کا تحفظ

☆ رقمی معاملات اور آمد و رفت کی تنظیم اور موازنہ کی تشکیل

☆ مطبوعات ادارہ کے سلسلہ میں کتابوں کا انتخاب اور اشاعت کا انتظام

☆ ادارہ کی مجلسوں، شعبوں اور شاخوں کا انتظام اور نگرانی

☆ رفقا اور اراکین کا تعین اور ان کے فرائض و حقوق کی تشخیص

☆ کتب خانے کی تعمیر، توسیع اور اس کا انتظام

ادارۂ ادبیات اردو کا سنگ بنیاد

اس نصب العین کو لے کر ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اپنے رفقاء عبدالقادر سروری، عبدالمجید صدیقی، عبدالقادر صدیقی اور نصیرالدین ہاشمی کی اعانت سے 1931ء میں ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ جس کا نام ''ادارۂ ادبیات اردو'' رکھا گیا۔ ابتداء میں اس ادارہ کا کوئی فنڈ نہیں تھا۔ موسسین ادارہ کی ذاتی امداد سے اس ادارہ کی کارکردگی کی شروعات ہوئی۔ بعد میں کئی ذی حیثیت افراد اس ادارے سے جڑتے گئے۔ جس کی وجہ سے ادارے کے لئے مالی مدد میں اضافہ ہوا۔ اور ادارہ کو خود مکتفی بنانے کے بھی اقدامات کئے گئے۔ بعد میں بیگم زور نے ادارہ کی مستقل عمارت کے لئے زمین کا عطیہ دیا۔ جس پر ''ایوان اردو'' کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت تعمیر ہوئی۔ نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو چیف منسٹر حیدرآباد رام کرشنا راؤ نے رکھا۔ امجد حیدرآبادی نے ادارے کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے

ادارے کی بڑھتی ضروریات کے پیش نظر اسے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ڈاکٹر زورؔ نے نہایت وسیع القلبی سے کام لے کر اپنے دوست، احباب کے علاوہ اردو سے دلچسپی اور خدمت کا جذبہ رکھنے والے نوجوانوں، بوڑھوں، ادیبوں، شعراء، ناقدین اور محققین کو اپنے اطراف جمع کیا۔ کام کی سہولت اور منظّم انداز سے ادارہ کو چلانے کے لیے ادارہ کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شعبۂ زبان

اس شعبہ کا مقصد اردو زبان کے عام اور خاص مسائل پر غور کرنا، دفتری زبان کی اصلاح نیز اردو زبان کو جدید ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ اس شعبے کے پہلے معتمد مولوی ضیاءالدین انصاری تھے۔

۲۔ شعبۂ تنقید

اس شعبہ کا مقصد اردو زبان میں تنقید کو فروغ دینا تھا۔ متوازن اور صحت مند تنقید کو پروان چڑھانے کے لئے یہ شعبہ تشکیل دیا گیا۔ ماہنامہ ''سب رس'' کے ذریعے ناقدانہ شعور پیدا کرنا بھی اس شعبہ کے قیام کا ایک مقصد تھا۔ شعبہ تنقید کے پہلے معتمد اردو کے مشہور محقق اور نقاد پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔

۳۔ شعبۂ تاریخ دکن

اس شعبہ کا مقصد دکن کی تاریخ پر تحقیق کو فروغ دینا تھا۔ اور دکن کے تاریخی آثار کو محفوظ کرانا تھا۔ شعبہ دکن کے پہلے معتمد پروفیسر عبدالمجید صدیقی تھے۔

۴۔ شعبۂ شعراء و مصنفین دکن

اس شعبہ کا مقصد دکن کے گمنام شعرا اور منصنفین کے کارناموں کی بازیافت اور ان کی وضاحتی فہرستوں کی اشاعت تھا۔

۵۔ شعبۂ سائنس

اس شعبہ کے تحت آسان اور عام فہم زبان میں سائنسی موضوعات پر کتابیں لکھوائی گئیں۔ اس ضمن میں دکن کے نامور سائنس دان قاضی سید معین الدین کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۶۔ شعبۂ نسواں

اس شعبہ کے تحت قابل خواتین کے ادبی کارناموں کو اجاگر کیا جانے لگا۔ فاطمہ عالم علی خان اس شعبے کی صدر ہیں۔

۷۔ شعبۂ اطفال

اردو زبان میں بچوں کے ادب کی کمی کے پیش نظر ادارے نے شعبہ اطفال قائم کیا تھا لیکن یہ شعبہ بند ہو گیا۔

۸۔ شعبۂ اردو امتحانات

ادارے کا یہ فعال شعبہ ہے۔ اس ادارے کے تحت اردو دانی، زبان دانی، انشا، عالم اور فاضل امتحانات منعقد ہوتے ہیں۔ غیر اردو داں طلبا اور گھریلو خواتین ان امتحانات میں شرکت کرتے ہوئے اپنی اردو دانی کو پروان چڑھاتی ہیں۔ اردو فاضل امتحان کامیاب طلبا کو مختلف جامعات میں گرائجویشن میں داخلہ ملتا ہے اور وہ مزید تعلیم حاصل کرتے ہوئے سرکاری ملازمتوں میں بھی داخل ہو رہے ہیں۔

۹۔ شعبۂ کتب خانہ

اس شعبہ کے تحت ادارہ ادارہ ادبیات اردو میں واقع کتب خانے کو چلایا جاتا ہے۔اس کتب خانے میں قدیم و جدید مطبوعہ کتب اور رسائل کے علاوہ قلمی نسخوں کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ادارے کے کتب خانے میں تقریباً پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور چار ہزار مخطوطات ہیں۔

۱۰۔ شعبہ اُردو انسائیکلو پیڈیا

اس شعبہ کے تحت اردو انسائیکلو پیڈیا ترتیب دینا تھا۔

۱۱۔ ماہنامہ ''سب رس''

ادارے کا ترجمان رسالہ سب رس ہے۔جنوری ۱۹۳۸ء میں سب رس کا اجرا عمل میں آیا۔اس رسالے کے اجرا کا مقصد نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا ہے۔اردو کے کئی ادیبوں اور شاعروں کی ابتدائی تخلیقات سب رس میں شائع ہوئیں۔اور آگے چل کر انہوں نے ادبی دنیا میں اہمیت و شہرت حاصل کی۔سب رس ایک سال تک ڈاکٹر زور کی نگرانی میں پھر صاحب زادہ میکش، حمید الدین شاہد، پروفیسر مغنی تبسم اور اب پروفیسر بیگ احساس کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

شعبوں کے اغراض و مقاصد

(۱) ادارہ کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں میں تقسیم عمل کے ذریعہ سے آسانی کار پیدا کرنا۔

(۲) ادارہ کے معاملات میں مختلف خیال اور نقطہ نظر کا اصحاب کو تعاون حاصل کرنا۔

(۳) ادارہ کے ہمدردوں اور رفیقان کار کے حلقہ میں وسعت پیدا کرنا۔

(۴) ایک ایسی صاحب الرائے جماعت کی فراہمی جو ادارہ کو ہر علمی معاملہ میں مشورہ دے سکے۔

قواعد و ضوابط

(۱) ہر ایک شعبہ ایک داعی اور عموماً یہ اراکین پر مشتمل ہوگا اور اپنے صواب دید پر مزید اصحاب کا تعاون حاصل کر سکے گا۔

(معتمد اعزازی ادارہ بہ حیثیت عہدہ ہر شعبہ کے رکن ہوں گے)

(۲) ہر شعبہ کے اجلاس مہینے میں کم از کم ایک وقت یا جیسی ضرورت ہو منعقد ہوں۔

جلسوں کے انعقاد کے لئے مہینے کی کوئی ایک تاریخ معتمد اعزازی ادارہ کے مشورے سے
مقرر کرے گا اور کوشش کی جائے گی کہ حتی الامکان اسی تاریخ شعبہ کا جلسہ منعقد ہو۔

(۳) ہر شعبہ کے کام کی حیثیت زیادہ تر علمی ہوگی اور داعی شعبہ اپنے شعبہ کے ماہانہ جلسوں کی روئداد ماہ بہ ماہ معتمد ادارہ کے پاس روانہ کیا کریں گے اور حسب ضرورت یہ روئدادیں ادارہ کے ماہنامہ ''سب رس'' میں شائع ہوتی رہیں گی۔ نیز شعبوں کی سفارشات مزید کاروائی کے لئے ادارہ کی مجلس انتظامی میں پیش کی جائیں گی اور ان پر حسبِ ضرورت ادارہ عمل کرے گا۔

(۴) اگر ضرورت ہو تو ہر شعبہ اپنے لئے ایک فنڈ جمع کر سکتا ہے۔ جس کے حسابات کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔

ادارہ ادبیات اردو کی شاخیں

ادارہ ادبیات اردو جیسے جیسے اپنے اغراض و مقاصد میں یعنی اردو زبان' شعر و ادب کی ترقی و ترویج میں اپنے مرکزی مقام حیدرآباد میں کامیابی حاصل کرنے لگے اور ماہنامہ ''سب رس'' کے ذریعہ سارے دکن کے علاقوں میں اپنی آواز کو پہنچانے لگے۔ اور ادارہ کے ذمہ داران مختلف اضلاع کا دورہ کرتے ہوئے وہاں کے اہل ذوق اصحاب سے ملاقاتیں کیں اور ادارہ کے شاخوں کے قیام کے سلسلے میں آگے آنے کی ترغیب دی تو پھر اضلاع سے کچھ محبان اردو نے ادارہ کے تعاون کے لئے اپنے دست دراز کرنے لگے اور خدمات کو پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کئے۔ اس طرح ایک طف ادارہ کی شاخوں کا قیام عمل میں آنے لگا تو دوسری طرف ادارہ کے زیر اہتمام اردو امتحانات کے انعقاد سے اردو سیکھنے اور سکھانے کا جوش و جذبہ پروان چڑھنے لگا۔

> ''بہر حال کارکنانِ ادارہ نے اپنے دائرہ عمل میں وسعت دینے اور اپنے بنیادی مقصد کو مستحکم کرنے کے لئے مختلف اضلاع' دیہات اور تعلقوں کے دورے کئے اور وہاں اصحاب ذوق کو ادارہ کے ساتھ تعاون عمل کرنے پر آمادہ کر کے ادارہ کی شاخیں قائم کر دیں۔ چنانچہ ۴۰۔۱۹۳۹ء میں) گلبرگہ بھنی' کلیانی' محبوب نگر' جالنہ اور عثمان آباد میں شاخیں قائم ہوئیں۔ ۳۶

شاخوں کے قاعدے اور طرز کار:۔ حیدرآباد سے باہر اگر کسی مقام کے اہل ذوق اصحاب اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت کی خاطر اجتماعی طور پر کوشش کرنا چاہتے ہوں تو ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد صاحب اعزازی کے نام

پانچ علم دوست اصحاب کے دستخطوں کے ساتھ ایک خط روانہ کریں تا کہ قیام شاخ کے لئے اجازت نامہ کا فارم بھیجا جائے۔ اس فارم کو بعد خانہ پُری واپس کرنے پر معتمد صاحب مذکور ادارہ کی مجلس انتظامی سے منظوری حاصل کر کے قیام شاخ کو اطلاع دیں گے اور اس سلسلے میں ضروری کاروائی کریں گے۔

ادارہ کی شاخوں کے اغراض ومقاصد حسبِ ذیل ہیں:۔

۱) ادارہ کے اردو امتحانات کا چرچا کرنا۔

۲) امتحان زبان دانی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳) اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم کے لئے معاوضے کے ساتھ انتظام کرنا۔

۴) اردو مطالعہ خانہ قائم کرنا۔

۵) سب رس کے لئے قلمی معاون اور خریداروں کو فراہم کرنا۔

۶) ادارہ کے قواعد کے تحت اپنے ارکان بنانا اور جمع شدہ رقم میں سے صرف نصف کی حد تک صدر ادارہ کو روانہ کرنا اور نصف سے اپنی شاخ اور مطالعہ خانہ کے اخراجات کا انتظام کرنا۔

۷) شاخیں سب رس کے جو خریدار فراہم کریں گی ان کے چندے کا ایک چوتھائی حصہ ادارے کی طرف سے بطور امداد اخبارات ورسائل کی صورت میں شاخوں کو دیا جائے گا۔

۸) ہر شاخ کی دارالمطالعہ کے لئے ادارہ کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ اصف قیمت پر دیا جائے گا۔ اور شاخوں کی کوشش سے جس قدر مطبوعات فروخت ہوں گی ان پر ۸/۱ کمیشن شاخوں کو دیا جائے گا۔

۹) ان کے علاوہ شاخوں کے مزید قواعد وضوابط وہی ہوں گے جو ادارہ ادبیات اردو کے ہیں۔[۵]

قواعد رکنیت ادارہ

ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے وقت جو قواعد رکنیت بنائے گئے تھے اُس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ادارہ کے فروغ کے لئے ہر طرح کے طریقہ کا استعمال کیا گیا تھا۔ جس میں سہولتیں رکھی گئیں تھیں تا کہ آسانی کے ساتھ کوئی بھی اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھتا ہو وہ رکنیت حاصل کرتے ہوئے ادارہ کے فرائض ومقاصد کے پروان چڑھانے میں اپنا رول ادا کر سکے۔

ادارہ کی رکنیت کے لئے حسب ذیل قواعد پر مبنی نکات ترتیب دیئے گئے۔

۱) سرپرست وہ ہوں گے جو ایک ہزار روپے یکمشت یا ایک سو روپے سالانہ ادارہ کو عطا کریں۔
۲) معاون وہ ہوں گے جو ڈھائی سو روپے یکمشت یا پچیس روپے سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔
ان کو سال بہ سال مطبوعاتِ ادارہ بلا قیمت دی جائیں گی۔
۳) رکن دوامی وہ ہوں گے جو از روئے قواعد بالا ادارہ کے سرپرست یا معاون ہوں یا وہ جو ادارہ کو پچاس روپے یکمشت عطا کریں گے۔ان کو سال بہ سال ادارہ کے مطبوعات ورسائل تین چوتھائی قیمت پر دیئے جائیں گے۔
۴) رکن الف وہ ہوں گے جو چھ روپے سالانہ دیں۔ان کے سال بہ سال ادارہ کے مطبوعات ورسائل تین چوتھائی قیمت پر دیئے جائیں گے۔
۵) رکن ب وہ ہوں گے جو تین روپے سالانہ دیں گے ان کو سال بہ سال ادارہ کے مطبوعات ورسائل بارہ فیصد کم قیمت پر دیئے جائیں گے۔
۶) رفیق وہ ہوں گے جن کی علمی وادبی خدمات مستند سمجھی گئی ہو یا جو ادارہ کے علمی وادبی کاموں میں غیر معمولی حصہ لے رہے ہوں جس کے اعتراف میں مجلس انتظامی ان کو رفیق منتخب کرے گی۔[۶]

۱۹۴۴ء تک ادارۂ ادبیات اردو کو حکومت کی طرف سے یا کسی اور ذریعہ سے کوئی رقمی امداد نہیں تھی۔صرف چند کتابوں، علمی رسالہ ''سب رس'' یا امتحانات کے ذریعہ سے جو رقم حاصل ہوجایا کرتی تھی۔اس رقم سے اخراجات کی پابجائی نہیں ہو پاتی تھی۔اس دوران حیدرآباد کے وزیر فینانس غلام محمد صاحب نے ادارہ کا معائنہ کیا اور وہ ڈاکٹر زورؔ کے کام سے بہت متاثر ہوئے۔اس کے بعد انھوں نے ادارہ کے لیے باضابطہ رقم منظور کی۔زورؔ صاحب نے اردو کی اشاعت کے لیے باضابطہ اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا۔حکومت سے نمائندگی کر کے ملازمین درجہ چہارم، رشتہ آبکاری اور باقاعدہ افواج کے لیے اردو امتحانات کو لازمی کروایا۔اُن کی اس زبردست کارناموں کی وجہ سے ہزاروں لوگ اردو دان بن سکے۔

1931ء میں ادارۂ ادبیات اردو کے قیام کے بعد سے اس کی مصروفیتوں میں اِضافہ ہوتا گیا۔ادارۂ ادبیات اردو کے قیام کے بعد اس کی سرگرمیوں سے لوگوں کو واقف کرنے کے لئے ادارے کے ترجمان رسالے کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی گئی۔چنانچہ 1938ء میں ''سب رس'' کے نام سے اردو ادبی وتحقیقی رسالہ جاری کیا گیا جو آج تک کامیابی سے نکل رہا ہے۔اور ساری دنیا میں اردو کا معیاری ادبی وتحقیقی رسالہ مانا جاتا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کا سب سے بڑا کام اردو کی توسیع اور اشاعت ہے۔اس سلسلہ کی ایک کڑی ماہ نامہ ''سب رس'' ہے۔ یہ ایک علمی وادبی رسالہ ہے جو جنوری ۱۹۳۸ء سے شائع ہونے لگا۔ یہ رسالہ علم وادب کا علمبردار تھا جس میں ملک کے نوجوان ادیب وشعراء کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔اس رسالہ کے نگران کار ڈاکٹر زورؔ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے شاگردوں اور ملک کے نوجوانوں میں کام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا ہو۔ دکن والوں میں جو لوگ بھی احساس کمتری کا شکار تھے ڈاکٹر زورؔ اس بات کو بخوبی جانتے تھے۔اس احساس کمتری کو نکالنے میں ڈاکٹر زورؔ نے بہت بڑی محنت کی۔

ادارۂ ادبیات کی جانب سے سب سے پہلے مخدوم محی الدین کا ڈرامہ ''ہوش کے ناخن'' شائع ہوا۔ یہ ڈرامہ عبدالرحمٰن خاں پرنسپل جامعہ عثمانیہ کے نام معنون تھی۔اس ڈرامہ کی اشاعت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ڈاکٹر زور نے اپنے ساتھیوں یا اُس وقت کے مشہور ادباء وعلماء کی تصانیف شائع نہیں کی بلکہ اپنے شاگرد کی تصنیف شائع کی۔محمد اکبرالدین صدیقی کہتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت تھا اپنے استادِ مشفق کی بارگاہ میں ادارے کی سب سے پہلی کتاب اس کے بانیوں کے شاگردوں نے لکھی اور بانیوں کے اُستاد کے نام معنون ہوئی''۔۳۷

متذکرہ بالا خوبیوں کے علاوہ ایک اور خوبی ادارۂ ادبیات اردو کے ساتھ یہ رہی کہ اگر ادارہ کے قیام میں بیگم زورؔ صاحبہ پیش پیش نہ ہوتیں تو اس کا قیام شاید ناممکن ہوتا۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے دوسرے مقاصد پر عمل آوری کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف پر توجہ دی خصوصاً دکن کی تاریخ وتہذیب کے تحفظ اور فروغ پر زور دیا گیا۔جس کی بناء یہ ادارہ دکن کی تاریخ وتہذیب اور اردو زبان وادب کی تحقیق کا ایک اہم مرکز بن گیا۔اس ادارہ سے کئی تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں۔''سلسلہ انتخاب شعرائے ادب'' کے تحت دکن کے مشہور شعرائے اردو کا کلام معہ مقدمے کے شائع کیا گیا۔اس تحقیقی کارنامے سے اردو زبان وادب کی گمشدہ کڑیوں کو جوڑنے میں کافی مدد ملی۔ یہ کتابیں اردو زبان کی لسانی، تہذیبی اور تاریخی مطالعے میں معاون ثابت ہوئیں۔ان انتخابات کی اشاعت سے کسی مخصوص عہد کی پوری ادبی فضاء کو جاننے کا موقع ملا۔اور بعد میں آنے والے محققین کے لئے یہ کتابیں نشان راہ ثابت ہوئیں۔جن شعرا کا انتخاب پیش کیا گیا ان میں قابل ذکر سراجؔ اورنگ آبادی، شیر محمد خاں ایماںؔ، میر شمس الدین فیضؔ، احمد حسین مائلؔ، سید تقی الدین بن حسن کیفیؔ، نواب عزیز

یار جنگ بہادر عزیزؔ، میر احمد علی عصرؔ، گردھاری پرشاد، راجہ محبوب نواز بسنت باقی، سید اللہ جوگی بہاری لال رمزؔ اور محمد بہبود علی صاحب صفیؔ وغیرہ شامل ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو سے ادبی تاریخوں پر بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں جیسے عربی، فارسی، اردو، ہندی اور تاریخ پر کام کیا گیا۔ جس سے اردو داں حضرات کو دوسری زبانوں کے ادب سے روشناس ہونے کا موقع فراہم ہوا۔ ان کے علاوہ کئی تحقیقی مقالوں اور مضامین کو بھی کتابی شکل دی گئی۔

ادارۂ ادبیات اردو نے ایک اہم کام یہ بھی انجام دیا کہ دکن کے مشہور شعراء و مصنفین کی قبروں پر کتبے لگوئے۔ کیونکہ ایسے کئی شعرا اور ادیب گذر چکے تھے جن کی آرام گاہوں کا عوام کو علم نہ تھا اور ان کی تاریخ پیدائیش وہ تاریخ وفات کا کسی کو علم تھا۔ ادارہ نے بعد تحقیق کتبے بناتے ہوئے قبروں پر لگوائے جن پر صاحب مزار کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا ذکر تھا۔ اس سے آنے والے محققین کو کافی سہولت ہوئی۔ اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ شاہ سراجؔ اورنگ آبادی، شاہ نصیر دہلوی، شاہ تجلی فیضؔ، میر عصرؔ اور عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری کی آخری آرام گاہیں اسی تحقیق سے سامنے آئیں۔ اور ان کی قبور کی شناخت باقی رہی۔

ادارۂ ادبیات اردو کا اہم کارنامہ کتب خانے کا قیام رہا۔ ادارے کے کتب خانے میں قدیم ادب کے بکھرے خزانے کو یکجا کیا گیا۔ اس کوشش سے اس کتب خانے میں ہزاروں کی تعداد میں نایاب مخطوطات و مطبوعات، قدیم شاہی فرامین، دستاویزات، نقشہ جات، تصاویر اور اسلحہ جات کو جمع کر کے میوزیم کی شکل دی گئی۔ اس کوشش سے ادارے میں دکن کی تاریخ اور تہذیب محفوظ ہوگئی۔ یہ ادارہ اردو تحقیق کی دنیا میں زبان و ادب کی تحقیق کے لئے مواد کی فراہمی کا اہم مرکز بن گیا۔ یہاں نادر کتب کے متلاشی محققین کو ان کے لئے درکار کتابیں حاصل ہوتی ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو سے کئی نادر تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ خواجہ میر دردؔ حیات اور شاعری (میر عابد علی خان) انگریزی ادب کی مختصر تاریخ (مرزا زاہد علی) عہد آصف الدولہ میں اردو ادب (سید علی حسین) اردو مثنوری کا ارتقاء (پروفیسر عبدالقادر سروری) اردو میں سائینسی ادب (خواجہ حمید الدین شاہد) اقبال کا تصور عشق (ڈاکٹر غلام عمر خان) اقبال کا تصور خودی (ڈاکٹر غلام عمر خان) ایمان سخن (سید محمد) بادۂ سخن (ڈاکٹر زور) تاریخ ادب اردو (ادارہ) تحفۃ الشعراء (ڈاکٹر حفیظ قتیل) تذکرہ اردو مخطوطات (ڈاکٹر زور) حیدرآباد فرخندہ

بنیاد(ڈاکٹر زور) داستان ادب حیدرآباد(ڈاکٹر زور) دیوان عشق (محمد اکبر الدین صدیقی) دیوان ہاشمی بیجاپوری (ڈاکٹر حفیظ قتیل) رمز سخن (ڈاکٹر زور) روح غالب (ڈاکٹر زور) سراج سخن (پروفیسر عبدالقادر سروری) سرگذشت حاتم (ڈاکٹر زور) شعرائے عثمانیہ (معین قریشی) فیض سخن (ڈاکٹر زور) سرگذشت غالب (ڈاکٹر زور) کلمۃ الحقائق (محمد اکبرالدین صدیقی) کلیات غواصی (محمد بن عمر) کیف سخن (ڈاکٹر زور) گارساں دتاسی (ڈاکٹر زور) متاع سخن (ڈاکٹر زور) مدراس میں اردو (نصیرالدین ہاشمی) معانی سخن (ڈاکٹر زور) مرقع سخن (جلد اول ودوم ۔ڈاکٹر زور) میر محمد مومن (ڈاکٹر زور) نذر محمد قلی قطب شاہ (ڈاکٹر زور) نذر معانی (وقار خلیل) نذر ولی (جہاں بانو نقوی اور دیگر خواتین) دیوان داؤد (ڈاکٹر خالدہ یوسف)

ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کے سنگ بنیاد تقریب کے موقع پر ڈاکٹر زورؔ کی تقریر: ۱۹۵۵ء میں جب ایوان اردو کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تب تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے کہا کہ'' آج سے تقریباً تیس سال قبل ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو اس مقصد کے تحت قائم کیا گیا کہ حیدرآباد اور جنوبی ہند میں اردو کا ذوق عام کیا جائے ۔ اور اس خطۂ ملک کے موجودہ اور گزشتہ اردو شاعر اور ادیب اردو دنیا میں اس طرح روشناس ہوں کہ ان کے جائز حقوق ان کو مل سکیں ۔اور ساتھ ہی یہاں کے نوجوانوں میں وہ خود اعتمادی اور شگفتگی پیدا کی جائے جس کے بغیر شعر وادب کی ترقی اور خوشگوار ارتقاء کسی بھی مل میں ممکن نہیں ۔ خدا کا شکر ہے اس مقصد میں ادارہ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور حیدرآباد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر ادیب اور شاعر ایسا ہوگا جس کے ریشہ قلم ادارے کے طرف سے کتابی شکل میں یا اس کے ترجمان ماہنامہ سب رس میں شائع نہ ہوئے ہوں ۔اور جن کا کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی طرح ادارے سے تعلق نہ رہا ہو۔

ادارے کا کام یوں تو دس شعبوں میں منقسم ہے ۔اور ان میں سے ہر شعبہ بجائے خود ایک ادارے کا کام انجام دیتا رہا ہے ۔لیکن ان میں چند شعبوں میں بڑی غیر معمولی ترقی کی جن میں سے ایک مخطوطات اور مطبوعات کا کتب خانہ ہے ۔جس میں ۲۵ ہزار مطبوعہ کتابیں اور پانچ ہزار سے زائد قلمی نوادر شامل ہیں ۔اور ان کی ضخیم توضیحی فہرستیں ہر سال شائع کی جارہی ہیں ۔ چنانچہ گذکرہ مخطوطات کی پانچ جلدین دو ہزار صفحات پر مشتمل ہیں ۔ اور فہرست مطبوعات کی دو جلدین چھپ چکی ہیں ۔اور تمام اردو دنیا ان سے مستفید ہورہی ہے ۔ چنانچہ دور دور سے اہل علم وتحیق ان سے استفادے کے لئے آتے یا مراسلت کرتے رہتے ہیں ۔

ادارے کا ایک اور شعبہ تاریخ وآثار ثقافت کے لئے وقف ہے ۔اس شعبہ کا کام بھی رفتہ رفتہ اتنا ترقی

کر گیا کہ ایوان اردو کا ایک بڑا حصہ اس کے لئے مختص کرنا پڑا۔اس میں مشاہیر اردو کے اصلی خطوط ان کے علمی و ادبی آثار' تصاویر' اور گولکنڈہ بیجاپور اورنگ آباد اور بیدر وغیرہ کے ثقافتی شاہکاروں غزلوں' گیتوں اور انکے چربوں کو محفوظ کیا گیا۔دکن کے خطاطوں' فنکاروں اور نقاشوں کے عمدہ نمونے اس میں جمع ہیں کہ آج ادارہ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔اس سرزمین کے نظم ونسق' آرٹ وقلم کاری کا جو ذخیرہ اس میں موجود ہے شائد ہی کسی اور جگہ مل سکے۔اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس گنجینہء علم وہ ہنر کا اکثر و بیشتر حصہ چند مشفق اور مکرم دوستوں ہی کا عطیہ ہے۔جس میں سرفہرست نواب عنایت جنگ بہادر کا نام نامی ہے۔دوسرے احباب میں ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ' نواب یٰسین علی خان' سکینہ بیگم صاحبہ شعبہ نسواں کی صدر' محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ' مولوی احمد اللہ خان صاحب مدرس گولکنڈہ ملا عبدالباسط صاحب' پروفیسر سید محمد اور مرحوم محمد حسین جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ ادارہ ۱۹۴۱ء سے ہر سال اردو کے امتحانات لیتا رہا ہے۔جن کے مرکز حیدرآباد سے باہر بھی دور دور قائم ہوتے رہیں ہیں۔اس طرح تقریباً بیس سال کے عرصہ میں اس نے ملک میں پڑھے لکھے افراد کا قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔۱۹۳۸ء سے ادارہ کا ماہوار ترجمان ''سب رس'' پابندی سے شائع ہورہا ہے۔اور ہندوستان کے معتبر اور مستدن رسالوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ایک اردو انسائیکلو پیڈیا کا منصوبہ بھی ادارہ کی طرف سے بنایا گیا تھا جو ایک جلد تیار کرنے کے بعد مالی دشواریوں کے باعث روک دیا گیا۔مگر اب عمارت کی تکمیل کے ساتھ اس کو پھر ایک مہم کے طور پر شروع کرنے کی توقع پیدا ہوگئی ہے۔خدا کرے کہ ہم اس امتحاں میں بھی کامیاب ثابت ہوں۔

سب رس کا اجراء اور اس کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر زورؔ نہ صرف ایک محقق ونقاد تھے بلکہ ایک اچھے شاعر،ادیب،اعلیٰ پائے کے مدیر اور مورخ بھی تھے۔رسالہ ''سب رس'' اور ''ایوان اردو'' آپ کے ایسے کارنامے ہیں جو اُن کو ہمیشہ زندہ جاوید رکھیں گے۔بقول رشید احمد صدیقی:

> ''بڑے آدمی کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے اعلیٰ مقاصد کے انصرام کے لیے کس پائے کے کتنے کام چھوڑے۔اس اعتبار سے میں مرحوم کو بڑا آدمی سمجھتا ہوں''۔۳۸

ڈاکٹر زور کا سب سے بڑا اور اہم کام ادارہ ادبیات اردو کا قیام ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں اردو زبان و ادب کی وسیع واشاعت کے ساتھ ساتھ دکن کی سرزمین میں نئے قلم کاروں میں شعروشاعری اور تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا کرنا بھی شامل تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے ساتھیوں، شاگردوں اور سبھی کی دامے، درمے اور سخنے مدد کیا کرتے تھے۔ خود محنت کرتے اور دوسروں سے بھی محنت کرواتے تھے۔ اپنی نگرانی میں سب رس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۳۸ء میں جاری کیا۔ اس رسالے کے پہلے مدیر میر محمود علی خاں میکش تھے۔

ڈاکٹر زورؔ کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ ''سب رس'' سب ہی کے لیے ہو یعنی یہ نہ صرف نوجوانوں بلکہ بچوں، بوڑھوں اور خواتین سبھی کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکے۔ اس میں طلباء کا حصہ بھی رکھا گیا جس میں نظمیں، کہانیاں اور مضامین ہوتے تھے۔ ہر رسالے کی ترتیب میں صنف نازک کی دلچسپیوں کا خاص خیال رکھا گیا۔ سب رس کے آخری میں ضمیمہ کے طور پر طلباء اور چھوٹے بچوں کے لیے ایک حصہ مختص کیا گیا تھا جو بے حد مقبول ہوا۔ ۱۹۳۹ء سے یہ علیحدہ طور پر نکالا گیا۔ مالی دشواریوں کے سبب یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ''سب رس معلومات'' جو سب رس کے ضمیمہ کے طور پر جاری کیا جس میں تاریخی، سائنسی اور معلوماتی مضامین، کھیل کی خبریں اور مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات شائع کی جاتی تھیں۔ یہ بھی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر زور کے زمانۂ حیات تک سب رس کے تقریباً ۲۲ شمارے شائع ہوئے۔ ان شماروں کی اردو دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور متعدد رسائل میں ان پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔ ڈاکٹر زورؔ کی وفات کے بعد مولوی اکبرالدین صدیقی اس رسالے کے مدیر کی حیثیت سے تقریباً ۱۲ سال تک اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کے بعد کئی اصحاب اس سے وابستہ ہوئے۔ اب سابق پروفیسر مغنی تبسم اس کے مدیر ہیں۔ ان کی محنت اور لگن سے کئی خصوصی شمارے اور نمبر شائع ہوئے۔

''سب رس'' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ جنگ کے زمانے میں جاری رہا۔ پولیس ایکشن کے زمانے میں جاری رہا اور ملک کی تقسیم کے وقت جاری رہا یہاں تک کہ ڈاکٹر زورؔ کے والد حضرت زعمؔ کے انتقال کے باوجود بھی جاری رہا۔ پروفیسر محمد انورالدین اس کے مقام و مرتبہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''اس رسالے نے کئی اہم ادبی شخصیتوں کی تعمیر کی۔ اگر ''زمانہ'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پریم چند اور ادبی دنیا نے کرشن چند کی ادبی شخصیت کی تعمیر کی تو ''سب رس'' کے تعلق سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اکبرالدین صدیقی، حمیدالدین شاہد، بشیرالنساء بشیر اور صاحب زادہ میر محمد علی خاں میکش

وغیرہ جیسی شخصیتوں کی تعمیر کی''۔۳۹؎

یہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو
مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امر ناممکن ہے
سب میں بہتر یہ ہے کہ ''سب رس'' لے لو

حضرت امجد حیدر آبادی

اب یہ لاجواب رسالہ پروفیسر بیگ احساس صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

خانقاہِ عنایت الٰہی کا قیام

ڈاکٹر زورؔ کے دادا سید شاہ عنایت اللہ مع اپنے خاندان رودِ موسیٰ (۱۹۰۸ء) میں غرق آب ہو گیے۔ جب ڈاکٹر زورؔ کے والد حافظ ابوالبرکات سید شاہ غلام محمد زعمؔ قادری الرفاعی نے داعی اجل فرمایا تو تدفین کے لیے اُسی مقام کا انتخاب کیا جہاں ان کے دادا اور اہل خاندان غرق آب ہوئے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ایک خطہ اراضی خرید کر اس پر شاندار گنبد تعمیر کیا۔ اس گنبد سے متصل ایک خانقاہ قائم کی اور اس کا نام ''خانقاہِ عنایت الٰہی'' رکھا۔ یہ خانقاہ مسلم جنگ پُل کے بازو واقع ہے۔ اس میں ''کتب خانہ اسلامیات'' اور ''مدرسہ اسلامیات'' کے نام سے مدارس قائم کئے گیے۔ کتب خانہ اسلامیات میں تصوف اور اسلامیات پر کئی کتابیں رکھی گئیں اور کئی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں بھی رکھی گئیں۔

مدرسہ اسلامیات کو چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر بند کر دیا گیا۔ اس خانقاہ کے سجادہ ڈاکٹر زور کے بڑے صاحبزادے سید شاہ تقی الدین قادری مرحوم تھے انھوں نے اپنی آخری سانس تک اپنے فرائض کو نبھایا۔ اب ان ہی کے فرزند یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ جب تک ڈاکٹر زورؔ بقید حیات تھے ہر سال اپنے والد کا عرس دھوم دھام سے منایا کرتے تھے اور ہر روز خانقاہ جا کر اپنے والد کو پھولوں کا نذرانہ ضرور دے آتے تھے۔

مرحوم سید صفی الدین قادری (فرزند زورؔ صاحب) لکھتے ہیں:

''بابا کی نظر میں دادا حضرت کی قدر اور منزلت اس وقت سے اور بھی بڑھ گئی جب سے کہ بابا نے اُن کو دفن سے چالیس دن بعد قبر میں تر و تازہ پایا۔

بابا کا بیان ہے کہ جب وہ قبر کو پختہ بنانے کا ارادہ کر چکے تو ''چہلم'' کے بعد جب بابا نے ایک گورکن کو قبر کی ایک کڑی ہٹانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ لیکن جب بابا نے خود ہی کڑیاں ہٹائیں تو پہلے خوب خوشبو آئی اور پھر جب اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتے کہ کپڑا چہرے پر سے ہٹا ہوا ہے، داڑھی اور چہرہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ دفن کے وقت تھا''۔[۴۰]

آخری عمر میں ڈاکٹر زورؔ کا ارادہ یہی تھا کہ وہ اپنے والد اور والدہ کے قریب ہی دفن ہوں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُن کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکی اور وہ کشمیر کی پُر فضاء وادی میں ابدی نیند سو گئے۔

قلی قطب شاہ تقاریب

ڈاکٹر زورؔ کو قلعہ گولکنڈہ اور سلاطین قطب شاہیہ کی تاریخ سے والہانہ عشق تھا۔ قطب شاہی دور کی گویا وہ زندہ انسائیکلو پیڈیا تھے۔ دکن کی ادبی اور تہذیبی اہمیت کو واضح کرنے میں انھوں نے اپنا تن، من اور دھن سب کچھ نثار کر دیا۔ انھیں اپنے وطن، مقامی معاشرت اور مشترکہ تہذیبی سرمایہ سے گہری محبت تھی۔ اس کا ایک ثبوت ''یوم محمد قلی'' تقاریب کا انعقاد ہے جس کو وہ ہر سال بڑے اہتمام سے منایا کرتے تھے۔ یہ قومی یکجہتی و جذباتی ہم آہنگی کی ایک ایسی تقریب تھی جس میں ماضی کی عظمت رفتہ کی یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کی ترقی کے احساسات بھی پیدا ہونے لگے جس سے ان کی وسیع النظری اور فراخدلی کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے ان تقاریب کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے، ملنے جلنے اور باہمی اُخوت و حمیت کے جذبات کے پھلنے پھولنے کی داغ بیل ڈالی۔ سید حرمت الاکرام کے مطابق:

> ''اُن کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کی فضاؤں میں سانس لینے والے تمام انسان امتیاز و افتراق کی سطح سے بلند ہو کر اس طرزِ حیات کو اپنائیں جو نہ صرف انسانی بھائی چارگی کا آئینہ دار و علمبردار ہو بلکہ اس سے ملک و قوم کی خوشی و خوشحالی کی بناء مستحکم تر ہو نیز خوش آئند مستقبل کی جڑیں زیادہ گہری، شاداب اور مضبوط ہوں''۔[۴۱]

چونکہ محمد قلی قطب شاہ کا دور حکومت مشترکہ کلچر، اتحاد و یگانگت امن و امان کا دور تھا اس لیے یہ دکن کا عہد زرین کہلاتا ہے۔ اسی لیے اس عہد کی روایتوں کو پھر سے عوام میں زندہ کرنے کے لیے ڈاکٹر زورؔ نے ۱۱ر جنوری ۱۹۵۸ء کو پہلی بار ''یوم قلی قطب شاہ'' تقاریب کا آغاز بڑی دھوم دھام سے کیا۔ چار مینار سے ایک جلوس نکالا گیا۔ ''سری کشن لال'' میئر بلدیہ نے جلوس کے شرکاء کو مخاطب کیا۔ مزاحیہ شاعر سرور ڈنڈا نے اپنی نظم سنائی۔ ۵ بجے شام گنبد محمد قلی قطب شاہ پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جناب بھیم سین سچر (اُس وقت کے گورنر آندھرا پردیش) نے تقاریب کا افتتاح کیا۔ شعراء نے نظمیں سنائیں، مشاہیر کے پیامات سنائے گئے۔ محمد قلی قطب شاہ کے مزار پر قرأت کلام پاک کے بعد مرثیہ خوانی ہوئی۔ باغ فیض اثر میں میلہ لگایا گیا، آتش بازی کا مظاہرہ ہوا۔ گنبد کے چبوترے پر قوالی کی محفل منعقد کی گئی۔ ادبی اجلاس کے علاوہ نوادر قطب شاہی کی نمائش لگائی گئی جو ایک ہفتے تک جاری رہی۔

۱۹۵۸ء کے بعد سے ہر سال گنبدان قطب شاہی پر ''یوم قلی قطب شاہ'' تقاریب منائی جاتی رہیں۔ راقمۃ الحروف نے بھی ان تقاریب میں بحیثیت کنوینر خدمات انجام دی ہیں۔ چند سال سے یہ تقاریب منعقد نہیں کی جارہی ہیں جس کی ایک وجہ مالیہ کی کمی ہے۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی محنت و لگن سے اردو داں اور عام طبقہ کو فیض یاب کرنے کے لیے ادارۂ ادبیات اردو کے بعد ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد اُن کی یادگار کے طور پر قائم کیا گیا۔ اس کے بانیوں میں ڈاکٹر زورؔ، ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب مہدی نواز جنگ، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر گوپال ریڈی، سری کرشنا کرپلانی جیسی باوقار و نامور ہستیاں شامل تھیں۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۱ر جنوری ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ اس کا افتتاح پروفیسر ہمایوں کبیر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ابتداء میں ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کے ایک حصہ میں ہی کام کرتا رہا۔ بعد میں ۱۹۶۷ء میں باغ عامہ کی بلڈنگ میں منتقل کردیا گیا۔ اس ادارہ کے ذریعہ ادب، تصوف، تاریخ، سیاست، مذہب اور دوسری زبانوں میں تحقیقاتی کام ہوا۔ آج بھی یہ ادارہ اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔

ایوانِ اُردو کی تعمیر

ڈاکٹر زورؔ اردو زبان کے ایک بہت بڑے محسن اور ادیبوں کے سرپرست تھے۔ ایوانِ اردو بھی ڈاکٹر زورؔ کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ ادارے کے بڑھتے ہوئے کاموں اور روز افزوں ذخیرہ کتب ونوادر نے شروع ہی سے محسوس کرادیا تھا کہ اس کے لئے اس کی ایک اپنی عمارت تعمیر ہونی چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے نواب زین یار جنگ بہادر نے آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۴۴ء میں ایک عمدہ رنگین نقشہ تیار کر کے اپنے بصیرت افروز نوٹ کے ساتھ اپیل شائع کی تھی کہ سرکار سے کسی مرکزی مقام پر یک قطع زمین حاصل کی جائے اور اس سلسلہ میں اس عہد کے وزرائے سلطنت سر اکبر اور ان کے بعد سر مرزا اسماعیل نے توجہ بھی کی تھی مگر افسوس ہے کہ ہماری جدوجہد اور ان کی تائید کے باجود ہم کو کوئی مناسب جگہ حاصل نہ ہوسکی۔ پولیس ایکشن کے بعد جب حیدرآباد کی تاریخ نے پلٹا کھایا اور ہمرای جمع کردہ رقم جو صدر محاسب سرکار عالی کے کھاتہ میں محفوظ ہورہی تھی اور بحق حکومت ہند ضبط ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا تو شری لکشمی نارائن گپتا صاحب نے ادارے کی مجلس انتظامی میں زور دیا کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنی کچھ زمین ادارے کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرائے۔ تاکہ حکومت سے رقم کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔ اس وقت جملہ ارکان مجلس انتظامی سے فرداً فرداً خواہش کی گئی اور جب یہ مسئلہ تو تین اجلاسوں میں بھی طئے نہ پاسکا تو گپتا صاحب نے موجودہ عمارت جس جگہ بنائی گئی ہے اس کے حاصل کرنے پر زور دیا اور چونکہ یہ میری اہلیہ کی مِلک تھی اس لئے ان سے اس وقت کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر نے کچھ ایسے پیرائے میں خواہش کی کہ عطیہ حاصل ہونے میں ان کو کامیابی ہوگئی۔ اس کے بعد ہی ایک مجلس عمارت بنادی گئی جس کی معتمد محترمہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ ایم ایل اے منتخب ہوئیں۔ اور مولوی فیاض الدین صاحب سے خواہش کی گئی کہ اپنی نگرانی میں ایک ایسا نقشہ تیار کرادیں جو اردو کے خمیر اور مزاج کے مطابق ہو۔

''ایوان اردو'' کا مقصد ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانا اور ادبی جلسوں وغیرہ کے لیے ایک بڑے ہال کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اسی دوران ''انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش'' کے لیے ''اردو ہال'' کی تعمیر بھی شروع ہوچکی تھی۔ بعض اصحاب نے زورؔ صاحب سے کہا کہ جب اردو ہال بن رہا ہے تو آپ ''ایوانِ اردو'' کیوں بنا رہے ہیں؟ ڈاکٹر زور نے کہا:

> اگر دس ہال میں دس ایوان بن جائیں تو میں کہوں گا کہ گیارہواں ہال اور ایوان بننا چاہئے''۔[۴۲]

تقسیم ہند اور انقلاب حیدرآباد میں تبدیلیاں آ گئی تھیں جس کے باعث کام کرنے کے میدان بدل گئے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر زورؔ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو یکجا کر کے ایوان اردو بنانے کی ٹھان لی جو بقول خود ان کے ''ادارۂ ادبیات اردو اور اس کی عمارت ایوانِ اردو میرے ابتدائی خوابوں کی تعبیر ہے''۔

۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو حکیم الشعراء حضرت امجد کی دعاؤں کے ساتھ اس وقت کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کشن راؤ صاحب نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور ادارہ کے ایک دیرینہ رفیق مرزا اضامن صاحب غازی گتہ دار نے تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ مگر جلد ہی ہماری مجتمع رقم خرچ ہوگئی اور کام روک دینا پڑا۔ ایک کمیٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور انہوں نے از راہ مکرمت حکومت ہند سے ۲۵ ہزار کا عطیہ دلوایا۔ اس کے بعد پھر کام شروع ہوا اور اسی اثنا میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے سالار جنگ اسٹیٹ سے رقم دلائی اور حضور نظام کے چیاریٹی ٹرسٹ فنڈ' ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ سنگارینی کالریز اور نظام شوگر فیاکٹری سے بھی عطیے وصول ہوئے۔ مگر یہ سب رفتہ رفتہ خرچ ہوتے گئے۔ اور پھر کام رک گیا۔ ہم بہت مایوس ہوگئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اس عمارت کی تعمیر میں حکومت کشمیر کی امداد بھی لی گئی۔ میں نے عالی جناب بخشی صاحب کی خدمت میں رجوع کیا۔ اس لئے کہ مولانا آزاد کے ہندوستان کی اردو دنیا کے بڑے لیڈر وہی ہیں۔ اور دو سال قبل سری نگر میں آزاد سمینار میں تقریر کرنے اور مشاعرے کی صدارت کرنے کی دعوت کے سلسلہ میں ان کے قلب و دماغ کی پنہائیاں اور وسیع القلبی سے واقف ہو چکا تھا۔ جناب بخشی صاحب نے دیر سے سہی مگر کچھ اس طرح مدد کی کہ دوبارہ ہمت بندھ گئی اور اب جو کام شروع ہوا تو تکمیل تک پہونچے بغیر نہ رہ سکا۔ ایوان اردو کے افتتاح کے لیے بخشی غلام محمد جو وزیر اعظم کشمیر تھے انھیں مدعو کیا گیا۔ اس وقت انھوں نے زورؔ صاحب کو کشمیر یونی ورسٹی میں آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ زورؔ صاحب کی ملازمت کا آخری سال تھا۔

حکومت کشمیر نے ہمارے کام میں دوبارہ جان ڈال دی۔ چنانچہ اس کے ساتھ آندھرا پردیش کی حکومت نے بھی ہماری دستگیری کی۔ اور پروفیسر ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے حکومت ہند سے بھی مزید امداد دلائی اور نواب عالم یار جنگ بہادر و شنورام چندر ریڈی صاحب' علی حسین خان صاحب محترمہ شاہجہاں بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر مولوی محمد حسین خان صاحب انجینیر نے کم سے کم صرفے میں زیادہ سے زیادہ کام کرا کے ادارے کی بڑی مدد کی۔ آخر میں مولوی دلدار حسین صاحب سابق چیف انجینیر کی صدارت میں عمارت کی باقی ماندہ ضروریات کی تکمیل اور افتتاح کے انتظامات کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے معتمد شری نارائن کرن ریڈی اور ارکان ڈاکٹر

مہندر راج سکسینہ، ایم اے رحمٰن کے ایم خان اور نرسنگ راؤ صاحبان وغیرہ نے اپنے اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دئے اس کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگا۔

ڈاکٹر زور کی خواہش تھی کہ ''ایوان اردو'' بننے کے بعد قوالی کی ایک محفل سجے۔ وہ کشمیر سے حیدرآباد آئے۔ ان کے اہل وعیال کشمیر میں ہی تھے۔ پروگرام کے مطابق حیدرآباد کے عمائد اور مشائخ مدعو تھے۔ ڈاکٹر زورؔ کے انتقال سے دو ہفتے پہلے ''ایوان اردو'' میں عزیز احمد خاں وارثی کی قوالیوں کا پروگرام ہوا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''ایوانِ اردو زور صاحب کے لیے سنگ وخشت کی ایک خوبصورت
> عمارت ہی نہیں تھی بلکہ ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے تخیل کا رنگ محل، ان کی
> مشقتوں اور آرزوؤں کی جادونگری اور ان کے شہرآرزو تھا''۔۴۳

اس عمارت کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں باہر سے آنے والے ریسرچ اسکالروں کے قیام کے لئے مہمان خانہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ جس میں ایسے تمام ارباب وطلبہ علم وفضل قیام کرسکیں گے جو اردو کے علاوہ کسی بھی زبان تلگو ہندی مرہٹی فارسی عربی وسنسکرت کے ادب سے متعلق یا تحقیقی یا تخلیقی کام کے سلسلے میں حیدرآباد آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہندوستان جدید کے شگفتہ رجحانات کی ایک ایسی مانگ ہے جس کی طرف ملک کے ہر علمی وادبی ادارے کو بالآخر توجہ کرنا پڑے گا۔

مختلف ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستگی

ڈاکٹر زور کی زندگی قلندری اور سادگی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ انھوں نے نام ونمود اور شہرت سے دور رہ کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ خود کہتے ہیں:

> اے زورؔ نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے سب دھوکے کی جگہ
> چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

ڈاکٹر زورؔ کے علمی وادبی کارنامے ان کے نام کو ''بقائے دوام'' عطا کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ریاست حیدرآباد میں لکھنے والوں کی ٹیم تیار کرنا ہے۔ اس ٹیم میں شعراء، ادباء، محققین اور عالموں میں شاید ہی کوئی شاعر، ادیب، عالم اور محقق ایسا ہوگا جس کی ہمت افزائی زورؔ صاحب نے نہ کی ہو۔

۱۔ بانی ومعتمد ادارہ ادبیات اردو

۲۔ بانی ومعتمد مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۳۔ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی طرف سے ایک جملہ نکالنے کا خیال زورؔ صاحب ہی کا تھا اور وہی اس کے پہلے مدیر تھے۔

۴۔ ۱۹۳۸ء میں سب رس جاری کیا۔ اس کے بعد ''بچوں کا سب رس'' اور ''سب رس معلومات'' وغیرہ نکالے۔ اُن سب کے ایڈیٹر الگ الگ تھے مگر نگران ڈاکٹر زورؔ ہی تھے۔

۵۔ ڈاکٹر زور "Indian National Academy of Letters" (ساہتیہ اکیڈمی) کے شعبہ اردو کے مشیر چنے گئے۔ اس اکیڈمی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔

۶۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات ڈاکٹر زورؔ کی تحریک پر سالار جنگ نے بنائی۔ اس انجمن کے تحت دکنی اور قدیم مصنفین کے غیر مطبوعہ کارناموں کو منظر عام پر لایا گیا۔ انھوں نے کلیات قطب شاہ، ارشاد نامہ (اردو کے قدیم شاعر بیدل کی مثنوی) اُسی انجمن کے تحت چھاپی۔

۷۔ ہندوستان کی لسانیاتی تجزیہ کی کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ یہ کمیٹی قدیم اردو یعنی دکنی کتابوں کو دیوناگری رسم الخط میں چھاپا۔ اس کام میں انھوں نے ہندی پرچار سبھا کا تعاون حاصل کیا۔

۸۔ اردو میں ''انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کی ایک جامع اسکیم بنائی گئی۔ حیدرآباد کے سیاسی حالات کی تبدیلی نے اس اسکیم کو آگے بڑھنے سے روک دیا ورنہ یہ بھی ایک یادگار ادبی کارنامہ ثابت ہوتا۔

۹۔ جامعہ عثمانیہ میں بزم اردو کے تحت کئی جلسے اور تقاریر منعقد ہوتے تھے۔ اس بزم کے تحت بین کلیاتی تقریری مقابلے اور مشاعرے بھی منعقد ہوتے، اس بزم کے وہ سرگرم رہ نما تھے۔ اس کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

> ''اپنے قابل اساتذہ اور نظمائے بزم ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری اور پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا شکریہ ادا کرنا ہمارا انتہائی خوشگوار فرض ہے۔ اگر یہ اساتذہ ہر موقع اور ہر کام پر ہماری مدد اور رہنمائی نہ کرے تو بزم کا کام مناسب پیمانے پر جاری نہ رہ سکتا''۔[۴۴]

۱۰۔ ۱۹۴۴ء میں کل ہند اردو کانگریس منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر زورؔ نے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے بڑے بڑے نوابوں، جاگیرداروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کا تعاون حاصل کیا۔ ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ جو زور

صاحب کے شاگرد تھے ان سے کہہ کر بشیر باغ پیالس حاصل کیا اور اس میں باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کیا۔ اُن سب کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنے شاگردوں سے کام لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے باوجود پٹرول کے علاوہ ضروریات کی تمام چیزیں حاصل کیں۔

۱۱۔ ۱۸/فروری ۱۹۵۶ء میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے معتمد عمومی بانی اردو ہال پروفیسر حبیب الرحمٰن تھے۔ ڈاکٹر زورؔ اس کے رکن تھے۔ ۶/ مارچ ۱۹۵۶ء کو مجلس انتظامی کے ایک جلسہ میں مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ علمی کمیٹی میں کئی اراکین کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ بھی تھے:

۱۲۔ رسالہ ''ارتقاء'' اور رسالہ ''تحفہ'' کے مدیر اور مضمون نگار تھے۔

۱۳۔ رسالہ ''آج کل'' کے Editorial Board کے ممبر رہے۔

۱۴۔ عثمانیہ گریجویٹ جرنل کی ایڈیٹوریل بورڈ کے صدر رہے۔

۱۵۔ ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی Advisory Board کے ممبر رہے۔ ہند و پاک کی کئی Universities کے ممتحن اور Selection Committee کے ممبر رہے۔

۱۶۔ اکیڈمک کونسل عثمانیہ یونی ورسٹی کے ممبر رہے۔

۱۷۔ عالمی صوتیاتی انجمن کے ممبر رہے۔

۱۸۔ مئی ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر زورؔ جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر کا جائزہ حاصل کیا۔ اس کے بعد Ph.D کی ڈگری کے لیے تحقیق کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے علاوہ فارسی اور سنسکرت (ایم۔اے) کے مضامین پڑھانے کا بندوبست کیا۔

۱۹۔ ۱۹۶۱ء میں کشمیر کلچرل اکاڈمی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر رہے۔

۲۰۔ Oriental Learning Centre Sri Nagar کے ممبر۔

۲۱۔ ۱۹۶۲ء میں کشمیر میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سنڈیکٹ کے ممبر رہے۔

۲۲۔ کئی یونیورسٹیوں کے امتحانات کا ممتحن

۲۳۔ کئی یونیورسٹیوں کی سلیکشن کمیٹی کے رکن

حواشی

۱ (خودنوشت سوانح غیر مطبوعہ از سید غلام محمد شاہ رفاعی القادری، زعمؔ ص ۶)

۲ (مغنی تبسم، ڈاکٹر زور کی حیات شخصیت اور کارنامے ص ۱۹)

۳ (مغنی تبسم، ڈاکٹر زور کی حیات شخصیت اور کارنامے ص ۲۲)

۴ مغنی تبسم، ڈاکٹر زور کی حیات شخصیت اور کارنامے ص ۲۳

۵ عطیہ رحمانی۔ ڈاکٹر زور فن اور شخصیت، غیر مطبوعہ مقالہ۔ بہ تعاون ادارہ ادبیات اردو

۶ ڈاکٹر زور کی نجی ڈائری سے لیا گیا اقتباس

۷ ڈاکٹر زور کی نجی ڈائری سے لیا گیا اقتباس

۸ شاہ گنج سے ایوان اردو تک۔ پروفیسر سید محمد۔ مشمولہ مضمون ماہ نامہ ''سب رس'' حیدرآباد (زور نمبر) ۱۹۶۲ء جلد ۲۶۔ شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

۹ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ سے ادبی ملاقات۔ از قاضی ایاز انصاری۔ مشمولہ مضمون، ماہنامہ سب رس حیدرآباد (زور نمبر) ۱۹۶۲ء

۱۰ مغنی تبسم۔ ڈاکٹر زور کی حیات شخصیت اور کارنامے۔ ص ۲۴

۱۱ ڈاکٹر زور مرحوم، پروفیسر محمود حسین، مشمولہ مضمون سب رس۔ زورؔ نمبر۔ دکن۔ اکتوبر، نومبر و ڈسمبر ۱۹۶۳ء ص ۳۷

۱۲ ڈاکٹر زورؔ مرحوم۔ پروفیسر محمود حسین۔ مشمولہ مضمون ''سب رس'' زور نمبر۔ اکٹوبر، نومبر، ڈسمبر ۱۹۶۳ء ص ۳۹

۱۳ ڈاکٹر زور کی شخصیت۔ وقار خلیل۔ مشمولہ مضمون۔ سب رس نمبر ۱۹۶۳۔ ص ۱۵۱

۱۴ مضمون۔ ڈاکٹر زور کا قیام کشمیر از عبدالاحد رفیق مشمولہ مضمون ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیات، شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل

پبلشنگ ہاؤس دہلی ص ۲۴۰

۱۵ مضمون۔ ڈاکٹر زور کا قیام کشمیر از عبدالاحد رفیق مشمولہ مضمون ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیات، شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل

پبلشنگ ہاؤس دہلی ص ۲۴۶

۱۶؎ ڈاکٹر زور سے ادبی ملاقات ، قاضی ایاز انصاری، مشمولہ مضمون زور نمبر ماہنامہ ''سب رس'' کراچی۔ ڈسمبر ۱۹۷۸ء تا جنوری ۱۹۷۹ء ص ۴۶

۱۷؎ مضمون ''مقدس آغوش و عظیم گہوارۂ تربیت'' از تہذیب تحکّی فاروقی مشمولہ مضمون ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد (تہنیتا لنساء بیگم زورؔ نمبر) نومبر ۱۹۹۸ء جلد ۶ شمارہ ۱۱ ص ۵

۱۸؎ سید رضی الدین قادری۔ بحوالہ۔ ڈاکٹر زور کی حیات شخصیت اور کارنامے ص۔ ۲۹

۱۹؎ ابرار الباقی ڈاکٹر۔ تصانیف زور کی وضاحتی کتابیات۔ ص ۲۴۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی ۲۰۰۹)

۲۰؎ زور صاحب کی یاد میں۔ قاضی غلام محمد۔ مشمولہ مضمون، شیرازہ۔ دوماہی کشمیر۔ مئی ۱۹۶۳ء ص ۲۸

۲۱؎ بابا کی زندگی کے آخری تین دن۔ سید رفیع الدین قادری۔ مشمولہ مضمون سب روس اور نمبر۔ اکٹوبر، نومبر، ڈسمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۵۹ جلد ۲۶، شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

۲۲؎ حفیظ قتیل ڈاکٹر۔ مضمون ڈاکٹر صاحب۔ مولفہ محمد بن عمر۔ سن اشاعت ۱۹۵۵ء ص ۱۴۵

۲۳؎ (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیات شخصیت اور کارنامے۔ مرتبہ ڈاکٹر مغنی تبسم ص۔ ۲۸)

۲۴؎ اکبر الدین صدیقی۔ بحوالہ ڈاکٹر زور حیات شخصیت اور کارنامے۔ مرتبہ ڈاکٹر مغنی تبسم ص۔ ۳۲

۲۵؎ خلیق انجم ڈاکٹر۔ مضمون زور صاحب۔ مشمولہ مضمون شیرازہ سری نگر مئی ۱۹۶۳ء میں ۱۵

۲۶؎ شخصی انٹرویو، محترمہ تسنیم زورؔ ۱۹ر ستمبر ۲۰۰۰ء

۲۷؎ شخصی انٹرویو، توقیر النساء بیگم ۱۹ر ستمبر ۲۰۰۰ء

۲۸؎ خلیق انجم ڈاکٹر۔ مضمون حیات زور۔ مشمولہ مضمون کتاب ''محی الدین قادری زور'' مرتب خلیق انجم، سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء ص ۲۳

۲۹؎ مخمور حسین بدخشی، ڈاکٹر زور استاد کے روپ میں۔ مشمولہ مضمون شیرازہ سری نگر۔ مئی ۱۹۶۳ء ص ۵۶

۳۰؎ شخصی انٹرویو۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ۲۰۰۸ء

۳۱؎ عرش ملسیانی۔ مضمون زور صاحب سے جان پہچان۔ مشمولہ مضمون شیرازہ زور نمبر کشمیر۔ مئی ۱۹۶۳ء ص ۱۰

۳۲؎ حامدی کاشمیری۔ مضمون ڈاکٹر زور سری نگر میں۔ مشمولہ مضمون شیرازہ۔ زور نمبر کشمیر۔ مئی ۱۹۶۳ء ص ۴۳

۳۳؎ صفی الدین قادری زور۔ بہ حوالہ مضمون مشمولہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیات' شخصیت اور کارنامے۔

ص۔۳۸)

۳۴۔ ڈاکٹر مجید بیدار۔خصوصی مطالعہ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ نصابی کتاب عثمانیہ یونیورسٹی۔ ص۱۸۸۔حیدرآباد۱۹۹۹ء

۳۵۔ اردواورایوان اردو،محمد اکبرالدین صدیقی،مشمولہ مضمون رسالہ دوماہی ''شیرازہ'' زورنمبرمئی۱۹۶۳ءصفحہ۹۶

۳۶ (سرگزشت ادارہ ادبیات اردو۔خواجہ حمیدالدین شاہد۔حیدرآباد ۔ ۱۹۷۰ء ص :۱۹۱)

۳۷ مضمون ''اردواورایوان اردواز محمد اکبرالدین صدیقی۔مشمولہ مضمون رسالہ سب رس۔مئی۱۹۶۳ءصفحہ۹۳

۳۸ رشیداحمد صدیقی۔مضمون خدارحمت کند،سب رس کراچی،ڈسمبرجنوری۱۹۷۹ءصفحہ۱۷،جلد۲شمارہ۲،۱

۳۹ پروفیسرمحمدانورالدین۔مضمون۔سب رس کی ادبی اہمیت۔

۴۰ سیدصفی الدین قادری،مضمون میرے والدمحترم،ڈاکٹرسیدمحی الدین قادری زورؔحیات شخص اورکارنامے۔ص ۴۵

۴۱ سیدحرمت الاکرام ۔ ڈاکٹر زورشخص اور ادبی زندگی ۔مشمولہ مضمون سب رس زورنمبر۔کراچی اشاعت ۷۹۔۱۹۷۸ءجلد۲شمارہ۲،اص۳۳

۴۲ محمد اکبرالدین صدیقی۔مضمون ڈاکٹر زورؔصاحب۔سب رس حیدرآباد،اکٹوبر،نومبر،ڈسمبر۱۹۶۳ء،جلد۲۲، شمارہ۱۲،۱۱،۱۰اص۴۷

۴۳ ڈاکٹرسیدہ جعفر۔مضمون ڈاکٹر زورؔمرحوم۔مشمولہ مضمون،سب رس زورنمبر،.....۷۹۔۱۹۷۸ءص۳۹

۴۴ سالانہ بزم اردو۔کلیہ جامعہ عثمانیہ۔۱۳۴۱فصلی۱۳۴۲فصلی مطابق۳۳۔۱۹۳۲ء

☆ دوسرا باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات

ڈاکٹر زور کی لسانیاتی نگارشات کا جائزہ

☆ ہندوستانی صوتیات

☆ ہندوستانی لسانیات

ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات

ڈاکٹر زور کی لسانیاتی نگارشات کا جائزہ

سرزمین دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ملک کے پہلا ماہر لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جنم لیا۔ لسانیات کے باب میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ہندوستان میں لسانیات کے مطالعہ کو عام کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ لسانیات پر ڈاکٹر زور کی دو کتابیں اور کچھ مضامین ہیں۔ دکن میں لسانیات کو موضوع کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر زور کی اولیت کو اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اردو میں سائنسی بنیادوں پر اردو اور دکنی کا لسانیات کی رو سے مطالعہ کیا اور اپنی تصانیف ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''ہندوستانی صوتیات'' پیش کیں۔

ڈاکٹر زور کی بہ حیثیت ماہر لسانیات خدمات کے جائزے سے قبل دیکھا جائے گا کہ لسانیات کی تعریف کیا ہے اور اردو میں لسانیات کے مطالعے کے کیا شعبے اور گوشے ہیں۔ اور لسانیات کا علم اردو زبان کو بہتر طور پر سمجھنے میں کس قدر معاون ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹر زور نے اس ضمن میں کیا کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔

لسانیات کی تعریف

زبان کی صوتیات، صرف ونحو اور دیگر امور کے سائنسی مطالعے کے علم کو لسانیات کہتے ہیں۔ اور زبان، ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہار خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دراصل زبان، آوازوں یا اصوات کا مجموعہ اور ترتیب ہے۔ لسانیات میں انسان کے اعضائے تکلم سے ادا کی جانے والی آوازیں ہی اہم ہیں۔ انسان کے منہ سے ادا ہونے والے کلمات چاہے وہ ایک لفظ یا ایک جملہ ہو، لسانیات کے مطالعہ میں تحریر سے زیادہ اہم ہیں۔

غلام رسول مہر لسانیات کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> ''لسانیات سے مراد وہ علم ہے جس میں تاریخی اور تقابلی مطالعہ کے ذریعہ کسی زبان کے آغاز، ساخت، فطرت، ارتقا، حیات اور موت سے بحث کی جاتی ہے۔''[1]

اس تعریف میں بھی لسانیات سے مراد زبان کا جملہ مطالعہ ہے یعنی لسانیات میں زبان ہی اہم ہے۔

زبان کی خاصیت

☆ انسانی تہذیب کی ارتقاء میں تحریر سے پہلے زبان وجود میں آئی۔

☆ انسان پہلے بولتا ہے بعد میں لکھتا ہے۔

☆ زبان کے ذریعہ آوازوں کا ردوبدل، لہجہ، اونچ نیچ کا اندازہ ہوتا ہے جبکہ تحریر میں نہیں ہوتا۔

زبان خود اختیاری ہے یعنی زبان میں شامل آواز یا آوازوں کے سلسلہ میں جو شکلیں بنتی ہیں ان میں اور ان کے معنی میں کوئی فطری یا منطقی تعلق نہیں ہوتا۔ لسانیات میں صرف انسان کی زبان کی اہمیت ہے نہ کہ جانوروں کی، کیوں کہ انسانی زبان کی دو ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور جانور کی زبان ہی نہیں پائی جاتیں۔

۱۔ زبان کی ساخت میں دوہراپن (Duality of Structure)

۲۔ زبان کی پیداوار (Productive) یعنی انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ لاتعداد جملے بول سکے۔

ڈاکٹر زور لسانیات کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقاء، زندگی اور وفات کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔'' ۲

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ہندوستانی لسانیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کا موضوع زبان کے مسائل ہیں''۔ ۳

ان تمام تعریفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لسانیات کا علم زبان کے جملہ اُمور سے بحث کرتا ہے۔ اس میں چند اصول وضوابط کے تحت زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے لسانیات کو سائنس کے نام دیا گیا۔ کیوں کہ سائنس کا مطلب چند خاص قاعدوں اور اہتمام کو مدنظر رکھتے ہوئے Systematic طریقہ سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سائنس کی ایک اور وضاحت یہ بھی کہ اس میں وضاحت (Explicitness) ہوتی۔ یعنی سائنس کے مطالعہ زبان اور بحث بالکل واضح ہو۔ اسی طرح لسانیات کے باب میں بھی وضاحت ضروری ہوتی ہے۔ سائنسی علوم میں واقعیت پسندی (Objectivity) ضروری ہوتی ہے اسی طرح لسانیات میں بھی واقعیت پسندی سے جانچ ہوتی ہے۔

سائنس میں مشاہدہ (Observation) واقعیت پسندی اور مفروضات (Hypothesis) کو قبول یا رد

کر دیا جاتا ہے اس طرح لسانیات میں بھی انہی طریقہ کار پر عمل ہوتا ہے اس لیے لسانیات کو سائنس کہا جا سکتا ہے۔

لسانیات کی شاخیں

لسانیات میں سب سے اہم مطالعہ زبان اور اس کی آوازوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے خالص زبان کا مطالعہ خالص لسانیات کہلاتا ہے۔ جب کسی خاص زمانے کی زبان کی مختلف سطحوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی درجہ ذیل سطحیں ہوتی ہیں۔

۱۔ صوتیات (Phonetics) اس میں کسی زبان کی کل صوتوں (آوازوں) کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نیز اس میں آوازیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور ان آوازوں کو ہم مطالعے اور تقابلی جائزے کے لیے کس طرح درجہ بندی کر سکتے ہیں اِن اُمور کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ **فونیمیات**: فونیمیات کا مطلب ہے کسی زبان کا تخالفی اور امتیازی آوازوں کی اکائیوں کو معلوم کرنا ہے۔

۳۔ **مارفولوجی**: اس میں کسی زبان میں بامعنی چھوٹی سے چھوٹی اکائیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں لفظ کی سطح تک زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۴۔ **علم نحو**: اس میں ہم کسی زبان کے جملوں کی ساخت اور جملوں میں لفظوں کی ترتیب کے قاعدوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۵۔ **معنیات**: اس میں زبان میں معنی سمجھنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

غلام رسول نے لسانیات کے اہم شعبے اس طرح درج کئے ہیں۔

(۱) کلامیات (Syntase) (۲) تشکیلیات (Morphology)

(۳) صوتیات (Phonetics) (۴) معنیات (Semantics)

بعض نے لفظیات (Wordology) کو بھی لسانیات کی شاخ کہا ہے۔

دیگر شاخیں

تقابلی لسانیات

اس میں تاریخی اعتبار سے رشتہ دار زبانوں کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔اس میں اصلی زبان کا پتہ لگانا ہوتا ہے جس سے مختلف زبانیں الگ الگ ہوگئی ہیں۔

بولیوں کا علم

زبان کی سطح(Horizontal Plane) پر مطالعہ کو بولی، مطالعہ یا بولی جغرافیہ کہتے ہیں۔

لسانیات اسلوبیات

لسانیاتی اسلوبیات میں کسی ادیب کی صرف زبان ہی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

متنی تنقید:

ادب کو صرف زبان کی رُو سے جانچنا اور زبان کا ہی تجزیہ کرنا متنی تنقید کہلاتا ہے۔

نفسیاتی لسانیات

زبان اور سماج کے باہمی رشتوں کے تعلق سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

لسانیات اور ترسیلی انجینئرنگ:

زبان کی فطرت اس کی ساخت اور آواز میں ترسیل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اس محمل کے مطالعہ کو اس میں شامل کیا جاتا ہے۔

لسانیات اور ترجمہ

اس میں ترجمہ کے دوران متعلقہ زبانوں کے آپسی فرق کو مختلف لسانی سطحوں پر جانچنا اور ان کے فرق کو متعین کرنا ہوتا ہے۔

ادب اور لسانیات

ادب کی تخلیق کا ذریعہ زبان ہوتی ہے۔اس لیے ایک ادبی نقاد کے لیے زبان کی نوعیت جاننا اور اس کا مطالعہ کرنا

ضروری ہوتا ہے۔کسی فنکار یا فن پارے کی فنی خصوصیات کا تعین زبان کی حدود سے ہوتا ہے اور آوازوں کی ایک خاص ترتیب سے جمالیاتی تاثر پیدا ہوتا ہے اس نوعیت کے مطالعہ کو اسلوبیاتی مطالعہ بھی کہا جاتا ہے۔

لسانیات کے مطالعہ کا افادی پہلو

کسی بھی ادیب کے لیے لسانیات کا مطالعہ بہت اہم ہوتا ہے۔زبان کی فطرت اور اس کی ساخت کا مطالعہ اس کو دوسرے مضامین سے قریب کرتا ہے۔نفسیات، سماجیات، فلسفہ، بشریات وغیرہ کے مضامین کو سمجھنے میں لسانیات کا مطالعہ معاون ہوتا ہے۔درس و تدریس میں بھی لسانیات کے اصول کارآمد ہوتے ہیں۔زبان کی نصابی کتب کی تیاری میں بھی لسانیاتی مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔اس طرح معیاری زبان، سرکاری زبان، قومی زبان، علاقائی زبان کے متعین کرنے کے لیے لسانی نقطۂ نظر کو سامنے رکھنا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ان کے علاوہ تاریخی تحقیقات میں بھی لسانیات کا مطالعہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔قدیم اقوام کے عادات واطوار، رسم ورواج کو سمجھنے کے لیے واحد ذریعہ قدیم زبان ہے۔

ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں زبانوں کے آپسی تعلقات اور رشتوں کو سمجھنے کے لیے لسانیات کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔زبان کا آغاز وارتقا لسانیات کا موضوع ہے۔جس پر نظر رکھے بغیر ادب کا مطالعہ ممکن نہیں۔اس طرح ادبی مخطوطوں کا زمانہ متعین کرنے میں لسانیات سے کافی مدد لی جاسکتی ہے۔

صوتیات: معنی ومفہوم

صوتیات لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے۔صوتیات میں ہم آوازوں کے مخارج کا مطالعہ کرتے ہیں اور الفاظ کی ادائیگی میں منہ کے اعضائے تکلم کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

زبان کی آوازوں کا مطالعہ تین زاویوں سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ سمعیاتی صوتیات: منہ سے آواز نکلنے پر ہوا میں جو لہریں بنتی ہیں ان کو آواز کی لہر کہا جاتا ہے۔آواز کی لہروں کو کاغذ پر ریکارڈ کیا جاتا ہے۔پھر ان کی خصوصیات کا تعین کیا جاتا ہے۔

۲۔ سماعی صوتیات: کان کے پردے پر آوازوں کے اثرات کو ریکارڈ کرنا اور ان کا تجزیہ کرنا۔

۳۔ تلفظی صوتیات: ان اعضاء اور حرکت پر غور کرنا جن سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

صوتیہ انگریز لفظ "Phoneme" کا ترجمہ ہے۔

صوتیہ کا تعلق انسانی آواز سے ہے۔صوتیہ کے معنی یہی صوت (آواز) کی طرف منسوب اور اس سے متعلق صوتیاتی نقطہ نظر سے ہر زبان کی آوازوں کو دو خاص شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔مُصوّتے (Vowels)

۲۔مُصّمتے (Consonants)

اردو کے مصوتے ہند آریائی ہیں۔

جب ہم کوئی آواز نکالتے ہیں۔تو ہوا ناک اور منہ سے باہر نکلتی ہے۔ ہوا کی اپنے راستے میں اثر پذیری کو علماء لسانیات نے دو قسموں میں بانٹا ہے۔

مصوتے، یعنی اگر ہوا کے راستے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہیں پائی جاتی وہ آواز مصوتے (Vowel) کہلائے گی۔

اگر ہوا کے راستے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ پائی جائے تو وہ آواز مصمتے (Consonant) کہلائے گی۔

ہندوستان میں لسانیات کا آغاز وارتقاء

غلام رسول لسانیات کے باب میں اولیت کا سہرا شمس العلماء محمد حسین آزاد کے سر باندھتے ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں محمد حسین آزاد نے ''سخندان فارس'' لکھی۔ ۱۹۰۷ء میں منشی گلاب سنگھ اینڈ سنسز نے اس کو شائع کیا۔اس کتاب میں شعبہ ''لفظیات'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں الفاظ کی پیدائش ان کے باہمی تعلق، معنوں میں تغیر وتبدل، زبان کا اصل خاندان، فارسی وسنسکرت کے الفاظ اور حروف کی اشکال اور ان کے تلفظ اور لب ولہجہ پر ابتدائی معلومات فراہم کیے گیے ہیں۔سخندان فارس کے بعد پروفیسر محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں اردو زبان کی قدامت مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔تاریخ اور الفاظ کے تقابلی مطالعہ سے اردو زبان کا مولد و مبدا سرزمین پنجاب کو قرار دیا ہے۔نیز اس کتاب کے مقدمہ میں اردو زبان کی وجہ تسمیہ، ریختہ اور اس کی قسمیں، دہلوی، گوجری، دکنی، ہندوستانی اور ہندی و ہندوی کی وضاحت کی گئی ہے۔اس کے علاوہ اردو کا آغاز، پنجاب، پنجابی اور اردو، قدیم اردو پر پنجاب کے اثرات اور پنجاب میں اردو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔محمود شیرانی کے بعد مولانا آزاد کے شاگرد احمد دین نے ۱۹۳۲ء میں سرگذشت الفاظ تصنیف کی۔یہ کتاب دراصل پادری ٹرینچ کی کتاب ''مطالعہ الفاظ'' کی اساس

پر انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کے بجائے اردو، ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کو منتخب کر کے لسانیات کے شعبہ شکیلیات اور لفظیات میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں الفاظ کا مطالعہ مختلف نوعیت، نازک خیالی، اخلاقیات، تاریخ، نئے الفاظ، مترادفات، تعلیمیات کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔

ان کے بعد پروفیسر سدھیشور استاد لسانیات نے ''آریائی زبانیں'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں ہندوی زبان، ہندوی اور مسلمان، اردو کا آغاز، ہندی وار دونثر کا آغاز، آریائی زبانیں، آریائی زبانوں کا ماخذ وارتقاء، قدیم آریائی زبان کی تشکیل، ہند آریائی اور ایرانی کی باہمی مشابہت، قدیم ہند آریائی اور قدیم ایرانی میں اختلافات، دوسری سرخی ہند آریائی زبانیں، ہند آریائی کی خصوصیات، ایرانی زبان کا ارتقا، قدیم فارسی اور پراکرت کی باہمی مشابہت، وسطی فارسی یا پہلوی وسطی فارسی کی بولیاں، عہد حاضر کی ایرانی زبانوں کی گروہ بندی اور آریائی زبان کا ارتقاء شامل ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت مفید کتاب ہے۔

ان کے بعد پروفیسر سید احتشام حسین نے ۱۹۵۷ء میں ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو دراصل ماہر ہندوستانی لسانیات جان بیمز کی انگریزی کتاب About Line of Indian Philology کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ جس میں زبانوں کی گروہ بندی، ہندوستانی زبانوں کی تقسیم، ارتقائے لسان کے مدارج، زبانوں کی خاندانی خصوصیتیں، بولیاں، نئی بولیوں کے تعلق سے معلومات ہیں۔ ضمیمے میں ہندوستان کی لسانی تقسیم کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں سے متعلق معلومات آفرین ہے۔

لسانیات کے باب میں اہم اضافہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ہندوستانی لسانیات لکھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

لسانیات کے مشہور عالم و ماہر پروفیسر مسعود حسین کا نام شعبۂ لسانیات کو عام کرنے اور اس کو ترویج دینے میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مسعود حسین نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے تاریخ زبان اردو کا انتخاب کیا، جس کو مقدمہ تاریخ زبان اردو کے نام سے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا گیا۔

ان کے بعد پروفیسر عبدالقادر سروری نے ''زبان اور علم زبان'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو لسانیاتی نقطۂ نظر سے خالص علمی کتاب ہے۔ اس کتاب میں زبان اور اس کی ماہیئت، زبان کا آغاز، علم زبان، زبان کا ارتقا، علم زبان کی شاخیں، صوتیات، صوتی تبدیلی، صوت تجزیہ، تشکیلیات نحو، معنیات، تاریخی طریقہ، مماثلت اور دوسرے عوامل،

زبانوں کی تقسیم، دنیا کی زبانیں، علم زبان کی تاریخ اور تحریر کا آغاز وارتقاء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی ''اردو زبان کا ارتقاء'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں زبانوں کے خاندان اور ان کے نظریے، ہندوستان کی قدیم وجدید زبانیں، مختلف زبانوں کا آپسی رشتہ، زبان کا مآخذ اور تحقیقی حصے میں صوتی تبدیلیاں، اخذ و اشتقاق، اسمائے مانعہ، اسمائے مطلقہ اور افعال ومشتقات کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے اردو کے ماخذ کو پالی قرار دیا ہے۔

لسانیات اور صوتیات کو جس شخص نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور شعوری طور پر جس نے اس میدان میں قدم رکھا وہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی شخصیت ہے۔ سرزمین دکن کو اس حیثیت سے بھی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ایم اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لندن یونیورسٹی ''اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز'' میں پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے داخلہ لے کر ''ہند آریائی کی تقابلی تنقید'' کے موضوع پر تحقیق کرنا چاہا لیکن انھیں اس موضوع پر تحقیق کا موقع نہیں ملا بلکہ ''اردو کے عہد قدیم کے ادب'' پر اپنا تحقیقی کام شروع کر دیا۔ لندن یونیورسٹی میں انھیں گراہم بیلی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ گراہم بیلی اردو زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ تقابلی مطالعہ میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ وہی ڈاکٹر زور میں لسانیات کا شوق پیدا کرنے کا سبب بنے۔

ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات۔ ہندوستانی صوتیات کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر زور نے لسانیاتی تعلیم پروفیسر آر ایل ٹرنر سے حاصل کی اور صوتیات کی تعلیم پروفیسر اے لائیڈ جیمس سے حاصل کی، عام صوتیات اور انگریزی صوتیات پروفیسر ڈانیل جونس، مس لی لیاس اور ای آرم اسٹرانگ جیسے پروفیسروں سے سیکھی۔ ان اساتذہ کے دروس سے ڈاکٹر زور کے اندر لسانیات کا درک حاصل ہوا۔ ڈاکٹر زور نے ''اردو کے آغاز و ارتقا'' پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اس کے بعد وہ پیرس گیے۔ وہاں کے قومی مدرسہ السنۂ شرقیہ (National School of Oriental Studies) میں ڈاکٹر جیولس بلوک کے دروس سے استفادہ کیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر زور نے اردو کی گجراتی، فارم آف ہندوستانی پر ڈی لٹ کے لیے مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن افسوس کہ وہ نامکمل رہ گیا۔ لیکن ڈاکٹر زور نے مشہور ماہر لسانیات پروفیسر واندرئیس اور پروفیسر بن وے نست (رکن ادارہ تحقیقات عالیہ پیرس یونیورسٹی) جو فارسی، عربی اور سنسکرت زبان کے ماہر تھے۔ پروفیسر مسی یون پروفیسر عربی (قومی مدرسہ السنۂ شرقیہ) پروفیسر سلون لیوی (پروفیسر سنسکرت کالج دے فرانس) کے لکچرز اور مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے عربی اور

سنسکرت زبان کے لسانی عناصر کے تعلق سے معلومات حاصل کیں۔ انہی ماہر اساتذہ کی رہنمائی میں انھوں نے ''ہندوستانی صوتیات''(Hindustani Phonetics) کا خاکہ تیار کیا۔ اردو کے صوتی تجزیے وتشریح کے لیے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے صدر شعبۂ صوتیات پروفیسر Loyed James سے تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر زور نے پیرس میں سوربون یونیورسٹی کے ادارۂ ادبیات میں مدموزیل ویران سے تجزیاتی صوتیات کے لیے آلات اور مشینوں پر اردو زبان کو قلم بند کرنے میں رہبری حاصل کی۔ آخرکار اکتوبر ۱۹۳۰ء میں Impremerie Union Type-Graphique پیرس سے ہندوستانی صوتیات(Hindustani Phonetics) کتاب شائع کی۔

ڈاکٹر زور لسانیات کے باب میں بقول گیان چند جین ابوالآباء ہیں۔ نہ صرف ہندی بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی ڈاکٹر زور کو لسانیات میں تحقیق کرنے میں اولیت حاصل ہے۔ اور دیگر زبانوں کے لیے ان کی تحقیقی کتاب کو نقوش اول کی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین ایک مضمون میں لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر زور لسانیات کی دنیا میں بڑی گھن گرج سے آئے وہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں''۔ ان کے علاوہ کئی ماہرین لسانیات نے ان کے کام کی تعریف کی ہے۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پنڈت دتاتریہ کیفی، رمیش چندر مہروترا، پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے علاوہ خود ڈاکٹر زور کے استاد پروفیسر جیولس بلوک نے ہندوستانی صوتیات میں ڈاکٹر زور کی اس میدان میں اولیت کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی تحسین کی ہے۔ ہندوستانی صوتیات کے تعارف میں ڈاکٹر جیولس بلوک لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی زبانوں میں ہندوستانی، جو دنیا تمام میں مطالعے کا خصوصی محور رہی ہے اس کا ایسا توضیحی مطالعہ خصوصاً تلفظی اعتبار سے اب تک نہیں کیا گیا۔ اکثر وبیش تر تلفظ کی جانب بڑے عالمانہ اشارے ملتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اس موضوع پر کام نہیں کیا گیا اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی Philogogists اور علماء لسانیات کو عملی مقاصد کے لیے یکساں ضرورت ہے۔ یہ بات قابل تحسین ہے کہ اس خصوص میں ایک ہندوستانی مسلم اسکالر (ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری) نے سب سے پہلے قدم اٹھایا۔[۴]

اس طرح ڈاکٹر زور کو صوتیات کے میدان میں اولیت کا سہرا حاصل ہے۔

کسی زبان کی ادائیگی کے دوران لفظوں کے استعمال سے پیدا ہونے والی آوازوں اوران آوازوں کے مختلف ڈھنگ کا مطالعہ صوتیات کہلاتا ہے۔ یا آوازوں کے منظّم طریقہ یا سائنٹفک ڈھنگ سے معلوم کرنے کے طریقہ کو صوتیات کہا جاسکتا ہے۔صوتیات میں زبان کے تلفظ، مخارج، ادائیگی اور بیان کے اعتبار سے کسی زبان کی آوازوں کو سمجھنے اوران میں موجود تفریق کومحسوس کرنے اور تجزیہ کرنے کواہمیت حاصل ہے۔اس طرح کی تفریق یا تجزیہ کرنے والا ماہرلسانیات اور ماہرصوتیات کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر زورعلم صوتیات سے دلچسپی اوراس علم کوحاصل کرنے کے تعلق سے ہندوستانی لسانیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> اردو کے صوتی تجزیہ اور تشریح میں اس متذکرہ درسگاہ کے صدر شعبہ صوتیات ''پروفیسر لائڈ جیمس نے بڑی اعانت کی اور عام صوتیات پر اپنے لکچروں میں شریک رکھنے کے علاوہ اس علم کے اصول وضوابط اور انگریزی صوتیات کی تعلیم کے لیے یونی ورسٹی کالج لندن کے شعبۂ صوتیات میں شریک ہونے میں مدد دی..... پیرس میں ''سوبورن'' یونی ورسٹی کے ''ادارۂ صوتیات'' میں مدموزیل دیران نے تجرباتی صوتیات سے واقف ہونے اور آلوں اور گردونوں پر اردو زبان کوقلم بند کرنے میں بڑی رہبری کی۔اس کام کے چند نمونوں کے عکس ''ہندوستانی صوتیات'' میں شامل کیے گئے''۔۵

ڈاکٹر زورکولسانیات اورصوتیات دونوں میں پختہ درک حاصل ہوا۔''ہندوستانی صوتیات'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔خصوصاًاس کتاب میں دکنی صوتیات پرسیر حاصل بحث کی گئی ہے۔دکنی صوتیات میں اس کتاب کومعتبر درجہ حاصل ہے۔یہ کتاب چارابواب پرمشتمل ہے۔

پہلے باب میں ہندوستانی زبان کے تاریخی ارتقااور مابعدتغیرات کے تعلق سے بیش بہامعلومات ہیں۔ ہندوستانی کے دورخاص طور پرشمالی اورجنوبی دکنی کے اہم لسانی انحرافات اوراختلافات پرگفتگوکی گئی ہے۔خصوصاً حیدرآباد کے تعلیم یافتہ افرادکی روزمرہ زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔صوتیاتی نقطہ نظر سے شمالی اورجنوبی ہند کی اردو کے مصوتوں Vowels جڑواں مصوتوں (Diphthongs) مصمتوں (Consonants) ہکارمصمتوں (Aspirated Consonanats) ہکارمصمتی معکوسی ارتعاش مصمتوں یعنی (Voiced Retroflex Vibrant Consonants) غیرہکاری مصمتوں Inaspirated Consonants ذخیرہ الفاظ،قواعد زبان اورمرکب

الفاظ سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔خصوصاً دکنی صوتیات کے تعلق سے مفید معلومات ہیں۔

دوسرے باب میں حیدرآباد کی مروجہ دکنی زبان کے نظام اصوات پر بحث کی گئی ہے۔اس باب کو صوتیاتی بنیادوں پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں مصوتوں اور جڑواں مصوتوں (Vowels and Diphthongs) کے تعلق سے معلومات پیش کی گئی ہیں۔ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ اردو زبان میں کم از کم نو (9) بنیادی مصوتے اور چھ (6) جڑواں مصوتے ہیں۔ بقول گیان چند جین جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔مصوتوں میں انھوں نے تھ، لھ، رھ، ڈھ، ڑھ اور زھ کو شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے مصوتوں اور مرکب مصوتوں کا ایک تفصیلی نقشہ بھی دیا ہے۔جن میں اردو اعرابوں کی علامتوں کے ساتھ IPA (انٹرنیشنل فونٹک اسوسی ایشن) کی علامتیں رومن علامتیں، الفاظ اور معانی درج ہیں۔مصوتوں اور مرکب مصوتوں کی آوازوں کی تشریح مثالوں اور اشکال سے کی گئی ہے۔ڈاکٹر زور نے اس چارٹ کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ رومن حروف و علامتیں، مشرقی زبانوں اردو سمیت کے تلفظ کو پوری طرح ادا نہیں کر پائے کیوں کہ رومن علامتوں میں ایک سے زائد اصوات کے لیے ایک ہی حرف کا استعمال ہوتا ہے جبکہ IPA کے چارٹ میں ہر آواز کے لیے الگ الگ حرف موجود ہیں۔ ماہر لسانیات ڈینیل جونز زبان کی اٹھان کے چار درجے فرض کر کے مصوتوں کی ادائیگی کے وقت زبان کی حرکت کے درجات مقرر کیے ہیں۔ڈاکٹر زور نے اس چارٹ سے مدد لے کر ہندوستانی اردو کے حیدرآبادی لب ولہجہ میں مصوتوں کی ادائی کے وقت زبان کی پوزیشن کا اظہار کیا ہے۔پھر ان کی مزید وضاحت کے لیے (Palatograms) (تالوی نقشے) یعنی (آواز ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس حصہ کو چھوتی ہے) اور صوتی نگارش کے ریکارڈس پیرس میں تیار کر کے شامل کیے ہیں۔ اس باب میں حروف انفیت (Nasalization) کے صوتی عمل کو مثالوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں ڈاکٹر زور نے مصمتوں اور ادغام (Assimilation) کا تجزیہ پیش کیا ہے۔یہ واضح کیا گیا ہے کہ مصوتے کی ادائیگی بے روک ٹوک ہوتی ہے جبکہ مصمتے میں کہیں نہ کہیں رکاوٹ ہوتی ہے۔مصوتے تنہا ادا ہوتے ہیں اور مصمتے، مصوتے کے ساتھ ہی ادا ہوتے ہیں۔ڈاکٹر زور نے مصمتوں کی تلفظ کی وضاحت کے لیے کاٹمو گراف، پٹیو گراف اور مشینی نگارشات (Inscriptions) دیئے ہیں۔انھوں نے ہندوستانی خصوصی دکنی نظام صوتیات کا تجزیہ پہلی مرتبہ لسانیاتی لیبارٹری میں کیا۔ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اردو کی ایک ایک آواز کو لے کر اس کا تجزیہ پیش کرنا ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر تا حال اردو اور ہندی کسی کسی کتاب میں نہیں ملتی گو لوک

بہاری دھل کی ہندی کتاب ''دھونی وگیان میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے پسندی آوازوں کا نہیں، اس میں پلیٹیوگرام دیئے ہیں لیکن کاٹمو گراف کے چارٹ نہیں دیئے''۔[۶]

ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ انضمام اور ادغام کے اختلافات کے تعلق سے ڈاکٹر زور کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

Assimilation کے سلسلے میں بولی جانے والی زبان اور اردو کے املا (رسم خط) میں قابل لحاظ اختلافات کی نشان دہی کی ہے اور اس کا سبب ڈاکٹر زورؔ نے انضمام اور ادغام قرار دیا ہے جو عموماً رجعی (Regressive) ہوتا ہے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو صوتی تاروں کے عمل کو متاثر کرتی ہے۔ دوسری نرم تالو اور تیسری زبان کے عمل کو متاثر کرتی ہے۔ انضمام اور ادغام کی وضاحت کے لیے مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل دی ہے جو متعاقب اصوات کے اثر سے بدل جاتی ہیں۔ مثلاً ''چپ بیٹھو'' میں ''پ'' کی آواز ''ب'' کے ساتھ مدغم ہوکر ''چپ بیٹھو'' ہوجاتی ہے۔ (اسی طرح بدتر = بتر، بادشاہ = باشا، پادشاہ = پاشا ہوگیا ہے) بندی مصیتی مصمتے ہکار اور غیر ہکار دونوں بعض وقت غیر ہکار غیر مصیتی ہوجاتے ہیں جیسے تفسیر تبسیر، اب تک، اپ تک میں بدل جاتا ہے۔[۷]

مصمتوں کے تجزیہ میں ڈاکٹر زور نے بڑی باریک بینی اور عمیق نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین تیسرے باب میں درج کیے گیے چند مثالوں کا درج اس طرح کیا ہے۔

۱۔ لفظ کے آخری ب کے بعد ہم عموماً ایک نہایت خفیف مصوتہ بھی بولتے ہیں۔ جیسے تب اور ڈھب میں ایک خفیف مصوتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ لفظ کا ابتدائی درمیانی آخری ت کی نسبت زیادہ وضاحت سے ادا ہوتا ہے۔

۳۔ درمیانی تھ اور دھ میں ابتدائی تھ اور دھ کی نسبت تنفیس یعنی ہکاریت کم ہوتی ہے۔

۴۔ درمیانی ٹ ابتدائی ٹ سے زیادہ شدت سے ادا ہوتا ہے۔

۵۔ لفظ کے درمیان ٹھ کے بعد کوئی غیر ہیئتی اسپوٹ آواز آئے تو ٹھ ٹ کی آواز دیتا ہے مثلاً بیٹھتا ہے اور کٹھ پتلی میں آواز خفیف ہوتی ہے۔

۶۔ لفظ کا آخری چ نہایت خفیف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مجید بیدار نے بھی ڈاکٹر زور کی دی گئی مثالوں کی بہت خوبی سے وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر زور کے صوتیاتی تجربہ کو سمجھنے کے لیے ان مثالوں کو وضاحت کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ لفظ کے آخر میں ''ب'' استعمال ہو تو اردو اور ہندی میں ایک نہایت ہی خفیف مصوتہ بھی آواز کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔ ثبوت کے لیے تب اور ڈھب ان دونوں الفاظ میں اور اس کے علاوہ سہ رکنی لفظ جیسے جناب، خضاب وغیرہ میں اختتامی ''ب'' پر خفیف ''و'' کا مصوتہ صوتی طور پر کام کرتا ہے جیسے کتاب پڑھا جاتا ہے لیکن اس کی آواز کتابو ظاہر ہوتی ہے۔ اس صوتی پس منظر میں ڈاکٹر زورؔ نے ہندوستانی صوتیات میں یہ ظاہر کیا ہے کہ اردو۔ ہندی میں ''ب'' پر ختم ہونے والے بیشتر الفاظ کے ساتھ خفیف مصوتہ کا صوتی استعمال عام ہے لیکن اس کا لکھا جانا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر زور نے املا اور صوت کے اس باریک سے سے فرق کو نمایاں کیا ہے اور مثالیں بھی دی ہیں۔

۲۔ ڈاکٹر زور نے صوتی بنیادوں پر اردو، ہندی لفظیات کے ایک فرق کی جانب نشان دہی کرتے ہوئے یہ بات بھی بتائی کہ کسی لفظ کی ابتدا اور درمیان میں ''ت'' کا استعمال ہو تو یہ مصمتہ کا کام کرتا ہے لیکن ''ت'' لفظ کے آخر میں استعمال ہو تو یہ بھی خفیف مصوتہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے کتابت، سات وغیرہ۔

۳۔ لفظ کے آغاز یا درمیان میں ''تھ'' اور ''دھ'' استعمال ہو تو ان الفاظ میں ہکاریت کم ہو جاتی ہے جیسے تھال میں ہکاریت کم ہے اس کے بجائے ہاتھ لکھا جائے تو آخر میں ہکاریت شدید محسوس ہوگی۔ صوتی اعتبار سے آوازوں کی کمی زیادتی کو بھی ڈاکٹر زور نے اپنے لسانی نظریات میں پیش کیا جسے ان سے قبل اور بعد میں کسی نے نہیں پیش کیا اور یہی عمل ڈاکٹر زور کی انفرادیت کا درجہ رکھتا ہے۔

۴۔ ڈاکٹر زور نے ایک ماہر صوتیات کی حیثیت سے یہ بات ظاہر کی کہ اردو، ہندی الفاظ میں آوازوں کی یہ عجیب کیفیت پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی لفظ ''ٹ'' سے شروع ہو تو ابتداء میں ''ٹ'' ہلکا ادا ہوگا۔ جبکہ یہی ''ٹ'' درمیان میں آجائے تو اس میں زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً ٹال میں ابتدائی ''ٹ'' انتہائی ہلکا ہے۔ اگر اس کے بجائے لٹ لکھا جائے تو آخر میں ''ٹ'' شدت سے ادا ہو رہا ہے اور یہی حال لفظ کٹار کا ہے کیوں کہ درمیانی

''ٹ'' شدت سے ادا ہورہا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لفظیات کے محل استعمال کی وجہ سے اصوات میں پیدا ہونے والے فرق کو نمایاں کیا۔

۵۔ ڈاکٹر زور نے ہندوستانی الفاظ اور ان کی اصوات پر غور کرتے ہوئے یہ بات ثابت کی کہ لفظ کے درمیان ''ٹھ'' کے بعد کوئی غیر ہیئتی اسور پٹ آواز آئے تو ''ٹھ'' بنیادی طور پر ''ٹ'' کی آواز فراہم کرتا ہے۔ جیسے بیٹھنا اور کٹھ پتلی الفاظ میں ہکاریت ہلکی اور خفیف ہوکر صوتی اعتبار سے بیٹنا اور کٹ پتلی بڑھا جارہا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ہندوستانی صوتیات کی اس باریک سی نزاکت کو نہ صرف مشاہدہ کر کے محسوس کیا بلکہ اسے پلیٹوگرام کے ذریعہ واضح بھی کیا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے پلیٹوگرام (PALATOGRAM) تالو کے اس نقشے کو کہتے ہیں جس سے یہ واضح ہوسکے کہ کسی خاص آواز کو ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس حصے کو چھوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر زور نے بعض آوازوں کے نازک اختلافات کو کائیموگرام (KYMOGRAM) سے بنی ہوئی لکیر کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ جس سے صوتیات کے فن اور اس فن کے ہندوستانی زبانوں پر اطلاق کے لیے ڈاکٹر زور کی کاوشوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے یہ تمام کاوشیں ایک ایسے دور میں کیں جب کہ اس فن کا کوئی ماہر نہیں تھا اور ڈاکٹر زور 1930ء میں ان مشاہدات اور تجربات کو محسوس کر کے ضبط تحریر میں لا رہے تھے۔

۶۔ ڈاکٹر زور نے اپنی صوتی تجربہ کار نگاہ سے یہ ثابت کیا کہ اگر کوئی لفظ کے آخر میں ''چ'' ہو تو وہ ''چ'' نہایت نحیف ہوجاتا ہے۔ جیسے کانچ، سانچ وغیرہ میں ''چ'' انتہائی نحیف ہے جبکہ تار، راج، کام وغیرہ الفاظ میں آخری الفاظ شدت سے ادا ہورہے ہیں جب کہ ان کے مقابل 'ج' انتہائی نحیف ادائیگی کا پتہ دے رہا ہے جس سے ڈاکٹر زور کے نظریہ کو تقویت پہنچتی ہے''۔۸

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے پہلی بار سائنٹفک انداز سے صوتی نظام کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھے باب میں اصوات کے اوصاف بل (Stress) اور ہر (Intonation) سے بحث ہے۔

سر اور لہر کو سمجھنے کے لیے پروفیسر اقتدار حسین خان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آواز کی لہر کسی ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ نکتہ منہ کے قریب ہوگا یعنی بولنے سے منہ کے قریب کی ہوا سب سے زیادہ حرکت میں آئے گی اور اس کے بعد یہ لہر آہستہ آہستہ کم ہوجائے گی..... ایسی آواز جس کا وقفہ ہر چکر میں ایک ہی رہے۔ اس کو وقفہ دار آوازیں کہتے ہیں۔ اس کے

برخلاف اگر کسی آواز میں ہر چکر کے وقفے مختلف ہوں۔ اس کو غیر وقفے دار آوازیں کہیں گے۔ وقفے دار آوازیں سر بناتی ہیں۔ تواتر جتنا زیادہ ہوگا۔ سر اتنا ہی اونچا ہوگا''۔[9]

ڈاکٹر زور نے سب سے پہلے اس طرح صحیح سمت میں پیش رفت کی تھی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے 1954ء میں اپنے انگریزی مقالے (A Phonetic and Phonological Study of Word in Urdu) صفحہ نمبر 21 تا 26 سر ہراور بل سے بحث کرتے وقت ڈاکٹر زور کے اصولوں کی تصدیق کی ہے۔ گرچہ کہ ڈاکٹر گیان چند جین اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے ان کے نظریات سے اختلاف کیا ہے۔ جیسے اس، جس اور آرجا، کی ادائیگی میں دونوں ارکان پر Stress کرنا ناممکن ہے۔ اختلاف کو اگر صحیح مان لیا جائے تو بھی ڈاکٹر زور نے جس دور میں یہ اصول مرتب کیے تھے وہ یقیناً قابل تحسین ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے پہلی بار اردو مصوتوں اور جڑواں مصوتوں کا مفصل چارٹ دیا ہے جس میں I.P.A اور رومن علامتوں کے مقابل اردو علامتیں پہلی بار پیش کی گئیں۔ ماہرین لسانیات ڈاکٹر زور کے اس کارنامے پر سبھی نے خوب داد دی۔ صوتیات کے موضوع پر لکھی گئی اس کتاب پر مختلف ماہرین صوتیات اور لسانیات نے تبصرے کئے ہیں اور ڈاکٹر زور کے اس کارنامے کی ستائش کی ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع ڈاکٹر زور کے اس کارنامے کو سراہنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ڈاکٹر زور کی اس کتاب اور ہندوستانی لسانیات پر اب تک چند ایک مضامین اور تبصرے ہی لکھے گئے تقریباً سب ہی مضمون نگاروں نے جن میں پروفیسر گیان چند جین کا نام سرفہرست آتا ہے ڈاکٹر زور کے ان کارناموں کو خوب سراہا اور تعریف کی ہے۔ کئی ماہرین السنہ ولسانیات نے ان کتابوں سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان میں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، پروفیسر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پنڈت دتاتریہ کیفی، رمیش چندر مہروترا، پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے نام لینا کافی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر ڈاکٹر زور کے استاد پرفیسر جیولس بلوک نے ہندوستانی صوتیات پر تعارف لکھتے ہوئے نہایت شفقت سے ڈاکٹر زور کی اس میدان میں اولیت کا تذکرہ کیا ہے وہ ان کی لیاقت ریاضت علمی شغف اور نکتہ رسی پر مہر

تحسین ہے۔''[۱۰]

اس طرح ڈاکٹر زور کا یہ کارنامہ نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے۔صوتیات پر تحقیق کرنے والے ہر محقق کے لیے ان کی کتاب سے رجوع ہونا ناگزیر ہے۔ڈاکٹر زور نے اس میدان میں خدمت انجام دے کر اپنے آپ کو اولین خدمت گذار بنادیا۔

ہندوستانی لسانیات کا تنقیدی جائزہ

لسانیات کے موضوع کی نمائندگی کرنے والی ڈاکٹر زور کی اہم کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' ہے۔اسے اردو میں لسانیات کے موضوع کی پہلی کتاب ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھی ہے۔اس کتاب میں لسانیات کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کے لیے ڈاکٹر زور نے تین سال تک لندن میں قیام کیا اور ماہر لسانیات کے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔اور بالآخر اسے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔یہ کتاب مطبوعہ شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۲ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی و سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے لکھا ہے۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی دیباچہ میں لسانیات میں ڈاکٹر زور کی اولیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''اردو میں اب تک کوئی کتاب اس مضمون پر نہیں۔مسرت کا مقام ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے اس جانب پہلا قدم اٹھایا ہے اور ''ہندوستانی لسانیات'' کے نام سے یہ مختصر مگر جامع اور نہایت مفید کتاب لکھی ہے جس میں اہم لسانیاتی مسائل اور خاص طور پر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات سے سلیس زبان اور دِل نشین پیرائے میں بحث کی ہے۔اس وقت ایسی ہی مختصر اور جامع کتاب کی ضرورت بھی تھی، جو آنے والی مفصل اور ضخیم کتابوں کے مقدمے کا کام دے اور جس سے پڑھنے والوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد فائدہ اُٹھا سکے۔[۱۱]

اس طرح ڈاکٹر زور کو لسانیات کے موضوع پر قلم اٹھانے میں ہندوستان بھر میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

ڈاکٹر زور نے کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ حصہ اول کا جدول اس طرح ہے:

(نقشہ) ہندوستان کی زبانیں

۱۔ لسانیات: مقاصد، فوائد اور تاریخ۔

۲۔ زبان: ماہیت، آغاز اور تشکیل

۳۔ فطری ارتقا: صوتی تغیرہ تبدل اور غامی اثرات

۴۔ ارادی تشکیل: عوام کا حصہ، عالموں کا اثر، وضع اصطلاحات

۵۔ دنیا کی زبانیں: طریقۂ تقسیم، مختلف خاندان، ہند یورپی، ہند ایرانی

۶۔ ہند آریائی ارتقاء: ہند آریائی ادوار، آریاؤں کا دور، گریرسن کا نظریہ

۷۔ جدید ہند آریائی زبانیں: شمالی مغربی، جنوب مغربی، وسطی، مشرقی، جنوبی

۸۔ ہند کی غیر آریائی زبانیں: دردستھانی، اوسطی، ہند چینی، کول، ڈراویڈی

حصہ دوم کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ ہندوستانی کا آغاز: مواد، مختلف نظریے، جدید تحقیقات

۲۔ ہندوستانی کا ارتقاء: سہ مرکزی تفریق۔ اختلاف کے اسباب

۳۔ ادبی بولیاں۔ گجراتی، دکنی، شمالی

۴۔ ہندوستان کی ہمہ گیری۔ فتح دکن، تحریک مظہر، لکھنو کی خدمات

۵۔ عہد حاضر: اُردو ہندی کا جھگڑا، اسباب، تاریخ اُردو کی ضرورتیں۔

ڈاکٹر زور نے تمہید خود لکھی ہے جس میں لسانیات کی ضرورت و اہمیت اور مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ انھوں نے مضامین کی فطرت اور نوعیت کے لحاظ سے کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ دوسرا حصہ جدید ترین تحقیقات کی پیداوار ہے۔

تمہید میں ڈاکٹر زور لسانیات میں عدم توجہی کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''ہماری زبان کے لسانی پہلوؤں پر آج تک بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں، جو کچھ کی گئیں وہ دوسری زبانوں میں قلمبند ہوئی ہیں۔ خود اردو زبان میں (سوائے پروفیسر حافظ محمود شیرانی) کی ''پنجاب میں اردو'' کوئی حکمیاتی اور قابل توجہ کام نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر زور لسانیات کے مطالعہ کی اہمیت وافادیت سے پوری طرح واقف تھے۔ کیوں کہ انھیں اندازہ تھا کہ اردو

میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اگر کہیں لسانی خصوصیتوں کا احاطہ کیا گیا ہے تو وہ جدید طرز تحقیقات پر پوری نہیں اترتیں۔ ڈاکٹر زور نے تمہید میں مختلف غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے ''ہندوستانی لسانیات'' ترتیب دینے کی وجہ بھی بتائی ہے۔

ارباب اردو کی یہ غلط فہمی رہی کہ زبان کے متعلق تحقیقات کرنا اور اس کے قواعد وضوابط مقرر کرنا ان کا کام نہیں۔ اور ایک عام غلطی یہ تھی کہ ہندی اور برج بھاشا کو ایک ہی سمجھ لیا گیا تھا۔ حالانکہ دونوں الگ زبانیں ہیں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لسانیات کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب ڈاکٹر زور کے چار سالہ قیام یورپ کی کوششوں اور بحث ومباحثہ کا نتیجہ تھی۔

کتاب کے پہلے حصہ میں ڈاکٹر زور نے علم لسانیات، مقاصد، فوائد اور تاریخ سے بحث کی ہے۔

لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے زبان کی ماہیئت، تشکیل، ارتقاء، زندگی اور وفات کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی زبان کی ابتداء اور انتہا سے لے کر اس کی مکمل صورت گری کے عمل کو لسانیات کہتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کے نزدیک لسانیات کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ زبانوں کا تجزیہ ان کی تاریخ، ان کے باہمی نقاط ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم وگروہ بندی پر غور وخوض کیا جائے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی بات کی تفہیم کے لیے جان پیل کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جو لسانیات کے مقاصد اور فوائد پر روشنی ڈالتا ہے۔

> ''جس طرح کوئی ماہر نباتات پھولوں کا تجزیہ کرتا ہے، ایک لسانیاتی لفظوں کو ٹکڑے کر کے دیکھتا ہے تا کہ معلوم کرے کہ وہ کن اجزاء سے مرکب ہیں اور ان اجزاء کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے۔ اسی طرح وہ یکے بعد دیگرے ہر زبان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اُن سب کی اسی اسلوب پر تحقیق کرتا ہے اس کے بعد نتیجوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے یہ قرار دیتا ہے کہ فلاں فلاں علیحدہ زبانوں میں کون کونسی خصوصیات مشترک ہیں۔ اور ان میں سے کس کے ساتھ کیا بات مخصوص ہے۔ سب کے آخر میں وہ ان اسباب کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُن زبانوں کی تشکیل میں سرگرم رہے ہیں۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو سمجھنا چاہئے کہ وہ زبانوں کی زندگی کے ارتقا اور تغیر کی

ماہیت سے واقف ہوگیا''۔ ۱۲؎

ڈاکٹر زور نے لسانیات کے بیشتر فوائد کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کے خیال میں نفسیات، فلسفۂ عمرانیات اور بشریات پر تحقیق و تفتیش کرنے کے سلسلہ میں لسانیت کی مدد ضروری ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر زور نے مشہور و ماہرین نفسیات جے آر کینٹر اور جے بی واٹسن کے نام خاص طور سے ذکر کیے ہیں۔ جنھوں نے نفسیاتی پہلو پر بحثیں کیں اور لسانیات کو نفسیات کے اصول وضوابط کی روشنی میں دیکھا۔ اسی طرح عمرانیات اور بشریات میں بھی انسانوں کی اجتماعی خصوصیتوں اور مدنیتوں کو سمجھنے کے لیے بھی لسانی مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی تحقیقات میں بھی لسانیات کا علم بہت معاون ہوتا ہے۔ قدیم قوموں کے عادات واطوار اور رسم ورواج کی نسبت معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مختلف قوموں کی تاریخ اور ماقبل لسانی حالات کا اندازہ کرنے میں لسانیات سے زیادہ مفید کوئی علم نہیں ہے۔

ڈاکٹر زور نے لسانیات کی قدیم تاریخ پر بھی بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے خیال میں لسانیات کا قدیم علم یونان، قدیم روما اور اسکندریہ کی دین ہے۔ لیکن اس رو سے بھی انکار ممکن نہیں کہ عہد حاضر میں اس کی ساخت بدل گئی ہے۔ فرانس، اٹلی اور جرمنی میں اس علم پر خاص توجہ منعطف کی گئی۔ اس عہد کی مشہور شخصیتوں جنھوں نے لسانیات پر بحث ومباحثہ کیا اور اس کی تحقیق وتفتیش کی ان میں فرانس کے بودے، اٹلی کے لامبین اور مورے، لووین کے یوسٹس لِس پیٹس اور اس کا لیجر، کیا سوبوں اور ارا سمس کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر زور تقابلی لسانیات کی تاریخ ذکر کرتے ہوئے گرم کو جدید علم لسانیات کا بانی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تقابلی لسانیات کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب کہ یونانی اور لاطینی زبانوں کا ایک مشترک ماخذ قرار دینے کے خیالات یورپ کے علماء میں بار بار پیدا ہوئے اور اکثر یہ بات ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں کہ ان کا ماخذ عربی زبان ہے۔ آخر کار ایک انگریزی فاضل جونس نے ۱۷۸۶ء میں اپنی لسانی تحقیقات کے نتیجے شائع کیے جن سے لاطینی، یونانی، گوتھک، سنسکرت اور کلٹک زبانوں کے اشتراک ماخذ پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۳؎

گرم کے بعد تاریخ لسانیات میں ایک اہم نام اوٹو لیسیرسن Otto Jespersen ہے جس نے ''فلسفہ گرامر''(Philosophy of Grammer) اور ''زبان، اس کی فطرت، ارتقاء اور ماخذ'' Language its Nature Development and Origin" لکھ کر لسانیات کے علم کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ

لسانیات میں اہم نام واندرئیسی (J.Vendryes) (لسانیاتی مقدمہ تاریخ) ای ساپر (E.Sapir) زبان دیباچۂ مطالعہ گفتگو (Language An Introduction to the study of Speach) لکھ کر لسانیات کے علم کو مزید مستحکم کر دیا۔

ڈاکٹر زور نے لسانیات کی تاریخ کے ضمن میں درج بالا ماہرین لسانیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی تصنیفات، خیالات اور تحقیقات سے استفادہ کرنے کی وضاحت بھی کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے لسانیات کی قدیم وجدید تاریخ کا ذکر کرنے کے بعد زبان، ماہیئت، آغاز اور تشکیل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> زبان انسانی ضیات اور احساسات کی پیداوار کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جس میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دہرا سکتا ہے''۔[۱۴]

ڈاکٹر زور کے خیال میں زبان کا ارتقا براہ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور انقاء پر منحصر ہے۔ سوچ اور زبان کا گہرا تعلق ہے۔ سوچنا دراصل اپنے ذہن میں گفتگو کرنا ہے اور زبان اس اندرونی گفتگو کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسی طرح لفظوں کی تشکیل میں انسانی ذہن اور قوت متخیلہ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور تشکیل الفاظ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تشکیل الفاظ انسان کے گزشتہ اور موجودہ ہر طرح کے خیالات کا تعلق کس قدر اہم ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ لفظ اپنی پیدائش کے لحاظ سے انسان کا ایک خود اختیاری یا روایتی اشارہ ہے جس سے واقف ہوتے ہی کسی شخص کے ذہن میں وہی خیال یا خیالات رونما ہو جاتے ہیں جن کو وہ شخص عادتاً یا وراثتاً اس لفظ کے سننے کے بعد پیدا کرتا رہتا ہے مگر عام ذہنوں میں جو خیال یا تصویر کسی لفظ کے سننے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ معین اور تفصیلی نہیں ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک عالم یا ماہر لسانیات کی نظر میں لفظوں کی صرفی ونحوی ترکیب، ان کی معنوی وسعت یا محدودیت یا ان کی تاریخی اور

ارتقائی حالت کے لحاظ سے ان کے معنی خاص اور معین ہیں۔مگر عام طور پر الفاظ
اپنی انفرادی حالت میں نامکمل ہوتے ہیں اور جب وہ جملوں یا فقروں میں
منسلک ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی قدر و قیمت اور ان کی پیش کی ہوئی ذہنی
تصویریں بالعموم نسبتی اور غیر معین ہوتی ہیں۔غرض لفظ اور خیال کے درمیان جو
تعلق ہوتا ہے وہ ہمیشہ استوار اور یکساں نہیں ہوتا۔۱۵؎

ڈاکٹر زور کے خیال میں الفاظ اپنی قدر و قیمت موقع و محل کے لحاظ سے تبدیلی حاصل کرتے رہتے ہیں۔جیسے لفظ قطعہ کے مختلف معانی ممکن ہیں۔

۱۔ زمین کا یہ قطعہ فروخت ہو گیا۔

۲۔ شادی کی مبارکباد ایک فصیح و بلیغ قطعہ کی شکل میں تحریر کی۔

۳۔ قدیم عہد کا ایک پاکیزہ قطعہ کمرہ کی زینت تھا۔

اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصد ہے کہ زبان کی تشکیل اور اس کا مفہوم خیالات میں تبدیلی یا کمی بیشی پر منحصر ہوتا ہے۔اس کی مناسبت سے زبان کا مفہوم بدلتا ہے۔

زبان کے فطری ارتقاء کے ضمن میں ڈاکٹر زور نے صوتی تغیر و تبدل اور ادغامی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔زمان و مکاں کے حالات کے مطابق زبان خود بخود بدلتی رہتی ہے۔اسی کو زبان کا فطری ارتقاء کہتے ہیں۔اس کا انحصار زیادہ تر صوتی تشکیل اور تغیر و تبدل پر ہوتا ہے۔ڈاکٹر زور نے صوتی تغیرات کی ایک اہم وجہ ''عضویاتی'' کو قرار دیا ہے۔یعنی ہر نسل کے بعد اس کی آوازیں اور اس کے عضوی عادات و اطوار غیر محسوس طور پر کچھ نہ کچھ تبدیلی پاتے ہیں۔یہ تبدیلی ہمسایہ اثر کے زبان سے بھی ہوتی ہے۔یا اجنبی زبان بولنے والوں سے سابقہ پڑنے کے نتیجہ میں مخارج تلفظ میں تبدیلی ہوتی ہے۔اس خیال کو پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے بڑی عمدگی سے تاریخی حوالوں سے عملی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔لفظ ''سے'' کس طرح زمانہ اور نسل کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے ہوئے اس مقام تک پہنچا،لفظ ''سے'' ولی اور اس کے ہم عصروں کے زمانے میں سیل یا سوں مستعمل ہوتا تھا جیسے ولی کا شعر:

مت غصہ کے شعلوں سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

ولی سے پچاس سال قبل یہی لفظ ''سے'' ''ستے'' اور ''ستیں'' شکل میں رائج تھا۔اورنگ زیب کے معاصر غلام

علی کی نظم پدماوت میں یہ لفظ ستے مستعمل ہے۔

''بھلائی ستے تو بھلا پائے گا''

غلام علی سے پچاس سال قبل لفظ ''سے'' میں س کی آواز بالکل نہیں تھی بلکہ مجھ سے کہا کی جگہ ''مج تھے کھیا'' کہتے تھے۔ مثلاً محمد قلی کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں:

۱۔ معانی کے باتاں تھے جھڑ تا نمک

۲۔ مرا گلستاں تازہ اس تھے ہوا ہے

معراج العاشقین میں ھ کی آواز بھی نہیں ہے بلکہ ''تے'' لکھا گیا ہے۔ مثلاً ''اگر اس میں تے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی انچ تے میں جلوں''۔

اس مثال سے ڈاکٹر زور نے یہ ظاہر کیا ہے کہ صوتی شکل مختلف زمانوں اور مقامات پر بدلتی گئی۔ یہ مثال نہ صرف اردو زبان پر صادق آتی ہے بلکہ دنیا کے دیگر زبانوں میں بھی اس امر کے ثبوت موجود۔

ڈاکٹر زور نے ادغامی اثرات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات کسی حرف کا تلفظ پورا نہ سننے کی وجہ سے بولتے وقت غلط طریقہ یہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے تلفظ کا اثر بالعموم کمزور آوازوں اور خاص کر حرف علت پر پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حروف اسی حالت میں باقی نہیں رہتے یا لفظوں میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ جیسے لالٹین (لانٹرن) فلالین (فلانل) اور لمبر (نمبر) کی تشکیل اسی اثر کے تحت عمل میں آئی۔ ان مثالوں کے علاوہ ڈاکٹر زور نے اردو اور سنسکرت کے الفاظ کا بھی تقابل کیا ہے۔ سنسکرت کا حرف وا اردو میں کس طرح ''ب'' بن گیا ہے۔ اس کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

اردو	سنسکرت	اردو	سنسکرت
باٹ	وَرْتَم	بیس ۲۰	ویمشتی
بن	ونم	بیت	ویتر
بڑ	وٹ	بالو	والوک

درجہ بالا الفاظ صوتی ارتقا و تبدیلی کے تحت تغیر پذیر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر زور کا یہ بھی ماننا ہے کہ یہ تبدیلیاں کسی اصول و قاعدے کے تحت عمل میں نہیں آئیں بلکہ یہ محض اتفاقی اور ہنگامی واقعہ کا نتیجہ ہیں۔

ڈاکٹر زور نے زبان کے باب میں ''ارادی تشکیل'' کے موضوع کے تحت مختلف ذرائع کا جائزہ لیا ہے۔ زبان کی

ارادی تشکیل کے اسباب بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ زبان کی ارادی تشکیل عموماً دو ذریعوں سے عمل میں آتی ہے ایک ذریعہ عوام کا دوسرا عالموں اور انشا پردازوں کا۔ عوام کے سیاسی اور اقتصادی حالات زبان کی تشکیل میں تغیر و تبدل کا سبب بنتے ہیں لیکن یہ عمل فطری تشکیل نہیں کہلاتا۔ مثلاً عربوں کے حملے نے مصر کی اصلی زبان کو مسخ کر دیا۔ اسی طرح عربوں نے ایران کی زبان کو بھی متاثر کیا۔ مگر ایسے انقلابات بہت کم واقع ہوتے ہیں۔

زبان کی تشکیل میں سیاسی اثرات کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اکثر ملک کی سرکاری یا حکمرانوں کی زبان دوسری بولیوں کو متاثر کرتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر زور نے دکنی اردو کی مثالیں پیش کی ہے۔ معاشی اثرات بھی زبان کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ اکثر چیزوں کے نام پردیس میں بھی مشہور ہو جاتے ہیں جو ان کی اصل جائے پیدائش کی پیداوار ہوتے ہیں جو ملک اپنا مال زیادہ تعداد میں فروخت کرے گا اپنے مال کے ساتھ اپنے الفاظ بھی زیادہ تعداد میں فروخت کرے گا۔ جیسے میز، لالٹین، بوٹ، پتلون، ریل، موٹر، سیکل وغیرہ کے الفاظ انہی مقامات سے ہندوستان میں آئے ہیں جہاں سے یہ نام رکھنے والی چیزیں یہاں داخل ہوئیں۔ ڈاکٹر زور کے خیال میں زبان کی تشکیل میں ثقافتی اثرات بھی ایک ذریعہ ہیں۔ جو قوم اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن والی زبان رکھے گی وہ دوسری قوموں کو بھی متاثر کرے گی۔ یونانی زبان نے عرب، ایران اور ہندوستان کو متاثر کیا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں لاتعداد عربی الفاظ یورپ پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ عالموں، انشا پردازوں اور اصطلاح سازی کرنے والوں نے بھی زبان کی ارادی تشکیل میں اپنا اپنا رول انجام دیا ہے۔ دارالترجمہ نے جتنے نئے الفاظ اردو زبان کو دیئے شاید دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال نہیں پائی جاتی۔ ڈاکٹر زور نے زبان کی تشکیل کے مباحث عمدگی اور مثالوں کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے دنیا کی زبانوں کی تقسیم خاندان وغیرہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ زبانوں کی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے۔ پہلی قسم میں زبانوں کی لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے درجہ بندی کی ہے۔ دوسری قسم کی گروہ بندی نسلی اور تاریخی تعلقات کی بنا پر عمل میں آتی ہے۔ دنیا کے آٹھ بڑے خاندان السنہ کی وضاحت ڈاکٹر زور نے کی ہے۔ (۱) سامی (۲) ہند چینی (۳) ڈراوڑی (۴) مونڈا (۵) افریقہ کی بانتو (۶) امریکی (۷) ملایا (۸) ہند یوروپی۔

پھر ہند یوروپی خاندان کی زندہ زبانوں کو (۸) آٹھ شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) ہند ایرانی یا آریائی (۲) ارمنی (۳) بلقان سلانی (۴) البانوی (۵) ہیلینی (۶) اٹالوی (۷) کیلٹک (۸) ٹیوٹونی۔

ان کے علاوہ ہند یوروپی کی زبانوں کا ایک مفصل خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

ہندایرانی زبانوں کے خاندان کو تین شاخوں میں منقسم کیا ہے۔

(۱)ایرانی (۲)پشاچہ (۳)ہندآریائی

اردو زبان کو ہندآریائی خاندان میں شمار کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے ہندآریائی ارتقا کے عنوان سے ایک علٰحیدہ باب باندھا ہے جس میں ہندآریائی ادوار کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔قدیم ہندآریائی

۲۔درمیانی ہندآریائی

۳۔جدید ہندآریائی

ڈاکٹر زور نے اسباب میں سر جارج گریرسن کی تحقیقات (ہندوستان میں آریاؤں کے دو گروہ ہیں) سے اختلاف کرتے ہوئے ہندآریائی زبانوں کو پانچ شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔سر جارج گریرسن کے نظریہ کی وضاحت اور اس کی تردید ''ہندوستانی لسانیات'' سے ملاحظہ ہو۔

گریرسن کا نظریہ

سر جارج گریرسن کی تحقیقات کے بعد سے یہ خیال عام طور پر پھیل گیا ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کے دو گروہ آئے۔ایک پہلے آیا ایک بعد۔ پہلا گروہ دوآبہ گنگ وجمن میں قیام پذیر تھا دوسرا گروہ وارد ہوا اور پہلے گروہ کو شمال، جنوب اور جنوب مغرب کی طرف ڈھکیل دیا۔اس طرح سے وہ ''اندرونی آریا'' بن گئے اور ہزیمت خوردہ گروہ ''بیرونی آریا'' کہلایا۔ویدوں اور برہمنوں کی تہذیب ومعاشرت نے اندرونی دائرے کے آریاؤں میں پرورش پائی اور ان کی زبان بیرونی دائرہ کے آریاؤں کی زبان سے الگ رہی۔نتیجہ یہ ہوا کہ زبانوں کے دو گروہ قرار پائے۔(۱)اندرونی دائرہ کی زبانیں (۲)بیرونی دائرہ کی زبانیں۔

بیرونی دائرہ میں پنجابی، سندھی، گجراتی، راج پوتی، مرہٹی، مشرقی ہندی کی قسمیں اور ان کے علاوہ بہاری، بنگالی، اُڑیہ اور آسامی شامل ہیں۔اندرونی دائرہ میں مغربی ہندی اور اس کی شاخیں بانگڑو، قنوجی اور برج بھاکا وغیرہ۔

گریرسن اور ان کے متبعین کا یہ نظریہ وقیع نہیں معلوم ہوتا۔انھوں نے جس مواد سے کام لیا ہے وہ نسبتاً بعد کا ہے اور ثابت نہیں کرسکتا کہ اندرونی اور بیرونی دائرہ کی زبانیں دو جدا جدا نسلیں اور گروہوں کی پیداوار ہیں۔ان میں کوئی

ایسی خاص خاص خصوصیتیں تو نہیں ہیں جن کی بنا پر یہ رائے تسلیم کی جاسکتی ہو۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب ''آغاز وارتقائے بنگال'' کے ضمیمہ میں اس موضوع پر کافی بحث کی ہے اور چونکہ ہمارے موجودہ موضوع سے اس کا کوئی گہرا تعلق نہیں ہے اس لیے ہم اس مسئلہ پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری نظر میں بھی ویبر اور چٹرجی کا یہ خیال درست ہے کہ موجودہ ہندآریائی زبانوں کو ان کی لسانی اور ترکیبی خصوصیتوں کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ شاخوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔

(۱) شمال مغربی (۲) جنوب مغربی (۳) وسطی (۴) مشرقی (۵) جنوبی۔

اس طرح ڈاکٹر زور نے نہ صرف گریرسن کے نظریہ کی نفی کی ہے بلکہ اپنا نظریہ بھی مضبوط دلائل کی روشنی میں پیش کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے شمال مغربی گروہ کی زبانوں میں مغربی پنجابی، مشرقی پنجابی اور سندھی کے علاوہ ان جپسیوں کی بولیاں (جو ارمینیا، ایشیائے کوچک، شام اور یورپ کے مختلف مقامات میں پائے جاتے ہیں) شامل ہیں۔

مشرقی پنجابی میں پنجابی زبان شامل ہے۔ ان میں ڈوگری زیادہ مشہور ہے۔ سندھی جو دریائے سندھ کی نشیبی وادی اور علاقہ میں بولی جاتی ہے۔

شمالی مغربی گروہ کی زبانوں کا نقشہ بھی ڈاکٹر زور نے پیش کیا ہے۔ اسی طرح جنوب مغربی گروہ کا نقشہ بھی۔

ڈاکٹر زور نے یہ بھی لکھا کہ وسطی ہندآریائی زبان کا نام مغربی ہندی ہے اور مغربی ہندی میں برج بھاشا، قنوجی، بندیلی، بانگڑو یا ہریانی، ہندوستانی شامل ہیں۔

وسطی گروہ میں ہندوستانی، بانگڑو، برج بھاشا، قنوجی، تبدیلی شامل ہیں۔ اور ہندوستانی میں ناگری رسم الخط اور فارسی رسم الخط کو شامل کیا ہے۔ ناگری رسم الخط سے جدید ہندی اور فارسی رسم الخط سے گجراتی، دکنی، جدید اردو شامل ہیں۔

ہندوستان کی غیر ہندآریائی زبانوں میں ہند ایرانی، چینی خاندان السنہ اور اسٹری خاندان السنہ شامل ہیں۔ ڈراویڈی زبانیں غیر آریائی زبانوں میں سب سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ڈراویڈی زبانوں کا نقشہ بھی پیش کیا ہے اور ان کی زبانوں پر مفصل معلومات بھی فراہم کی ہیں۔

اس طرح اس کتاب کا پہلا حصہ زبان کی تعریف آغاز وارتقا سے لے کر زبانوں کی تقسیم پر ختم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ہر باب کو نہایت جامع اور اختصار کے ساتھ مثالوں اور دلائل کے ساتھ خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

''ہندوستانی لسانیات'' دوسرا حصہ بقول زور بہت اہم ہے۔ کیوں کہ اس حصہ میں ہندوستانی کے آغاز، ارتقا،

ادبی بولیوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ہندوستان کی ساخت اور اس کے آغاز وارتقا کے مواد کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) قدیم تذکرے (۲) فرانسیسی اور انگریزی تصنیفات (۳) عہد متوسط کی تحریریں (۴) عہد جدید کی تحقیقات۔ عہد جدید میں اردوئے قدیم (حکیم شمس اللہ قادری) دکن میں اردو (نصیرالدین ہاشمی)، پنجاب میں اردو (پروفیسر حافظ محمود شیرانی) اردو شہ پارے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے سے پہلے ہندوستانی سے متعلق مختلف خیالات اور نظریوں کو پیش کیا ہے۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستانی کا آغاز دکن میں ہوا۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ سندھ میں چونکہ مسلمان چار صدیوں تک نشو ونما حاصل کرتے رہے اس لیے یہاں اردو نے جنم لیا۔

تیسرا نظریہ حافظ محمود شیرانی کا ہے کہ اردو بہ نسبت برج بھاشا کے قدیم پنجابی سے زیادہ مشتق ہے۔ ڈاکٹر زور نے محمود شیرانی کے نظریہ کی ستائش کی ہے۔

ڈاکٹر زور کا ماننا یہ ہے کہ اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت بہت حاصل کی۔ جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت نہ بنالیا۔ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر زور نے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا:

> ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترکہ سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ میں رہے ہیں۔ اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی''۔ ۱۶

ڈاکٹر زور کا نظریہ بالکل واضح ہے۔ ڈاکٹر زور کے لسانی نظریہ کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''تمہیدی باب میں فاضل مصنف نے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ پیش کیا ہے کہ بارہویں صدی سے قبل صوبہ سرحد سے الہ آباد تک

ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بارہویں صدی کے بعد زبانوں کا اختلاف شروع ہوا۔ پنجاب میں پنجابی، یوپی میں کھڑی بولی، اردو نہ پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ ان دونوں کے مشترک ماخذ سے تشکیل پائی ہے..... زور صاحب نے شمالی اور دکنی اردو کے اختلاف بڑی وضاحت اور تفصیل سے پیش کیے ہیں اس سے پہلے دکن کی خصوصیات کے بارے میں شاید ہی لکھا ہو۔ ڈاکٹر زور نے دانائے راز کی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہلے انھوں نے صوتیاتی اختلافات کی شرح کی ہے بعد میں صرف ونحو کی۔ ۱۷

ڈاکٹر زور نے اردو کو پنجابی اور کھڑی بولی سے مربوط کیا ہے۔ ان کے اشتراک سے اردو وجود میں آئی لیکن اس کی صورت گری دکن میں ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے اردو کے لسانی خاکہ میں دکن اور دکنیات کو اہمیت دی ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول میں ڈاکٹر زور کے نظریہ کی مزید وضاحت ملتی ہے۔

''ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جنھوں نے ''دکنی'' کی بازیافت میں نمایاں حصہ لیا اور محمود شیرانی، جنھوں نے اردو کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلے قلم اٹھایا ''دکنی اور پنجابی'' کی جزوی مماثلتوں کی بناء پر دکنی کا ماخذ پنجابی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ہندوستانی صوتیات میں معیاری اردو کو کھڑی بولی سے مشتق اور ''دکنی'' کو پنجابی سے مشتق بتاتے ہیں لیکن ڈاکٹر چٹرجی، ڈاکٹر ژول بلاک اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کی تحقیقات کی رو سے دکنی نہ تو برج بھاشا سے نکلی نہ پنجابی سے۔ اس کا مؤلد ومنبع نواح دہلی کی بولیاں''۔ ۱۸

اردو کے آغاز کے نظریات کا مطالعہ کرنے سے سخت اختلاف نظر آتا ہے۔ ہر محقق نے اپنے دلائل کی روشنی میں دوسروں کے نظریات کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے بھی اپنے پیش رو اور معاصر ماہرین لسانیات کے نظریات سے اختلاف کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی تعصب کی وجہ سے اردو کو ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں حالاں کہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر

نت نئی غلطیوں کو گوارا کر لینا پڑتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر بلند پایہ صاحبانِ فضل و کمال کو گم راہ کر دیتا ہے۔ یہ غلطیاں اور غلط فہمیاں فرانسیسی اور انگریز ماہرین لسانیات کی پیدا کردہ ہیں''۔ ۱۹

ڈاکٹر زور نے اپنے ایک مضمون ''اردو کی ابتدا'' مختلف محققین اور ماہرین لسانیات کے نظریات سے اختلافات کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی (نقوش سلیمان)، ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی (انڈو آرین اور ہندی)، ڈاکٹر مسعود حسین خاں (مقدمہ تاریخ زبان اردو) اور شوکت سبزواری (اردو زبان کا ارتقا) کے نظریات سے اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

اس کتاب میں مسعود صاحب سے ایک اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ حالاں کہ دکنی اُردو نے جس وقت پنجاب میں نشو ونما حاصل کیا اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالم وجود میں نہیں آئی تھی اور خود انھوں نے پروفیسر شیرانی کے اس نظریے کو قبول کیا ہے کہ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمدِ دہلی کے بعد عمل میں آئی ہے۔ ۲۰

اس طرح ڈاکٹر زور نے اپنے معاصر محققین اور ماہرین لسانیات سے اختلاف کیا ہے۔

اردو کے آغاز کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد جس نظریہ کو سب سے قابل قبول سمجھا جائے گا وہ ہے پروفیسر مسعود حسین کا نظریہ، اردو کی ابتدا اور ارتقا کے اصل تاریخ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''پنجاب پر غوریوں کے حملے ۱۱۶۸ء سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ۱۱۹۳ء میں بالآخر ایک شکست کھانے کے بعد شہاب الدین غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پرتھوی راج کو شکست فاش دے کر دہلی اور اجمیر پر قابض ہو جاتا ہے جہاں اس کا سپہ سالار قطب الدین ایبک، اس کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں سلطنتِ غلامان کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ اُردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ اس کے بعد ہی سے شروع ہوتی ہے''۔ ۲۱

پروفیسر مسعود حسین کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵ء) جو ''ہندوی'' / ''ہندی'' (اردو کا قدیم نام) کے پہلے مستند شاعر سمجھتے جاتے ہیں، کا تعلق اسی دور سے ہے۔ان کا بیشتر ہندوی کلام غیر مستند قرار دیا گیا ہے لیکن ان کے شاعر ہندوی/ ہندی ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔

۲۔صوفیائے کرام کے ہندی (اردو کا قدیم نام) اقوال وملفوظات جو فارسی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں زیادہ تر اِسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔نورِ دہلی میں رائج کھڑی بولی (جس پر اردو کی بنیاد قائم ہے) میں عربی و فارسی الفاظ کا نفوذ بہ طور خاص اسی دور سے شروع ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ف، ز، خ، غ وغیرہ آوازیں بھی اس میں داخل ہوجاتی ہیں۔اس لسانی امتزاج سے کھڑی بولی میں 'نکھا' پیدا ہونے لگا ہے اور یہ ایک نئی اور امتیازی شکل اختیار کرنے لگتی ہے جسے ہم اردوئے قدیم کہہ سکتے ہیں۔

۴۔اردو کے ''ہندوی'' اور ''ہندی' نام اسی دور میں پڑتے ہیں، اور اسی زبان کو امیر خسرو اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' (۱۳۱۸ء) کے تیسرے سپہر میں زبانِ ''دہلی'' کہتے ہیں، ع

دہلی و پیرا منش اندر ہمہ ہمد

۵۔''ہندوی'، ''ہندی'' یا زبان ''دہلی'' (بہ لفظ دیگر 'دہلوی') اسی دور میں دکن پہونچتی ہے جہاں وہ ادبی ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہے۔

۶۔کھڑی بولی سے تشکیل پذیر زبان ''ہندوی''، ''ہندی''، ''زبانِ دہلی'' (دہلوی) شمال و دکن میں فارسی رسم خط میں ڈھالی جاتی ہے لیکن اسے ہم اب اردو رسم خط کہتے ہیں۔

انھیں وجوہ کی بنا پر مسعود حسین خاں ۱۱۹۳ء (فتح دہلی کی تاریخ) کو اردو کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔۲۲

مسعود حسین خان کا یہی نظریہ سب سے قابل قبول ہے جسے لسانیاتی بنیادوں پر اب تک رد نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کے نظریات یکسر غلط ہیں بلکہ ہر ایک کے نظریہ میں کوئی نہ کوئی بات قابل قبول ضرور ہے۔

ڈاکٹر زور نے ''ہندوستانی لسانیات'' میں ''ادبی بولیاں'' کے زیر عنوان گجراتی، دکنی، شمالی بولیوں کے اختلاف کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس باب کے تعلق سے ڈاکٹر زور کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ اس حصے کا ایک عالمانہ باب، ادبی بولیاں، گجراتی، دکنی، شمالی ہے..... آج کے لکھنے والوں میں کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دکنی اور گجری مختلف بولیاں ہیں۔

انھیں ایک سمجھ لیا جاتا ہے لیکن زور صاحب نے دونوں بولیوں کے چار اختلافات پیش کیے ہیں اور اس طرح گجری کو دکنی سے ممیّز کیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے ہندوستان کی ہمہ گیری کے زیر عنوان شمال اور دکن کے اختلاط پر اپنے خیالات واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس اختلاط کے سبب دونوں ہی زبانوں کے اختلاف کا احساس پیدا ہوا۔ شمال کا کلام دکن میں اور دکن کا کلام شمال منتقل ہوا۔ ڈاکٹر زور نے تحریک مظہر اور لکھنو کی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

ایک جگہ لکھنو کی اردو خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لکھنو ہی کی اس عظیم الشان خدمت کا نتیجہ تھا کہ وسط انیسویں صدی عیسوی میں اردو معراج کمال کو پہنچ گئی۔ اس زمانہ وہ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان بن گئی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی علمی و ادبی زبان بھی یہی تھی۔ اسی میں وہ کتابیں لکھتے اور شعر و شاعری کرتے تھے اور یہی زبان ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے والوں کے آپس میں ذریعہ گفتگو تھی۔ اس زمانہ میں کسی کو خواب و خیال بھی نہیں تھا کہ اردو بدیسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس لیے بدیسی ہے۔ سب تسلیم کرتے تھے کہ ہندوستان کی عام مشترک زبان اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ ہندوستانی ہی ہے''۔ ۲۳

ڈاکٹر زور نے اردو، ہندی کے جھگڑے، اسباب نتائج پر بھی غور و فکر کیا ہے۔ اردو اور ہندی کے جھگڑے کے بنیادی اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کو ایک سنگین مسئلہ بتایا۔

اور یہ خیال بھی پیش کیا کہ اس جھگڑے کی اصل انگریز ہیں۔ جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں یہ باور کرانے کی

کوشش کی کہ فارسی رسم خط بدیسی ہے۔اس کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں۔اس طرح منشیوں سے بھی ہندو مسلمانوں کی عام مشترکہ زبان کو ہندی رسم خط میں لکھوانا شروع کیا جس سے مذہبی رنگ اختیار کرلیا۔مسلمان ہندوستانی کو فارسی رسم الخط میں لکھتے اور اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے اور ہندو دیوناگری رسم خط میں لکھتے اور سنسکرت الفاظ استعمال کرتے۔اس طرح ہندی اور اردو کا جھگڑا شروع ہوا۔

ساتھ ہی انھوں نے اردو اور ہندی الفاظ کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے جس سے دونوں زبانوں کے اختلاف کو سمجھا جاسکتا ہے۔اس باب کے آخر میں زبان کے ماہرین اور عالموں کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ہر زبان کے انشا پردازوں اور عالموں کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی تنقیح کرتے رہیں اور اپنی زبان کی حفاظت کریں، اگر زبان کی اصلاح و ترقی نہ ہوگی تو ادبی قابلیتیں بھی ترقی نہ پاسکیں گی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ادب ہی کی ترقی پر ملک وقوم کی ترقی کا انحصار ہے۔

ڈاکٹر زور کی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> یہ کتاب جن بنیادی مباحث پر مشتمل ہے ان کی اردو زبان کے مطالعے کے سلسلے میں بڑی اہمیت ہے اسی لئے اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چناں چہ اس کتاب کی قرار واقعی ہوئی اور اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں یہ شامل کی گئی۔ ہندوستانی لسانیات جو اس کتاب کا اصلی موضوع ہے اس کے مد نظر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اس کے ابتدائی چار ابواب جو عام لسانیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ موضوع بذات خود ایک اہم اور وسیع موضوع ہے۔ غیر ضروری ہیں۔لیکن جس زمانے میں ڈاکٹر زور نے یہ کتاب تصنیف کی عام لسانیات یا علم زبان کے بارے میں اردو میں کوئی تصنیف موجود نہیں تھی۔اس لئے ان مباحث کو شامل کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔اس کے علاوہ ان ابواب کو شامل کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ اردو کے طالب علم زبان کے عام مسائل کے پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہند آریائی اور اردو کے مخصوص مسائل کا مطالعہ کریں۔۔۔لسانیات یا علم زبان اور خاص طور پر اردو کے آغاز کے سلسلے میں ڈاکٹر زور مرحوم کی مساعی قابل قدر ہیں۔انہوں نے اپنی تصانیف اور مضامین

کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لئے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی راہیں کھول دیں''۔۲۴

پروفیسر سیدہ جعفر ڈاکٹر زور کی لسانیاتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور اردو کے ان اولین ماہر لسانیات میں سے ہیں جنہوں نے ہمارے ادب کے سرمایے میں اس اچھوتے موضوع پر اظہار خیال کر کے نئی نسل کے لئے اس مسئلہ پر غور وخوض کی نئی راہیں کھول دی ہیں اور ایک وقیع اور قابل قدر تصنیف کا اضافہ کیا ہے۔ آج بھی ادب کے طالب علم صوتیات اور لسانیات پر ڈاکٹر زور کی کتابوں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ گیان چند جین نے ڈاکٹر زور کو اردو لسانیات کا ''ابوالآبا'' کہا ہے جو بہت مناسب اور درست معلوم ہوتا ہے۔'' ۲۵

غرض ڈاکٹر زور کی یہ کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' نے ان کو ایک ماہر لسانیات کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس سے قبل عام لسانیات یا علم زبان کے بارے میں کوئی خاص تصنیف نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور نے اس کمی کو پورا کیا، اس کتاب کا اہم موضوع ہندوستانی ہے۔ جس طرح دلائل کے ساتھ ڈاکٹر زور نے اپنی بات یا نظریہ پیش کیا انھیں یقیناً مستحسن نظروں سے دیکھا جائے گا۔ ہندوستانی لسانیات کے ذریعہ ڈاکٹر زور نے لسانی مسائل کو دلچسپ اور شگفتہ انداز میں پیش کیا۔ اس کی اشاعت سے علم لسانیات کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ اس بنا پر ڈاکٹر زور پہلا محسن اردو ہے جس نے لسانیات جیسے جدید علم سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ لسانیات اور صوتیات کے اپنے تجربات کو کتابی روپ عطا کر کے زبان اردو کا دامن مالا مال کر دیا۔ ان کا یہ شاندار کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

لسانیات کے موضوع پر ڈاکٹر زور کی دونوں تصانیف ہندوستانی صوتیات اور ہندوستانی لسانیات کے تفصیلی تحقیقی وتنقیدی جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اردو میں بالکل پہلی مرتبہ اس موضوع پر سائنٹفک انداز میں مطالعہ اور اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ جس پر بعد کے ماہرین لسانیات نے اپنا کام کیا ہے۔ اس طرح اردو کے نقادوں نے انہیں اس موضوع پر کام کرنے کی اولیت کا جو شرف دیا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر زور نے اردو اور دکنی کے بارے میں لسانی اور صوتیاتی نقطہ نظر سے جو کام کیا ہے اسے مزید آگے بڑھایا جائے۔

حواشی

۱ غلام رسول ''سب رس'' ڈسمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۹۱

۲ ڈاکٹر زور۔ ہندوستانی لسانیات۔ص۔۱۷

۳ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ ہندوستانی لسانیات۔ دیباچہ۔ص۔۹

۴ ڈاکٹر جیولس بلوک۔ ہندوستانی لسانیات۔تعارف۔ص۔۱۲

۵ ڈاکٹر زور۔ ہندوستانی لسانیات۔تمہید۔ص ۱۱۔۱۲۔ رہنمایانہ مضامین ایم اے اردو ص ۱۱۷

۶ گیان چند جین ڈاکٹر۔ بحوالہ۔ سب رس ڈسمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۸۹

۷ اشرف رفیع ڈاکٹر۔ بحوالہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ حیات شخصیت اور کارنامے۔ مرتبہ پروفیسر مغنی تبسم۔ص ۳۳۴

۸ ڈاکٹر زور۔ (رہنمایانہ مضامین برائے ایم اے، ص ۱۱۳)

۹ ڈاکٹر زور۔ (صوتیات اور فونیمیات ص ۱۵

۱۰ پرفیسر اشرف رفیع۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ حیات شخصیت اور کارنامے۔ص۔ ۳۳۷

۱۱ (ہندوستانی لسانیات دیباچہ۔ص۔۹

۱۲ جان پیل۔ ہندوستانی لسانیات۔ص ۱۸

۱۳ ڈاکٹر زور۔ ہندوستانی لسانیات۔ص ۲۲

۱۴ ڈاکٹر زور۔ ہندوستانی لسانیات۔ص ۲۶

۱۵ ڈاکٹر زور۔ ہندوستانی لسانیات۔ایضاص۔۳۰

۱۶ ڈاکٹر زور۔ ہندوستانی لسانیات۔ص ۹۵

۱۷ گیان چند جین۔ ڈاکٹر۔ سب رس کراچی زور نمبر جنوری ۱۹۷۹ء ص ۶۸

۱۸ اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول ص ۴۷

۱۹ مرزا خلیل بیگ۔ اردو زبان کی تاریخ ص۔۱۷

۲۰ ڈاکٹر زور۔اردو زبان کی تاریخ ص ۲۷

۲۱ مسعود حسین خان بحوالہ۔لسانی تشکیل از۔خلیل احمد بیگ ص ۲۷

۲۲ مسعود حسین خان بحوالہ۔اردو کی لسانی تشکیل، از۔مرزا خلیل بیگ،ص ۲۷،۳۷

۲۳ ڈاکٹر زور۔ہندوستانی لسانیات، ص ۱۳۱

۲۴ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔حیات شخصیت اور کارنامے۔ص۔۳۲۸

۲۵ سیدہ جعفر۔ڈاکٹر زور۔ص ۱۲۷۔۱۲۸

☆ تیسرا باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق

ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کا جائزہ

☆ اردو شہ پارے ☆ تذکرہ گلزار ابراہیم

☆ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ☆ دکنی ادب کی تاریخ

☆ طالب و موہنی ☆ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ

☆ تاریخ ادب اردو ☆ رمز سخن۔ بادۂ سخن ☆ فیض سخن

☆ متاع سخن ☆ مرقع سخن

ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق

ڈاکٹر زور ایک محقق کی حیثیت سے اردو تحقیق کے میدان میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے تحقیقی کام میں لگا دیا اور تحقیقی میدان کو وسعت دے کر آنے والی نسل کے لیے میدان ہموار کیا۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مختلف میدان ہیں لیکن انھوں نے دکنی ادب کی تحقیق کو اپنے اوپر لازم کرلیا۔ ان کی تحقیقی کاوشوں میں اردو شہ پارے، حیات محمد قلی، حیات میر مومن، دکنی ادب کی تاریخ، کلیات، محمد قلی کی تدوین، داستان ادب حیدرآباد، حیدرآباد فرخندہ بنیاد اور دکنی مخطوطات کی توضیحاتی فہرستوں کی ترتیب وغیرہ خالص تحقیقاتی کام ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیق کے لیے دکنی ادب کو منتخب کیا۔ وہ خود دکن کے تھے اور دکنی ان کی زبان تھی۔ اور انہیں دکنی زبان اور ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس لیے انھوں نے خصوصی طور پر اس میدان میں کارنامے انجام دیئے اور بے شمار مخطوطات کو جمع کیا اور اپنی تحقیق کے ذریعہ دکنی تہذیب وتمدن کے گوشوں کو منور کیا اور دکن شعراء اور ادیبوں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ان کی عظمت کا سکہ سارے ہندوستان پر بٹھا دیا۔ ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کے جائزے سے قبل دیکھا جائے گا کہ تحقیق کا فن کیا ہے اور اردو میں اس کی روایت کیا ہے۔

تحقیق کی تعریف

تحقیق کے معنی حقائق کی کھوج، تفتیش، دریافت، چھان بین اور تلاش کے ہیں۔ تحقیق عربی زبان کے لفظ ''حق'' سے مشتق ہے جس کے معنیٰ حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنے کے ہیں۔ حق کے معنیٰ سچائی کے ہیں اور اس طرح تحقیق سچ یا حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ اُردو کے مختلف نقادوں اور ماہرینِ فن نے تحقیق کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''تحقیق کے لغوی معنیٰ کسی شئے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ [1]

تحقیق کے بارے میں قاضی عبدالودود کی رائے ہے:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ ۲؎

پروفیسر گیان چند جین تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشاء کرنے کا باضابطہ عمل ہے اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے۔ نامعلوم یا کم معلوم کو جاننا، یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں انھیں کھوجنا جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں۔ ان کی دھند دور کر کے انھیں آئینہ کر دینا''۔ ۳؎

''تحقیق کے لغوی معنیٰ کسی شئے کی حقیقت کا پتہ لگانا ہے۔ خواہ وہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مدفون حقائق کو روشنی میں لانا ہو یا موجود مواد کو از سر نو ترتیب دینا''۔ ۴؎

تحقیق کی مختلف تعریفوں اور توضیحات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحقیق حرکت و عمل و زندگی کی علامت ہے۔ اگر تحقیق رک جائے تو زندگی بھی رک جاتی ہے۔ اُردو میں ادبی تحقیق کے ضمن میں مصنفین اور ان تحقیقات کی بازیافت ادبی تحریکات، صحت متن کی تحقیق و تدوین، لسانی حقیقتوں کی کھوج، جس میں قدیم زبان، محاورات، عروض و رسم الخط وغیرہ شامل ہیں جیسے اُمور پر بحث کی جاتی ہے اور بعد تحقیق ادب کے سرمائے میں اضافہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق میں کسی موضوع کے انتخاب کے بعد قائم کردہ مفروضات سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق کبھی بھی حتمی اور فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ ایک تحقیق مزید تحقیق کی راہیں کھولتی ہیں۔ تحقیق کا فن صبر آزما فن ہے۔ اس کے لیے جگر کاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''یہ کام آسان نہیں ہے اس میں بڑی جگر کاری، محنت اور صبر کی ضرورت ہے۔ جلد اکتا جانے والا انسان تحقیق کی راہ میں زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے کہ حقائق کی تلاش بہت دشوار کام ہے۔ ۵؎

بعض لوگ تحقیق کو بے کار کام اور گڑے مردے اکھاڑنے کا کام سمجھتے ہیں اور اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشہور نقاد ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحقیق کے فن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

.... تحقیق ایک قسم کی منشی گیری ہے۔ اس کے لیے وہ خصوصیات کافی ہیں جو کسی معمولی ذہن کے انسان میں ہوں۔ اس میں جدت طبع، قوت اختراع کی ضرورت

نہیں ۔محض ایک کام سے لگ جانا ہے اور ٹکے بندھے طریقے پر ایک لکیر پر چلتے رہنا ہے پھر اس میں جس قسم کی محنت درکار ہے اس کو اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ تخیل رکھنے والا انسان کبھی قبول نہ کرے گا ۔تحقیق کرنے والے کی حیثیت ایک مزدور کی سی ہوتی ہے جو اینٹیں اُٹھا کر لاتا ہے اور ان کو جوڑ کر دیوار بناتا ہے۔ [۶]

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے تحقیق کے بارے میں اس طرح کے منفی اور بیزار نظریات موجودہ دور کی جامعاتی تحقیق پر پورے اُترتے ہیں۔ جب کہ آج کل جامعات میں تحقیق کا معیار صرف سند کی خاطر تحقیقی مقالے لکھوانا ہی رہ گیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق اس کی اہمیت کے احساس اور پوری لگن سے کی جائے تو اس سے بڑے معنیٰ خیز نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

تحقیق کا فن بذاتِ خود تنہا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ تخلیق اور تنقید کا رشتہ بھی جڑا ہوتا ہے ۔تحقیق اور تنقید' تخلیق کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ ایک تخلیق وجود میں آنے کے بعد ہی اس کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے اور تنقید کے ذریعہ اس کے مقام کا تعین کیا جاتا ہے لیکن ان تینوں میں اولیت کا مسئلہ ماہرین کے نزدیک زیرِ تصفیہ ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک انسان میں تنقیدی رجحان نہ ہو' چیزوں میں ردوانتخاب کی صلاحیت نہ ہو وہ کوئی تخلیق پیش نہیں کرسکتا۔اس طرح تخلیق سے پہلے تنقیدی شعور کارفرما دکھائی دیتا ہے۔اسی طرح تحقیق کے دوران بھی بہت سی موجود اشیاء میں صحیح چیزوں یا باتوں کا انتخاب ایک اچھے محقق کی تنقیدی صلاحیت کی نشاندہی کرتا ہے۔تحقیق وتنقید کے مابین پائے جانے والے رشتہ کے بارے میں ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

تنقید وتحقیق کو ہم معنیٰ یا ایک دوسرے کے مترادف سمجھنا یا ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق سمجھنا غلط ہے ۔اس لیے کہ بغیر تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کے تحقیق مکمل نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی تحقیق بغیر تنقیدی بصیرت کے ہے تو وہ معاشیات اور مالیات کے اعداد وشمار کی طرح ہوگی۔جس سے معنیٰ خیز نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ۔۔تحقیق بغیر تنقید کے مکمل نہیں ہے اور تنقید میں تحقیق سے بعض معنیٰ خیز نتائج رونما ہوتے ہیں''۔ [۷]

تحقیق وتنقید کے مابین اس رشتے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کامیاب محقق کے لیے ایک اچھا نقاد ہونا بھی ضروری ہے۔اُردو تحقیق کے ابتدائی نقوش میں تنقیدی شعور کی کمی پائی گئی ہے۔لیکن جیسے جیسے وسائل بڑھے اور زبان ترقی پاتی گئی تحقیق کے معیارات

میں بھی تبدیلی آئی اور تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اُردو کے محققین نے سائنٹفک انداز میں تحقیق کی اور اپنے تحقیقی کاموں میں بہت کم خامیاں چھوڑیں۔ آزادی کے بعد اُردو تحقیق میں ہونے والی پیش رفت کے بارے میں ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''آزادی کے بعد اُردو میں تحقیقی کاموں کی رفتار میں کافی اضافہ ہوا ہے اور بہت سی اہم چیزیں سامنے آتی ہیں۔ جن سے ایک طرف ادب کے سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف لوگوں کی معلومات میں۔ ان محققین میں بیشتر ایسے ہیں جو تنقید و تحقیق کو برابر اہم سمجھتے ہیں اور تنقیدی شعور کے ساتھ تحقیقی فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح تحقیق بھی تنقید کی ایک روایت بن جاتی ہے۔ ۸؎

ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق۔ تحقیقی نگارشات کا جائزہ۔ اردو شہ پارے

تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کی پہلی تصنیف ''اردو شہ پارے'' ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے دکن کے کئی ادیبوں اور شاعروں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ دکنی ادب کی تاریخ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کتاب نے اردو زبان کی تاریخی قدامت کو طوالت بخشی ہے۔ گرچہ کہ اس کتاب میں بعض خامیاں بھی ہیں بقول خود زور ''اپنے موضوع پر ابتدائی کوشش ہونے کی بنا پر اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ بعض شاعروں کے حالات میں قطعیت نہ تھی اور بعض بیانات ظن اور قیاس پر مبنی تھے''۔ لیکن اس کتاب سے ڈاکٹر زور نے دکنی تحقیقات پر نئے ادبی انکشافات کیے۔ ''اردو شہ پارے'' کے ابواب کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلے باب میں اردو ادب کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے مسعود سلمان، امیر خسرو، بہاء الدین، شاہ علی جیو گام دھنی، شیخ خوب محمد اور خواجہ بندہ نواز کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں پر ان کے کلام کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک جگہ خسرو کی زبان پر اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مسعود کی طرح خسرو کی زبان بھی مشتبہ ہے اس کے بعض شعر اس وقت موجود ہیں مگر یہ کچھ زیادہ معتبر نہیں معلوم ہوتے''۔ ۹؎

بہاء الدین باجن علی جیو گام دھنی اور شیخ خوب محمد چشتی جیسے قدیم گجراتی شعراء کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ بہمنی سلطنت کے قیام اور دکن میں اردو کی نشو و نما پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''معراج العاشقین'' کے تصنیف کو خواجہ بندہ نواز کی نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف بتایا ہے۔

دوسرے باب میں ''اردو ادب بیجاپور میں'' (۱۴۶۰ء تا ۱۶۵۶ء) کے ادبی شخصیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان

شعراء میں برہان الدین جانم، ابراہیم عادل شاہ ثانی کے آمنشی، مقیمی، امین اور نوری کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد صنعتی، کمان خان، رستمی، ملک خوشنود، دولت نصرتی، امین الدین اعلیٰ، ہاشمی، مرزا، ایاغی کے حالات بھی قلم بند کیے ہیں۔سکندر عادل شاہ کے دور کے سیوا اور مومن کے نام بھی ذکر کیے ہیں اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تیسرا باب گولکنڈہ کے شعراء پر مشتمل ہے۔اس باب میں فیروز، محمود، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، احمد، خدانما، محمد قطب شاہ شوقی، خیالی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، مقیمی، سلطان، جنیدی، ابن نشاطی، میراں یعقوب، طبعی امین، فائز، لطیف نوری شاہی مرزا اور غلام علی جیسے شعراء کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا ہے۔چوتھا باب ''اردو ادب مغلوں کے دور میں'' پر مشتمل ہے جس میں دکن اور گجرات کے شعراء جو مغلوں کے عہد میں موجود تھے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں ملکہ مصر کے شاعر عاجز ضعیفی، امین، ذوقی، بحری، عشرتی، محرومی، احمد، ولی ویلوری، اشرف اور ولی اورنگ آبادی جیسے شعراء کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''دکنی مرثیے اڈنبرا'' کے عنوان سے ہاشم علی، امامی، رضا غلامی، قادر اور نثر نگاروں میں شاہ محمد قادری اور سید شاہ میر کا ذکر کیا گیا ہے۔کتاب کا دوسرا حصہ اردو شہ پارے پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے پوری دکنی تاریخ ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔شعراء اور ان کے حالات زندگی پر ڈاکٹر زور نے سیر حاصل بحث کی ہے۔اور چند دلچسپ انکشافات بھی کیے ہیں۔

''اردو شہ پارے'' کو پورے ملک میں مقبولیت حاصل ہوئی اور ہر ایک نے اس کی پذیرائی کی۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس پر اس طرح کا تبصرہ کیا۔

خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' کو ڈاکٹر زور نے فرانسیسی زبان میں ایڈٹ کیا ہے۔یہ کتاب ستمبر ۱۹۳۳ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔اس کتاب کی تمہید فرانسیسی زبان میں ہی لکھی گئی۔اس کتاب میں دس حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ایک حکایت بطور نمونہ کلام کو سمجھنے کے لیے پیش کی جارہی ہے۔''تیسری حکایت''، ''اصلی بادشاہ'' حکایت مرتبۂ خلافت کے تحت ہے۔

جیوں محمود سو تھا سلطان
عبد ایاز تحت فرمان
اوس پیر حکم کیا کے آج
ھوں بندا توں بیس سو راج
تخت ایاز سو بیٹھیا جاے

سوے کرے جے وہ فرمائے
چل محمودین کیا سلام
کھیا کہ ھوں تجہ آج غلام
حاکم ہے محمود سو سب
جیوں سلطان عبد ھے جب
جہ محمود عبد کے شان
عشق کھے پورا سلطان
تخت ایاز سو بیتھا جانہ
حاکم تنہ محمود اس تھانہ
حکم سو اوس برکیتا جب
تخت بیس جا بیتھا تب
او نھیں قبولیا حکم تمام
تخت بیتھیں ھوا غلام
حکم سو حاکم کا اس تھانہ
ھے محکوم غلامی مانہ

تذکرہ گلزار ابراہیم

''تذکرہ گلزار ابراہیم'' ڈاکٹر زور کی ایک کامیاب تحقیقی کاوش ہے۔ جسے 1934ء میں ترتیب دے کر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو کے تحت شایع کیا گیا۔اس تذکرہ کے ساتھ تذکرہ گلشن ہند کو بھی مرتب کیا جس پر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا۔تذکرہ گلزار ابراہیم،قدیم اردو شعراء کا تذکرہ ہے جسے نواب علی ابراہیم علی خان نے 1748ء میں فارسی زبان میں لکھا۔ابراہیم پٹنہ کے ادیب و مورخ تھے۔ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے تذکرہ کا اردو ترجمہ مرزا لطف سے 1215ھ میں کرایا اور اس میں اضافے بھی کیے اور اپنے تذکرہ ''گلشن ہند'' کی بنیاد بھی اس پر رکھی۔

ڈاکٹر زور نے ''تذکرہ گلزار ابراہیم'' کو مرتب کر کے اردو کے قدیم و جدید تذکروں میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ اس تذکرہ میں 320 شعراء کا تذکرہ شامل ہے۔ ان میں سے بیشتر شعراء کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔ جیسے مرزا بیدل، تانا شاہ، ولی اللہ اشتیاق، رنگین کاشمیری، سیتارام، عمدہ کشمیری، قبول کاشمیری منشی کشن مجروح کاشمیری وغیرہ۔ یہ تمام سب 1200ھ سے قبل کے ہیں۔

سیتارام عمدہ جو سراج الدین علی خان آرزو کے معاصر تھے۔ اس کے بارے میں صاحب تذکرہ لکھتا ہے۔

کسو کے سینے میں ہرگز مراسا داغ نہ تھا
مرے چمن سا روشن کوئی چراغ نہ تھا
چمن میں کھینچ کے لائے ہیں گلزار خاں مجھ کو
وگرنہ سید چمن کا مجھے دماغ نہ تھا

اس تذکرہ میں ہندو شعراء کا بھی ذکر کیا ہے جنھیں کسی اور تذکرہ نگار نے ذکر نہیں کیا۔ رائے سرب سکھ دیو دیوانہ کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے اس کا کلام بھی نمونۃً لکھا گیا ہے۔

''دیوانہ تخلص۔ رائے سرب سکھ نام، رشتہ دار راجہ نرائن کا تھا نہایت پر گو اور وضع مغلیت پر مرتا تھا۔ دو دیوان فارسی میں اس نے لکھے ہیں اور اکثر ریختہ گو لکھنؤ کے مرزا محمد علی حسرت اور میر حیدر علی حیرآن اس کے شاگردوں میں سے ہیں ۱۲۰۴ھ بارہ سو چار ہجری میں لاچار گرم روی رام عدم میں کی اور آتش فنا پیکر وجود کو دی۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیادہ ہے۔ یہ ہندی اس کا طبع زاد ہے۔

جب نہ سب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ پرفن تھے ولے
گرمی بزم کہاں اس بت عیار بغیر
دیکھ بیمار کو ترے یہ طبیبوں نے کہا
''ہوچکی اسکو شفا شربت دیدار بغیر
جان پر اپنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لیے یار سب اغیار ہوئے
کیوں کہ دیوانہ بھلا پئے اب اس پار بغیر ۱۰

اکبر حیدری، مطالعہ زور ص ۹۲)

صاحب گلزار ابراہیم نے اپنے تذکرہ میں مستند معلومات فراہم کرنیکی کوشش کی۔ شاعروں کے تاریخی حالات اور سن و ماہ کا ذکر بھی کیا۔ میر حسن کے بارے میں وہی حالات لکھے جو انھوں نے تذکرہ لکھتے وقت لکھنو سے بھیجے تھے۔ جن شاعروں کے حالات معلوم نہ ہو سکے ان کے بارے میں صاف طور ایسا ہی لکھا مثلاً جرأت کے بارے میں ہیں:

''نامش امیر شیر علی، گوئند معاصر مرزا محمد رفیع سودا بود از دہلی بدکن رفتہ دیگر احواش معلوم نیست''۔ ۱۱

علی ابراہیم نے تذکرہ میں شعراء کے حالات زندگی، کردار اور معاشرت پر بہترین روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ تذکرہ میں مرثیہ گویوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس زمانے کی سوسائٹی اور ادبی مشاعروں پر بھی تذکرہ میں روشنی پڑتی ہے۔ علمی اور مہذب مجلسوں میں بچے جوان اور عمر رسیدہ سبھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ تعظیم و تکریم کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر زور گلزار ابراہیم سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ تمام تذکروں پر اس تذکرہ کو فوقیت دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زور گلزار ابراہیم کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''اردو شاعروں کے ان تذکروں میں سے ہے جو معلومات کی وسعت اور صحت دونوں کے لحاظ سے بدرجہ اول کے تذکرے کیے جاسکتے ہیں۔ خصوصی حالات کے مدنظر شاید ہی کوئی تذکرہ اس پر فوقیت رکھتا ہو''۔ ۱۲

تذکرہ گلزار ابراہیم ڈاکٹر زور کے بلند پایہ محقق ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ تذکرہ کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے۔

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی

''عہد عثمانی میں اردو کی ترقی'' ڈاکٹر زور کی ایک بلند پایہ تحقیقی تصنیف ہے جس میں سلطان العلوم میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد کی اردو نوازیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں عہد عثمانی میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا تذکرہ نہایت خوش اسلوبی اور شگفتہ اسلوب

میں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی اردو نوازیاں، جیسے اردو شاعروں اور انشا پردازوں کی قدر دانی، ان انجمنوں اور اداروں کی قدر افزائی جو ترقی اردو کا باعث ہیں۔ اردو رسائل و اخبارات کی امداد، جامعہ عثمانیہ کی تشکیل، دارالتالیف و تراجم کا قیام جیسے عنوانات ہیں۔ دوسرے حصہ میں سلطان العلوم کی سرپرستی کی کثرت، جیسے:

۱۔ حیدرآباد میں انفرادی کوششوں کی کثرت۔

۲۔ اجتماعی خدمات

۳۔ حیدرآباد میں اردو زبان کی اصلاح و ترقی اور بولنے والوں میں اضافہ

۴۔ حیدرآباد کے باہر دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں اردو کا استحکام و تقویت اور اس کی ہمہ گیر اثر

۵۔ ضمیمے۔ عہد عثمانی کے اُن شاعروں اور انشا پردازوں، انجمنوں اور اداروں اور اخبار رسائل کی فہرستیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں مختلف مقامات پر مندرج ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ خود ڈاکٹر زور نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت اور غیر جانبداری کے تعلق سے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ شعراء و مصنفین و مولفین اور اُن کے کارناموں، نیز علمی اداروں کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کسی طرح کی جانب داری یا مروت و مخالفت کو دخل نہیں ہے۔ اس احتیاط کے باوجود اگر کسی کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو تو مصنف قابل درگذر ہے کیونکہ وہ اپنے موجودہ ذوق اور مطالعہ کی وجہ سے انہی خیالات کے اظہار پر مجبور تھا۔ ہمعصر شاعروں اور انشا پردازوں اور ان کی تحریروں کی نسبت صحیح رائے قائم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اصل میں آنے والی نسلیں ہی اس کا قطعی فیصلہ کرسکتی ہیں مگر انھیں بھی غور و فکر کے سلسلہ میں اس کتاب جیسی ہمعصر تحریروں کا مطالعہ کرنا لازمی ہے''۔[۱۳]

اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی اور سرپرستی سے کئی انجمنیں اور ادارے اردو کی خدمت کے لیے آگے آئے اور سرگرم حصہ لینا شروع کیا۔ اعلیٰ حضرت کی دلچسپی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تخت نشینی نے ملک میں ایک نئی چہل پہل پیدا کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابنائے ملک کی خوابیدہ اور افسردہ قوتیں از سرنو بیدار اور شگفتہ ہو گئیں۔ عہد رفتہ کے آخری دور میں جو کچھ جمود پیدا ہو چلا تھا وہ ہیجان سے بدل گیا۔ محکمۂ تعلیمات کی اصلاح و ترقی کی تجاویز کا بن بن کر بگڑنا، قیام جامعہ کی تحریکات کا بار ہا ناکام رہنا، سررشتۂ علوم وفنون کی شکست و ریخت، دارالعلوم کی ترقی معکوس، حکام کی سازشیں، انگریزی اثرات اور ساتھ ہی طغیانی اور قحط کی بربادیاں۔ یہ تمام اُمور مہذب سے مہذب ملک اور اعلیٰ سے اعلیٰ دماغوں کی پستی اور ہمت شکنی کیلئے کافی ہیں! یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس جواں بخت اور جواں سال حکمراں کی تخت نشینی کے ساتھ ہی تمام ملک میں بوڑھوں میں بھی جوانی کی اُمنگیں موجوں کی طرح لہرانے لگیں اور جہاں اہل علم وفضل اور شاعروں اور انشا پردازوں کی انفرادی کوششوں میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ ابنائے ملک میں اجتماعی سرگرمیوں اور تنظیم کار کا سلیقہ بھی پیدا ہو گیا''۔[۱۴]

''عہد عثمانی میں اردو کی ترقی'' لکھ کر ڈاکٹر زور نے کئی ایک عام غلطی فہمیاں دور کر دیں جیسے اردو کے تعلق سے جو غلط فہمیاں عام ہو چکی تھیں اس کے تعلق سے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ:

''اردو کی نسبت چند سال قبل تک اپنوں اور بیگانوں سبھی کا یہ خیال تھا کہ وہ ایک نئی زبان ہے اور سو دیڑھ سو سال ہی سے (یعنے عہد شاہجہاں میں) ظہور پذیر ہوئی۔ غیروں کا تو ذکر ہی کیا ہے خود اُردو کے بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز مثلاً میر تقی میر، میر حسن، غلام ہمدانی مصحفی، قیام الدین قائم، میر امن، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی وغیرہ نے اپنی اپنی کتابوں اور تحریروں میں ولی اورنگ آبادی ہی کو اُردو کا باوا آدم قرار دیا ہے اور اردو کے

آغاز وارتقاء کے متعلق سب یہی کہتے آئے ہیں کہ وہ دہلی میں شاہجہاں کے زمانہ میں برج بھاشا زبان سے نکلی۔

یہ عجیب وغریب بات ہے کہ یہ چاروں خیال عہد عثمانی ہی کی برکات کے زیرسایہ غلط ثابت ہوئے۔اس مبارک دور میں جب اُردو کا ذوق حیدرآباد میں عام ہوگیا تو گزشتہ دس پندرہ سال سے اُردو زبان و ادب کے متعلق تحقیقات بھی شروع ہوئیں جنھوں نے یہ ثابت کردکھایا کہ:

۱۔ ولی سے دو ڈھائی سو سال پیشتر ہی سے اردو زبان میں ادبی کارناموں کا آغاز ہو چکا تھا اور بیسیوں ایسے اعلیٰ پایہ کے شاعر پیدا ہو چکے تھے جن میں کم ازکم پانچ سات ولی سے بہت بلند مرتبہ ہیں اور اردو کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے کلام کے مجموعوں سے پچاسوں اس وقت کہیں نہ کہیں موجود بھی ہیں۔

۲۔اُردو دہلی میں نہیں بنی بلکہ مسلمانوں کے دہلی فتح کرنے سے دوسو سال پیشتر سے پنجاب میں بن رہی تھی۔ چنانچہ وہاں اس میں شعروشاعری بھی کی گئی اور وہیں سے وہ دہلی میں پہنچی اور اس پر دہلی کی زبان یعنے برج بھاشا کا پورا اثر نہیں ہونے پایا تھا کہ دکن اور گجرات کی طرف نکل کھڑی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی اُردو اور پنجابی کی بہت سی لسانی خصوصیات مشترک ہیں۔

۳۔اُردو شاہجہاں کے زمانہ میں نہیں بلکہ اس سے کئی سو سال پیشتر بن چکی تھی اور شاہجہاں کی پیدائش سے قبل ہی اُس میں بیسیوں شاعر پیدا ہو چکے اور سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔

۴۔اُردو برج بھاشا سے نہیں نکلی بلکہ اُس زبان سے نکلی جو مسلمانوں کی آمد کے وقت پنجاب اور دوآبہ میں بولی جاتی تھی، اور جس نے خود برج بھاشا بھی مشتق ہے۔ یعنے اُردو برج بھاشا کی بیٹی نہیں، بہن ہے۔اگر وہ برج بھاشا سے نکلتی تو اُس میں پنجابی اور بانگڑو زبان کی متعدد اہم لسانی خصوصیات پائی نہ

جاتیں۔ اس امر کی تفصیلی بحثیں اور ثبوت ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات (انگریزی) میں مندرج ہیں۔[۱۵]

مذکورہ باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اردو کے تعلق سے چند اہم انکشافات کیے ہیں۔ اور ایک اعلیٰ تحقیقی موادفراہم کیا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب بیان بھی عام سادہ اور شستہ ہے۔ کتاب کے آخر میں تین ضمیمے دیئے گئے ہیں۔ ان شاعروں اور انشا پردازوں کی فہرست جن کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ وہ انجمنیں اور ادارے جو گزشتہ پچیس سال سے حیدرآباد میں سرگرم کار ہیں، وہ اخبارات و رسائل کی فہرست جو گزشتہ پچیس سال میں حیدرآباد میں جاری ہے۔

دکنی ادب کی تاریخ

''دکنی ادب کی تاریخ'' ڈاکٹر زور کی دکنی ادب پر ایک گراں قدر تحقیقی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۳۵۰ء تا ۱۷۵۰ء دکنی ادب کے قدیم مراکز گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے شاعروں اور ادیبوں کی چارسوسالہ تاریخ کو محیط ہے۔ کتاب کے مندرجہ جات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بہمنی عہد۔ گلبرگہ اور بیدر۔ (۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء)

۲۔ عادل شاہی عہد، بیجاپور (۱۴۹۰ء۔۱۶۸۶ء)

۳۔ قطب شاہی عہد، گولکنڈہ اور حیدرآباد (۱۵۰۸ء۔۱۶۸۷ء)

۴۔ مغل عہد، حیدرآباد اور اورنگ آباد (۱۶۸۶ء ۱۷۵۰ء)

۵۔ دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر۔

''دکنی ادب کی تاریخ'' دکن کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں میں متعارف کرانے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں بہت زیادہ طویل مباحث نہیں ہیں بلکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ پہلے باب میں عہد بہمنی کے ضمن میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔ ''دراصل اسی کے عہد (فیروز شاہ بہمنی) سے ہمیں اردو کی نثر و نظم کا پتہ چلتا ہے اور اس کا پایہ تخت گلبرگہ دکن میں اردو کا پہلا مرکز تھا۔

اس باب میں بہمنی عہد کے مشہور شعراء و مصنفین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس دور کے شاعروں میں سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز، نظامی، مشتاق، لطفی، فیروز، اشرف، شاہ میراں جی، سید

شہباز حسین۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے چند اشعار کو ذکر کیا گیا ہے جیسے:

یہ سب عالم تیرا رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوے ناخالق دوجا ہوئے
جے تیرا ہو کرم تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کا رن تجھ کو دھاؤں اور تیرا نام لیاؤں
ہے تیرانت نہ پار کس موکھوں کروں اچار

(دکنی ادب کی تاریخ ص۲۲)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی کی شاعری میں سادگی اور سلاست ہے۔ دوسرے باب میں عادل شاہی عہد کے شاعروں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس عہد کے حکمرانوں کی ادبی وثقافتی کوششوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور کے شاعروں میں برہان الدین جانم، قطب زاری، مرزا مقیم استرآبادی، حسن شوقی، امین، صنعتی، ملک خوشنود، نصرتی، ہاشمی اور شغلی وغیرہ کے حالات زندگی اور ان کی نظم ونثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں قطب شاہی عہد کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قطب شاہی دور دکن میں اور زبان و ادب کے فروغ میں امتیازی مقام کا حامل ہے۔ سلاطین قطب شاہی میں بعض خود اچھے شاعر اور اصحاب علم کے قدردان تھے۔ ڈاکٹر زور نے قطب شاہی عہد کو تینوں حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) ابتدائی کوششیں جو ۱۵۰۸ء سے ۱۵۸۰ء کے درمیان ہوئیں۔

عروج کا زمانہ جو ۱۵۸۰ سے ۱۶۷۲ء تک کا رہا۔

دور انتشار جو ۱۶۷۲ء سے ۱۶۸۷ء پر ختم ہوتا ہے۔

ابتدائی دور میں گولکنڈہ کے چار بادشاہ سلطان قلی، جمشید قلی، سبحان قلی اور ابراہیم قلی کے دور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بقول زور ان چاروں بادشاہوں کے دور میں اردو زبان وادب کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہوسکا کیوں کہ یہ لوگ زیادہ استحکام حکومت میں مصروف تھے۔ جمشید فارسی کا شاعر تھا۔ ابراہیم شاعر نے وجیانگرم میں سات سال تک پناہ گزین ہونے کی بناء پر تلنگی شاعروں کی سرپرستی زیادہ تر کی۔ اس دور کے شعراء میں ملا خیالی، سید محمود، فیروز کو خاص مقیم حاصل ہے۔ اگر چہ کہ ملا خیالی اور سید محمود کا کلام دستیاب نہ ہوسکا لیکن انھیں اچھا شاعر مانا گیا ہے۔ فیروز کے تعلق سے وجہی

نے اپنے کلام میں مدح سرائی کی ہے۔

عروج کا زمانہ:

قطب شاہی سلطنت کا عروج کا دور (۱۵۸۰ء تا ۱۶۷۲ء) پر محیط ہے۔اس دور کے شعراء میں بلند مقام حاصل کرنے والے شاعر محمد قلی قطب شاہ، وجہی، سلطان محمد قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی، ملک خوشنود، جنیدی، شاہ راجو، حسن خداوند خدانما وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔اس نے فارسی، اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں اس نے شاعری کی۔لیکن اس کا پورا کلام محفوظ نہیں ہے۔اس کے دوران میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے، مرثیے اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔اس نے اپنے عہد کی عام زندگی، رسم و رواج، تہواروں اور تقریبوں، موسموں کی تفصیلات فراہم کیں۔ بقول زور اس کی غزلیں سادگی اور لطافت کے اعتبار سے حافظ کی غزلوں سے ملتی جلتی ہیں۔اس کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔ برسات کی آمد کے موقع پر بڑی عمدہ نظر کہی ہے۔

پلا ساقی سے ہور خوشی سیتی تاچ
ہوا سبز و خرم ہوا جیسا پاچ
تمن شوق کا نینتھے مینھ چوے
اے باتاں نہیں جھوٹ تم دیکھو ساچ
کہو وا کہ جھاڑاں کوں میرا سلام
تمن آرزو دل ہوا شیشہ کاچ
خوشی شادی سے تیں ہمن بزم میں
صراحیاں اُپر ساقی پیالاں کوں راچ
جلاد سپند تانہ لاگے نظر
دو تن آگ میں تم پکادو کماچ
معانی علی دم تھے خوش ہے ہوا
کہو مطیر باں کوں بجاد کماچ

ڈاکٹر زور نے بہت ہی اختصار کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

ملا وجہی قطب شاہی عہد کا سب سے بڑا اور باکمال شاعر سمجھا جاتا ہے۔اس نے قطب مشتری ۱۶۰۹ء ۱۰۱۸ھ میں لکھی جس میں بادشاہ وقت محمد قلی قطب شاہ کی بھاگ متی کے ساتھ عشق کی داستان استعارے کے پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ڈاکٹر زور وجہی کے کلام اور قطب مشتری کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

''یہ کتاب اپنے دلکش اسلوب اور اعلیٰ تخیل کی وجہ سے قدیم اردو کی بہترین کتابوں میں سمجھی جاتی ہے۔اس کے دیباچہ میں وجہی نے اس طرح اپنے کلام کی بڑائی ظاہر کی ہے:

نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں
سو طوطی منجھ ایسا ہندوستان میں
کہ باتان یہ سُن کر مری گیان کیاں
رہیاں تھک ہو طوطیاں خراسانکیاں
چتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے
سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے

[۱۶]

قطب مشتری کے علاوہ وجہی نے سب رس ۱۶۳۴ء ۱۰۴۵ھ میں لکھا۔

بقول زور وجہی گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعراء تھا اور اس کے زمانہ میں دکن میں اتنے ادیب اور شاعر پیدا ہو چکے تھے کہ اس نے اپنے وطن کے متعلق یہ فخریہ شعر لکھے تھے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
بچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کو حرمت نگینہ ہی لگ
دکھن ملک کھن دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سرہور دکن تاج ہے
دکھن ملک بہو تیج خاصہ اہے

تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

وجہی کے بعد ڈاکٹر زور نے ملا احمد کا ذکر کیا ہے۔اس کی دو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔قصۂ لیلیٰ مجنوں (۱۶۰۰ء) اور احوال مصیبت اہل بیت۔ابن نشاطی نے پھول پن میں اس کے کلام کی تعریف کی ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ وہ ''شاعری سے زیادہ علم وفضل کا دلدادہ تھا اس کو کتابیں جمع اور اس کو پڑھ کر رائے ظاہر کرنے کا شوق تھا۔اس نے محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی جمع کیا اور اس کو ترتیب بھی دیا اور ایک طویل منظوم دیباچہ بھی لکھا۔وہ ظل اللہ تخلص کرتا تھا۔اس کا مکمل کلیات دستیاب نہ ہوسکا۔''

قطب شاہی سلطنت کا ایک اور اہم شاعر غواصی تھا۔اس کی مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال ۱۶۲۴ء میں لکھی گئی۔اس کی ایک اور مثنوی ''طوطی نامہ'' عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۶۳۹ء میں لکھی گئی۔ڈاکٹر زور اس کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ غواصی اصل میں قصیدہ گو شاعر تھا اور گولکنڈہ کے کسی اور شاعر کے اس پایہ کے قصیدہ موجود نہیں ہیں۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی اردو اور فارسی کا ایک اچھا شاعر اور ماہر موسیقی تھا۔اس کا دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ اس نے بھی کئی موضوعات پر شاعری کی۔ایک کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

بسنت آیا پھلیا پھول لا لہ
سکھی لیا اب صراحی ہور پیالہ
چمن میانے پھلیا ہے پھول رنگرنگ
نپٹ نازک ایکس تے ایک آلہ
لڑاں جھاڑاں کی پیڑاں میانے بھرتیاں
جھڑی پکڑے ہیں پانی کا جوالا
ہوا مد پینے کا آیا ہے پیارے
تو مد پینے کو من کرتا اُلا لا

ابن نشاطی بھی اس دور کا ایک اہم شاعر تھا۔اس کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ:

''ابن نشاطی دراصل ایک صاحب ذوق انشا پرداز تھا اور شاعری اور سخن گستری اس کا پیشہ نہیں تھا۔وجہی یا غواصی کے برعکس اس کو شاہی دربار سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا عوامی شاعر تھا اور دربار سے

زیادہ عوام ہی میں اس کو شہرت نصیب ہوئی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

حضوریاں میں مرا گر سلک اچھتا
گہر ریز اس تے میرا کلک اچھتا
فراغت اس تے گرتک منج کوں ہوتا
لے موتیاں خوب میں اس تے پروتا
بڑیاں کے ناوا چھتا تو بڑا پن
مسیحا کا دکھاتا بات میں فن
زمانہ نا سمج کر قدر میرا
بچھایا بے دلی سوں صدر میرا۱۷

ان شاعروں کے علاوہ ڈاکٹر زور نے قطبی، سلطان، سید بلاقی، شاہ راجو، عابد، حسن خداوند خدانما اور میراں یعقوب کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔ میراں یعقوب کی نثر کا نمونہ بھی پیش کیا تا کہ قطب شاہی عہد کی زبان سے آشنائی ہو سکے۔ میراں یعقوب کے اسلوب نثر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نثر کا نمونہ پیش کیا ہے۔

''موحداں کے پیشوا۔ مرید کے دستگیر، طالباں کے رہنما، بوجہار، علم لدنی کے۔ سوچہارے حقیقتاں دین ودنیا کے۔ پیر پیراں سید میراں چشتی قدس اللہ سرہ کی خدمت میں پایا۔ ہور باطن کے عالم تھے ظاہر کے عالم میں لیایا۔ ہمیشہ ان کی عنایت کی نظر سوں پرورش پاتا تھا ہور دن دن اس شعور ہور اس ہوش میں آتا تھا۔ جب بلوغت میں آکر دست بیعت نعمت پایا۔ تب ارشاد وتلقین کی لذت سوں اگھایا۔ شریعت طریقت کے وضع وضع کے مزے چکھائے ہور معرفت وحقیقت کے جنس جنس کے تماشے دکھائے''۔۱۸

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی عہد میں اردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔

قطب شاہی عہد کا دور انتشار ۱۶۷۲ء سے ۱۶۸۷ء پر مشتمل ہے۔ کیوں کہ اورنگ زیب کے دکن پر حملہ کی وجہ سے انتشار کا دور تھا۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ۱۶۶۶ء میں اورنگ زیب سے جو صلح ہوئی وہ دراصل قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے ایک نئی مہر ''ختم بالخیر والسعادۃ'' بنالی تھی یعنی سلطنت کا خاتمہ خیر وخوبی سے ہو گیا

ہے۔اورنگ زیب کے سفیر ہر معاملہ میں دخل اندازی کرتے اور اپنا حکم چلاتے جس سے قطب شاہی سلاطین کی آزادی سلب ہوچکی تھی۔جس کے نتیجہ میں ادباء وشعراء اور فن کاروں کی جودت اور بے باکی ختم ہوگئی اور وہ قصیدہ مثنوی اور غزل جیسے اصناف پر طبع آزمائی چھوڑ زیادہ تر مذہبی تصنیف وتالیف اور مرثیہ نگاری کی طرف مسائل ہوگیے۔اور وہ دکن کے واقعات کو کربلا کے واقعات سے نسبت دینے لگے۔

ان مرثیہ گوشاعروں میں روحی، ہاشم علی، نادر، ضعیفی، عشرتی، ذوقی، وجدی اور ولی ویلوری، قادری، بیچارہ، آزاد والہ، عاشق، اشرف، قراقی، ندیم حسینی، امامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر زور نے ان کی ادبی خدمات اور حیات کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔مغل عہد میں (۱۶۸۶ء تا ۱۷۵۰ء) کے ضمن میں اس دور کے شعراء کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فاتح دکن شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات وخیالات کو صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لیے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنالیا اور اپنے غمزدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکالی۔ یہ واقعہ یہاں بطور خاص قابل ذکر ہے کہ اہل حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ ابوالحسن کے آٹھ ماہ تک محصور رہنے اور جرأت وشجاعت کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کے شریفانہ عادات اور تصوف وعرفان سے لگاؤ کی بنا پر اس کو حضرت امام حسین مظلوم سے تشبیہ دینے لگے تھے۔ چنانچہ اس شہر کے ایک بہادر سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے اورنگ زیب کو یہ جواب دیا تھا:
>
> ''ایں جنگ بلاتشبیہ بجنگ کربلامی ماند۔عبدالرزاق لاری امیدوار است کہ تانفس باقی ست درزمرہ کسانے کے اول یا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام بیعت نمودہ آخر تیغ بر روئے آں شہید کربلا کشیدند در نیاید بلکہ منجملہ ہفتاد دوتن سرخروئی دنیاوآخرت حاصل نماید''۔۱۹

روحی کے چند اشعار بطور نمونہ بھی ذکر کیا ہے:

آج غم ناک ہیں چمن کے گل

بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں
نرگس و لالہ یا سمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں
لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا
سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل

ڈاکٹر زور نے اورنگ زیب کے دور کے ایک اہم شاعر سید ولی محمد ولی اورنگ آبادی کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس کے تعلق سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کو گل سرسبد سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے کلام کو اورنگ زیب کے قیام دکن کا قابل فخر نتیجہ کیا۔ ولی کے دلی کے سفر کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے شمالی کے شعراء پر دکن کلام کے اثر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہ دور دراصل ایک دورِ انتشار تھا۔ چنانچہ اس عہد کے اکثر دکنی شعراء بحرؔی، آزاد، فراقؔی، وجدؔی، نورؔی، امامؔی، رحمانؔ وغیرہ برابر حرکت میں رہے اور ان میں سے اکثروں نے دلی کی بھی سیر و سیاحت کی۔ چنانچہ ولؔی نے بھی دلی کا سفر کیا اور وہاں کے مشاعروں میں اپنا دکنی کلام سنا کر وہاں کے شاعروں کو اتنا مسحور کیا کہ وہ اردو میں لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ اس وقت تک وہاں یہ زبان صرف بازاری سمجھی جاتی تھی اور علمی و ادبی محفلوں میں اس وقت تک اس کو جگہ نہ مل سکی تھی۔ ولؔی کی شخصیت اور ان کے دیوان کی مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ شعرائے دلی نے فارسی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر اردو میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ حاتم، مظہر، آبرو، ناجی اور فغاں وہ شعرائے دہلی ہیں جنھوں نے ولؔی کا کلام خود ان کی زبان سے سنا اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور اپنے کلام کے لیے وہی محاورہ اور زبان اختیار کی جو ولؔی نے استعمال کی تھی''۔ ۲۰

ڈاکٹر زور ولؔی کی زبان اور اسلوب بیان کا جائزہ لیتے ہوئے مثنوی سورت کے چند اشعار تلمیذ کیے ہیں۔

عجب شہراں میں ہے پُرنور یک شہر

بلاشک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور
اچھوں اس نورسوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب
ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب
عجب قلعہ ہے وہاں اک باقرینہ
انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ
فرنگی اس میں اتے ہیں کلہ پوش
عدد وہاں جن کی گنتی میں ہے بیہوش

دکنی ادب کی تاریخ کا آخری باب ''دکھنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر''۔

اورنگ زیب کے فتح دکن کے بعد دکن کا علاقہ مغلیہ سلطنت میں ضم ہوگیا۔شمالی اور دکن کے لوگوں کو اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا۔ بقول زور شمال والوں نے محسوس کیا کہ وہ ادبی کام میں دکن سے بہت پیچھے ہیں۔ کیوں کہ وہاں کوئی بھی بول چال کی زبان میں شاعری نہیں کی اور جو ایک دو مثالیں ہیں انھیں قدیم تذکرہ نویس شاعری کا نمونہ نہیں سمجھتے تھے۔فطرت اور جعفر زٹلی کے کلام میں چند ایسے نمونے ملتے ہیں جن پر دکھنی اردو کا اثر ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس آخری باب میں شمالی ہند کے شاعروں پر دکھنی کلام کے اثرات کا بہت باریک بینی اور شعراء کے کلام کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔شمالی ہند کے شعراء نے کس طرح دکھنی اثر قبول کیا اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شمال والوں نے جب دیکھا کہ دکن میں مدت سے اردو شاعری کا ذوق ترقی کر چکا ہے تو وہ دکھنی ادب سے متاثر ہوگئے اور چونکہ اس اثناء میں وہ فارسی شاعری کی تقلید سے اکتا گئے تھے۔ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے انھیں خاصی محنتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلہ میں خود کو کمزور پاتے تھے۔ ساتھ ہی چونکہ فارسی انکی اپنی

زبان دری تھی۔ وہ اپنی طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے۔ انھیں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں ایرانی استادان کی زبان کو غلط نہ قرار دیں۔ چنانچہ اس زمانے میں محاوروں وغیرہ کے استعمال پر اکثر ایرانی اور ہندوستانی شاعروں میں جھگڑے رہتے تھے جن کی مثالیں قدیم تذکروں میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ خود حکمران شاعر نہیں تھے اور نہ سیاسی کمزوریوں کی وجہ سے شاعروں کی قدر کرنے کے قابل تھے۔ اگر اکبر کے چند درباری امیروں کی طرح اورنگ زیب اور اس کے بعد کے امیر فارسی شاعروں کی خاطر خواہ قدر کرتے تو بہت ممکن تھا کہ فارسی پھر کچھ زمانے کے لیے چل نکلتی۔

اس کے علاوہ چونکہ فارسی میں ہندوستانی شاعروں کے لیے خیالات ادا کرنے کے نئے نئے طریقے مسدود تھے اور اس کے علاوہ اس میں اپنی مقامی خصوصیات اور فطری حالات کو بے دھڑک ظاہر کرنا معیوب سمجھتے تھے اس لیے وہ فطرتاً کسی ایسی چیز کے متلاشی تھے جس کے ذریعہ سے وہ بے تکلفی کے ساتھ اپنے مطالب ادا کر سکیں۔

غرض جب انھوں نے دکھنی اردو کا مطالعہ کیا جو اُن کے لیے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جن کے ذریعہ سے ان کی تمام ادبی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں تو فارسی کو چھوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس سے اس قدر بیزار ہو گئے اور اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا کہ جب سوداؔ یا میرؔ جیسا کوئی بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ وہ اپنے رتبے سے اتر کر یہ کام کر رہا ہے۔ [۲۱]

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعراء نے دکنی زبان میں شعر کہنے کی کئی وجوہات تھیں جن میں سے ایرانی شاعری کی برتری، فارسی شاعری کا ختم ہونا اہم ہیں۔

لیکن دہلی کے شاعروں کا یہ رجحان زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ کیوں کہ دکھنی بھی فارسی زبان کی طرح ان کے لیے اجنبی تھی۔ یہاں بھی انھیں تکلف کا احساس ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مادری اور بول چال کی زبان میں فارسی اجزاء ملا کر شاعری کرنا شروع کیا اور اس میں کامیاب ہو گیے اور بہت جلد انھوں نے اردوئے معلیٰ کی زبان میں شعر و شاعری شروع کی اور اس کی ترقی ناسخ کے زمانے تک جاری رہی۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ شمال والوں کو دکھنی اثر کے زائل کرنے میں جلد کامیابی اس لیے ملی کہ انھیں میر، سودا اور قائم جیسے شاعر ملے جو روزمرہ کی بول چال کی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ آخر میں سودا، میر اور قایم کے کلام کے مختصر نمونے درج کیے گیے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی یہ ادبی تاریخ ایک طویل دکنی عہد پر مشتمل ہونے کے باوجود مختصر اور جامع ہے۔ صرف ضروری معلومات پیش کرنے کی ایک کوشش ہے اور یہ کوشش محققین اور اساتذہ فن کے لیے نہیں بلکہ عام لوگوں کے لیے جو دکنی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرنا چاہیں ان کے لیے اہم ہے۔ ڈاکٹر زور اس تعلق سے کہتے ہیں:

> ''میں اپنی اس چھوٹی سی کتاب کو دکنی ادب کی تاریخ پر حرف آخر نہیں سمجھتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے ذریعہ سے اس خطۂ ملک کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں میں متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے''۔[۲۲]

طالب و موہنی

ڈاکٹر زور کو اپنے ہم عصروں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے دکن کے اردو ادب کا ایک بڑا حصہ تلف ہونے سے بچالیا اور اپنی تحقیق کے ذریعہ دکنی شعراء کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر اردو دنیا میں روشناس کرایا۔ ان کے اسی کوششوں کا نتیجہ ''طالب و موہنی'' بھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو ۱۹۵۷ء میں ادارہ ادبیات اردو سے شایع کرایا۔ ''طالب و موہنی'' دراصل مہاراشٹرا کے ایک تاریخی شہر پرینڈہ کی پرانی داستان عشق ہے جس کو سید محمد والہ موسوی نے ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء سے قبل منظوم کیا تھا۔

سید محمد والہ، سید محمد باقر موسوی خراسانی کے فرزند تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے وطن و شہر قم سے نکال کر لاہور ہوتے ہوئے دِلّی پہونچے۔ دلی میں شاہ عالم بہادر نے انھیں اپنے شاہی منصب داروں میں شامل کرلیا۔ نظام الملک آصفجاہ کو ان کے علم و فضل سے واقفیت ہوئی تو ان کو اپنے ساتھ دکن لے آئے۔ آصفجاہ نے جب انورالدین خاں

شہامت جنگ کو حیدرآباد کا ناظم مقرر کیا تو والہ کو بھی ان کا رفیق مقرر کیا اور حیدرآباد میں تعینات کر دیا۔ چند سال بعد آصفجاہ نے نواب انورالدین خاں کو ارکاٹ کا صوبہ دار مقرر کیا تو والہ کو بھی ان کے ہمراہ ارکاٹ میں متعین کر دیا۔ پھر جب محمد علی خاں والا جاہ ان کے والد انورالدین خاں نے ترچناپلی کی حکومت تفویض کی تو والہ کو ان کا نائب مقرر کرنے کے لیے ترچناپلی کو روانہ کر دیا۔ والہ نے باقی زندگی وہیں بسر کی۔ ۲۸ سال کے قیام کے بعد ۱۱۸۲ھ ۱۷۷۰ء میں وہیں وفات پائی۔

سید محمد والہ موسوی اپنے عہد کے بہت بڑے مصنف، شاعر اور انشا پرداز اور نقاد تھے۔ مختلف علوم وفنون میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور ایک اچھے خطاط بھی تھے۔

والہ کے تعلق سے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

> والہ ایک مرنج و مرنجان ادیب و شاعر تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبول تھے۔ صوفی مشربی اور زندہ دلی کی وجہ سے ہم عصروں میں ممتاز اور ہردلعزیز رہے۔ اکثر شاعر اور ادیب ان سے فیض یاب ہوئے اور مدراس میں ان کے تلامذہ کے سلسلے دور دور تک پھیل گئے۔ ان کے حالات متعدد تذکروں مثلاً تحفۃ الشعراء (۱۱۶۶)، گلدستۂ کرناٹک، گلزار اعظم، مدراس میں اردو، یورپ میں دکنی مخطوطات، محبوب الزمن جلد دوم، اردوئے قدیم، عثمان نامہ وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ایک مختصر سا رسالہ ان کے حالات میں الگ بھی وشائع کیا تھا۔ ۲۳

ڈاکٹر زور نے والہ کی حسب ذیل تصانیف اور ان کے موضوعات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

۱۔ دستور نظم: ۱۱۴۰ھ میں بمقام حیدرآباد علم عروض کے موضوع پر لکھی گئی۔

۲۔ اساس الایمان: ۱۱۴۵ھ میں بمقام حیدرآباد کی گئی اس کتاب میں دوازدہ ائمہ معصومین کے حالات لکھے گئے ہیں اس میں ۲۴ ہزار اشعار قلم بند کیے گیے ہیں۔

۳۔ قانون چہ انشاء: فن انشاء کے اصول وقواعد پر مختصر رسالہ ہے۔

۴۔ کشف الرموز: تصوف کے موضوع پر خواجہ بندہ نواز کے کلام کی تشریح وتوضیح ہے۔

۵۔ درمکتوم: نعمت خاں عالی نے کامگار خان کی شادی سے متعلق اکیس شعر کا ہزلیہ لکھا تھا والہ نے اس قطعہ کی شرح

کی ہے۔

۶۔ عین تماشا یعنی مرغ نامہ: اس میں مرغوں کی اقسام و پرورش کے موضوع پر ہے۔

۷۔ کبوتر نامہ: اس میں کبوتروں کی نسبت معلومات ہیں۔

۸۔ نجم الھدیٰ: تصوف اور سلاک و ہدایات کے متعلق مثنوی مولانا روم کی بحر میں ایک ضخیم کتاب ہے۔

۹۔ گلستان خیال: یہ ایک دیوان ہے جس میں قصیدے، مخمس، رباعیاں اور جملہ اصناف سخن موجود ہیں۔

۱۰۔ رازق باری: یہ مثنوی ہے جو تعلیم اطفال کے موضوع سے متعلق ہے۔ لیکن والہ کی تالیف ہونے کے متعلق ڈاکٹر زور نے شبہ ظاہر کرتے ہوئے تحقیق کی ضرورت ہے لکھا ہے۔

ڈاکٹر زور مثنوی طالب و موہنی کی اشاعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> اس مثنوی طالب و موہنی کی اشاعت سے قدیم اردو کے محققین کو بحث و تحقیق کے لیے ایک نیا موضوع دستیاب ہوگا اور جہاں ابن نشاطی کی پھولبن سے اس کا مقابلہ کیا جا سکے گا، میر تقی میرؔ کی دریائے عشق سے بھی اس کا موازنہ ہو سکے گا جو اسی کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ حسن اتفاق سے یہ دونوں پہلے ہی چھپ چکی ہیں اور اب طالب و موہنی کے چھپ جانے سے زنجیر کی سب کڑیاں مربوط ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک درمیانی کڑی تھی جو اب تک نظروں سے اوجھل تھی۔ اس کی اشاعت سے میرؔ کی دریائے عشق کا سلسلہ ابن نشاطی کی پھولبن تک پہنچ جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو ادب اور زبان کا ارتقاء زماں و مکاں کی دوریوں کے باوجود فطری مدارج سے گزرتا رہا ہے۔[۲۴]

مثنوی کے آغاز سے قبل ڈاکٹر زور نے والہ کی سوانح حیات، تصانیف، مثنوی کی تفصیلات و خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ طالب و موہنی ۱۱۵۰ء کے قریبی زمانہ میں حیدرآباد میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر زور لسانی نقطۂ نظر سے مثنوی کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''لسانی نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ والہؔ نے یہ مثنوی ٹھیٹ دکنی زبان میں نہیں کہی ہے بلکہ اردو، فارسی اور دکنی کو ملا کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

بچن کا ایک نیا شیوہ دکھایا
ہندی اور فارسی دکھنی ملایا
یہ مالا گردنِ دانشق کا ہے ہار
مجھے ہے جیت اس فن میں نہیں ہار

حقیقت یہ ہے کہ والؔہ نے شمالی ہند کے دوران قیام میں اردو سیکھ لی تھی اور دکن میں آنے کے بعد دکنی سے واقف ہو چکے تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ اس طرح تینوں زبانوں کو ملا کر یہ قصہ لکھا ہے لیکن نہ تو یہ ٹھیٹ اردو ہی ہے اور نہ ٹھیٹ دکنی بلکہ ایک درمیانی زبان ہے اور اس عبوری دور میں ایسی ہی زبان میں ایک نو وارد ایرانی شاعر لکھ سکتا ہے''۔ ۲۵

اس طرح اس مثنوی میں طرز املا بھی الگ ہے۔ اس میں گ کو ک ہی لکھا گیا ہے اور ہائے مجہول (ے) اور ہائے معروف (ی) کا خیال نہیں رکھا گیا ہے جیسے گردن کو کردن اور دھونی کو دھونے وغیرہ۔

حروف علت کے اظہار کے لیے و اور ی ا استعمال کیا گیا ہے۔ بلایا کے بجائے بولایا ضمیر وہ کے لیے وو اور ہائے مخلوط اور ہائے ہوز کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے جیسے چھبیلی کو چھبیلی اور کھانا کو کہانا ہی لکھا گیا ہے۔

اس مثنوی میں کل ۱۰۵۵۔ ابیات ہیں۔

صاحب مثنوی والہ، ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی مثنوی میں پند و نصائح کے باب میں باندھے ہی ایک مقام پر نیکی اور برائی کے تعلق سے لکھتے ہوئے محاوروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

جہاں میں جس کی نعمت بے مزا ہے
عمل جیسا کرے ویسی سزا ہے
بدی یاوے بدی پر کر چلے توں
کتے یک ہات دے یک ہات لے توں
بھلی کہتی بھلی ہے کچھ بھلائی
برے میں دستی ہے ساری بورائی
بدی کے باغ میں نارنگ نا بو

بھلا منگتا بھلائی کا تخم بو
بدی عاقل کے آگے مرتدی ہے
نکوئی نیک را بد را بدی ہے

والہ کو منظر نگاری پر بھرپور عبور حاصل تھا۔ جس سے ان کی استادِ سخن ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ صبح اور شام کی منظر نگاری کی خوبیاں ملاحظہ ہوں:

گل صد برگ سورج کا گگن میں
کھلا روشن تہار یا سمن میں
چلائے تیر گرما کی جھلک نے
انگیٹھی گرم سلگائی فلک نے
جہاں ڈالا اس انگیٹھی نے سایہ
زمیں کو گاو ماہی تک جلایا

مثنوی طالب و موہنی میں دکھنی میں ہندی اور فارسی کی آمیزش ہے۔ مثنوی کے اختتام میں اس بات کو ظاہر بھی کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں:

یہ بزم عشق والہ نے سنوارا
نوائے سوز کا ڈالا پکارا
بچن کا یک نواشیوہ دکھایا
ہندی اور فارسی دکھنی ملایا

مثنوی طالب و موہنی قدیم دکھنی زبان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ

''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ''، ڈاکٹر زور کی سب اہم تحقیقی تصنیف ہے۔ سلطنت گولکنڈہ کے پانچویں حکمراں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی تدوین ہے۔ ڈاکٹر زور نے یہ کلیات کتب خانہ سالار جنگ کے مخزونہ کلیات محمد قلی کے دو مخطوطوں نیز اسی کتب خانہ میں محفوظ ایک قدیم نسخے کے چیدہ چیدہ اوراق اور پروفیسر آغا حیدر حسن

کے کتب خانے میں موجود اس کلیات کے ایک اور نسخے کی مدد سے مرتب کیا۔ اس نسخے کے علاوہ انھوں نے کتب خانہ آصفیہ میں موجود نسخے کا بھی حوالہ دیا ہے جو انھیں دستیاب نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر زور نے کلیات قلی میں ایک وقیع علمی مقدمہ تحریر کیا ہے جو تین سو پچیس صفحات پر مشتمل ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' کی تدوین ڈاکٹر زورؔ کا ایک یادگار عملی کارنامہ ہے۔ ولیؔ کو اردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا تھا اور وہ اردو شاعری کے باوا آدم کہلاتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے ''رسالہ اُردو'' ۱۹۲۲ء میں محمد قلی کی شاعری پر ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا لیکن اس اولین شاعر کے مفصل حالات زندگی اور شاعری پر ایک مبسوط کتاب تحریر کر کے عوام سے اسے روشناس کروانے کا اہم عام کام ڈاکٹر زورؔ نے انجام دیا۔ ایک ضخیم مقدمہ لکھ کر ڈاکٹر زورؔ نے اس عہد کے تاریخی و ثقافتی پس منظر اور قطب شاہی سلطنت کے تمدن کو ہمیشہ کے لیے ادب کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔ ۲۶

ڈاکٹر زور نے یہ کلیات کتب خانہ سالار جنگ کے دونوں نسخوں اور عبدالمجید صدیقی ڈاکٹر زور کے اس کارنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ کلیات دکنی زبان کا شاہکار ہے۔ اس میں آندھرا پردیش کی سیاست و معاشرت کی حسین تصویریں موجود ہیں اور اگر اس کلیات کو آندھرا پردیش کی زندگی کا مرقع کہیں تو بیجا نہ ہوگا''۔ ۲۷

ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اس دور کے ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد قلی کے کلام کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ چار سو سال سے زیادہ قدیم کلام کو سمجھنے کے لیے قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی قلمبند کر دی ہے جس سے محمد قلی قطب کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ محمد قلی دکن میں مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والا پہلا شاعر تھا۔ اس کی کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویاں مرثیے اور رباعیاں موجود ہیں۔ اس نے اپنے عہد کی سماجی اور ثقافتی ماحول کی نمائندگی کی۔ ڈاکٹر زور نے تدوین و ترتیب کے دوران مختلف موضوعات پر کہی ہوئی نظموں کو موضوع کی نسبت سے سرخیاں دے کر انھیں خوبصورت انداز میں ترتیب دیا ہے جس سے ہر موضوع پر کہی ہوئی تمام نظمیں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' ڈاکٹر زور کا ایک اہم تحقیقی و تدوینی کارنامہ ہے۔ جس سے ان کی تحقیقی و ترتیب متن کی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ اس کلیات کا مقدمہ بھی بہت ہی وقیع ہے۔ جس کے مطالعہ کے بغیر دکنی اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ تین حصوں پر مبنی ہے۔ پہلے حصہ میں ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ۲۲۰ نظمیں اور ۱۶۳۹ اشعار ہیں۔ دوسرے حصہ میں ۲۹۶ صفحات میں ۳۱۲ غزلیں ۱۲۲۵۴ اشعار ہیں۔ تیسرے حصہ میں دیگر اصناف سخن یعنی قصائد، رباعیات، مراثی، ریختی اور مثنویاں ۱۳۸۹ اشعار میں کہی گئی ہیں۔ ڈاکٹر زور کے مقدمے سے ان کی تحقیق وتنقید اور ان کی بلند پروازی اور وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے۔ اردو ادب کی کتابوں میں جتنے مقدمے لکھے گیے ان میں ڈاکٹر زور کے مقدمہ کو مبسوط مربوط اور سیر حاصل کہا جاسکتا ہے۔ اس مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے شاعر کے تمام زندگی کے پہلوؤں کو حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ مقدمہ میں قلی قطب شاہی کی شاعری کو الہامی تک کہہ دیا ہے۔ گرچہ کے یہ مبالغہ ہے لیکن اس اقتباس سے ان کی شاعر سے والہانہ لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔

> ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا تھا کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس اور دیوان غالب۔'' لیکن اگر وہ عرش آشیانی محمد قلی قطب شاہ معانی کی کلیات دیکھ پاتے تو اس قطعیت کے ساتھ آج دعویٰ کرنے کی جرأت نہ کرتے واقعہ یہ ہے کہ آج سے ٹھیک تین سو سال پیشتر اردو زبان ایک ایسے رفیع المرتبت شاعر کے نغموں سے مالا پایہ ہورہی تھی، جس کا لاثانی کلام بجنوری مرحوم کے نقطۂ نظر سے صحیح بعنوی کوئی میں الہامی کہا جاسکتا ہے۔ ۲۸

ڈاکٹر زور نے اس مقدمے کے ذریعہ صاحب طرز انشا پرداز ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ ان کا اسلوب بیان بڑا دلچسپ اور حسین ہے۔ ان کے زبان و بیان میں جوش، روانی، سلاست اور الفاظ پر حاکمانہ قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے درجہ ذیل اقتباس کافی ہوگا۔

> ''محمد قلی کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس میں اس نے اپنا کمال دکھایا ہو اور نہ کوئی ایسا موضوع ہوگا جس پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ قصیدے اور مثنویاں مرثئے و رباعیاں غزلیں اور قطعات غرض ہر صنف سخن کے وافر نمونے محمد قلی اعظم کی کلیات میں موجود ہیں۔

عاشقانہ مضامین، عارفانہ نکات، شاہی لوازم، درباری شان وشکوہ محلات کی رنگینیاں، باغوں کی سرسبزی وشادابی کے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان شاعر کے کلام میں غریبوں کی زندگی، عوام کے معتقدات، عیدوں اور تہواروں، کھیل کود اور تماشوں، بازاروں اور بیوپاروں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عام رسموں اور رواجوں کی جھلکیں بھی جگہ جگہ نظر سے گزرتی ہیں۔ اس نے ایسے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جن پر عام شاعروں کی نظر تک نہیں پڑتی۔ وہ ایسی پتے کی باتیں لکھ جاتا ہے کہ پڑھنے والے حیران رہ جاتے ہیں کہ اس قدر قدیم زمانے میں ایک بادشاہ کا مشاہدہ اتنا وسیع اور گہرا کیسے ہوسکتا تھا اس لیے تو محمد قلی عرش آشیانی کا کلام الہامی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ ایسی ایسی خصوصیتوں کا بھی حامل ہے جو گزشتہ تین سو سال سے متروک ہیں اور اب پھر اردو ادب میں رواج پارہی ہیں۔ نچرل شاعری کے متعدد بیش بہا نمونے اس خزانے میں موجود ہیں۔ مستقل موضوعوں پر اس بادشاہ شاعر نے سینکڑوں دلچسپ اور بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ اس کی زبان میں ایسی شیرینی اور حلاوت ہے کہ اصل میں اگر کوئی زبان ہندوستانی کہلائی جاسکتی ہے تو وہ اس شاعر اعظم کی زبان ہے اس میں نہ عربی و فارسی کا عنصر زیادہ ہے اور نہ سنسکرت کا اس کا اسلوب اتنا سادہ، سلیس اور رنگین ہے کہ ہر شخص اس کے کلام کو پڑھ کر محظوظ ہوسکتا۔ اگر چند ایسے لفظ بدل دیئے جائیں جو اب اردو میں مستعمل نہیں ہیں یا شکلیں مسرور ایام کے ساتھ بدلتی گئی ہیں تو پھر محمد قلی کا کلام باوجود سو پچاس برس قبل کی تخلیق ہونے کے مستقبل کی ہندوستانی شاعری کے لیے بہترین نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد میں ہندوستان کے ارباب سیاست جس مشترک زبان کی تشکیل کوشاں ہیں اس کو صدیوں قبل ہی محمد قلی لکھ گیا ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر اس بادشاہ شاعر کی بیش بہا کلیات کو مستقبل قریب میں ناگری حروف کی بھی منتقل کرلیا جائے۔ جس طرح ایران میں فردوسی کی زبان اور خصوصیات کا احیاء کیا

جارہا ہے۔ ہندوستان میں محمد قلی عرش آشیانی کی زبان اور شاعری پھر سے اپنی جگہ حاصل کررہی ہے۔ اگر محمد قلی کے پیدا کردہ رجحانات شعر وسخن اور زبان و ادب کے نہج بعد کے زمانہ میں بھی جاری رہتا۔ تو عہد حاضر میں اردو اور ہندی کا یہ افسوس ناک جھگڑا پیدا ہی نہ ہوسکتا اور آج اردو بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہوتی''۔۲۹

اس اقتباس سے ڈاکٹر زور کے اسلوب کے علاوہ قلی قطب شاہ کی شاعرانہ عظمت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ کی تحقیق اور تدوین میں ڈاکٹر زور کی صلاحیتوں کی ستائش کرتے ہوئے پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

ڈاکٹر زور نے تدوین وترتیب کے دوران مختلف موضوعات پر کہی ہوئی نظموں کو جو مخطوطے میں بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں یکجا کر کے انہیں سرخیوں سے مزین کردیا ہے۔ مذہبی تقاریب تہذیبی امور، کھیل کود، اور تفریحات سے متعلق نظموں نے اپنی مخصوص سرخی کے تحت دیوان میں مناسب جگہ پائی ہے۔ اس سے ایک سہولت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ ہر موضوع پر کہی ہوئی تمام نظمیں ہمیں آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔ اس طرح کلیات میں انتشار کے بجائے ترتیب پیدا ہوگئی ہے۔۔۔ مقدمے میں ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کی اہم خصوصیات سے بحث کی ہے اور اس کے انفرادی خدوخال اجاگر کئے ہیں۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور کی ایک ایسی یادگار تصنیف ہے جو تاریخ ادب اردو میں ان کے نام کو ہمیشہ تابندہ رکھے گی۔ اس کی اہمیت دستاویزی ہے۔ اور اس کے مطالعے کے بغیر کوئی شخص تاریخ ادب اردو سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ۳۰

تاریخ ادب اردو

''تاریخ ادب اردو'' مرتبہ ادارہ ادبیات اردو، اردو ادب کی تاریخ بالکل تحقیقی اور سائنٹفک بنیاد پر کی گئی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں ڈاکٹر بیلی کی تاریخ ادب اردو سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس کتاب کے مصنف کی جگہ مرتبہ ادارہ ادبیات اردو لکھا گیا ہے۔لیکن اس کے دیباچہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصنیف ڈاکٹر زور کی قلمی کاوش کا نتیجہ ہے۔دیباچہ میں زورؔ لکھتے ہیں:

''ادارہ ادبیات اردو نے کئی سال قبل دنیا کی چند اہم زبانوں کی ادبی تاریخوں کی اشاعت کا تصفیہ کیا تھا مقصد یہ تھا کہ اہم زبانوں کی مبسوط تاریخیں لکھی جاتیں جن پر ہر دور کی خصوصیتوں رجحانوں اور اہم تحریکوں کے ساتھ شاعروں اور انشا پردازوں کے حالات اور ان کی ادبی خدمات کا مفصل تذکرہ درج ہو، چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر مولوی میر حسن صاحب ایم اے تاریخ ادب گلستان، مولوی سید ابوالفضل صاحب ایم اے تاریخ ادب عربی اور پروفیسر عبدالقادر سروری، تاریخ ادب ہندی کی ترتیب میں مصروف ہیں۔اردو ادب کی تاریخ کا کام میں نے اپنے ذمہ لیا تھا''۔ ۳۱

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈاکٹر زور ہی کی تصنیف ہے۔یہ کتاب محققین کے لیے نہیں بلکہ عام اردو داں طبقہ اور طلباء کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔اس کتاب کے کل چار حصے ہیں۔پہلے حصے میں زبان اردو کی تاریخ (اردو کی ابتدا، اردو کی ابتدائی تاریخ) اور اردو ادب کا آغاز کے تعلق سے ولی تک کے شعراء کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ دہلی میں اردو ادب کے سو سال کے عنوان سے ہے جس میں حاتم سے لے کر عہد مصحفی و انشاء تک کا جائزہ لیا ہے۔''اردو نثر کی ترقی'' کا ایک عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور ان کی تخلیقات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے بعد دکن میں اردو ادب کے احیاء کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں اٹھارویں صدی عیسوی کے دکنی شعراء اور دارالترجمے کی خدمات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں دبستان لکھنو کے شعراء مثلاً خلیق، نسیم، آتش، ناسخ، انیس، دبیر اور شوق گویا سرور، مہر، صبا، وزیر، واجد علی شاہ اختر کے مختصر حالات زندگی اور شاعری پر اجمالاً تبصرہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ دبستان دہلی کے شعراء مثلاً ذوق، غالب، مومن، ظفر، نسیم، شیفتہ، آزردہ، مجروح، صہبائی وغیرہ کے حالات زندگی پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان کے شاعری کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔چوتھا باب ''اردو ادب کا دور جدید'' پر مشتمل ہے۔دور جدید کے اردو ادیب و شعراء میں سرسید، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، امیر مینائی، داغ، سلیم، محسن کاکوری، سرشار

رتن ناتھ، شرر، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر، شاد، سرور، احمد علی شوق، راشد الخیری، وحید الدین سلیم، عظمت اللہ خاں، سر محمد اقبال کو شامل کر کے ان کی اہم تواریخ اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب کے ضمن میں اجتماعی خدمات کے عنوان سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انجمن ترقی اردو، ہندوستانی اکیڈمی، ادارہ ادبیات اردو، اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ دہلی کی خدمات کی مختصر روداد پیش کی گئی ہے۔ آخر میں اردو صحافت کی مختصر تاریخ بھی قلمبند کی گئی ہے۔ کتاب کے اختتام پر اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

''تاریخ ادب اردو'' اردو ادب کی تاریخ پر مختصر معلومات فراہم کرتی ہے۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ جاننے والوں کے لیے یہ کتاب ضرور مشعل راہ بن سکتی ہے۔

رمز سخن

حیدرآباد کے گمنام شعراء کو منظر عام پر لانے اور ان کے کلام کی قدر و منزلت متعین کرنے کے لیے ڈاکٹر زور نے چند منتخب اساتذہ سخن کے حالات زندگی اور ان کے کلام کو ترتیب دے کر شائع کرنا شروع کیا، یہ کوشش بھی ان کی ایک تحقیقی جستجو ہے۔ سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن میں رمز سخن، لیکن سخن، بادۂ سخن، فیض سخن، سراج سخن، ایمان سخن، متاع سخن، مہتاب سخن شامل ہیں۔ جن میں دکن کے شعراء کا کلام موجود ہے۔

رمز سخن میں ڈاکٹر زور نے سدانند جوگی بہاری لال رمزؔ کے حالات زندگی اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں کلام رمزؔ کو پیش کیا ہے۔ رمز سخن کی فہرست اس طرح ہے۔ دکن کی اردو شاعری، تصویر بہاری لال رمز، رمز اور ان کی شاعری، انتخاب کلام رمز، دکن کی اردو شاعری میں ڈاکٹر زور نے اختصار کے ساتھ دکن کی ادبی تاریخ لکھی ہے۔ لیکن اس کو سطحی اور سرسری تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے دکن کے شاعروں کو سات ادوار میں تقسیم کر کے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد سدانند جوگی بہاری لال رمز کی وفات کے بعد کی تصویر دی گئی پھر رمز (۱۲۴۰ھ تا ۱۳۲۵ھ) کی حالات زندگی اختصار سے پیش کیا ہے۔ آخر میں رمز کی شاعری کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ کلیات رمز میں سات ہزار سے زائد شعر تھے۔ ان میں غزلیات (۵۷۰۰ پانچ ہزار سات سو) رباعیات اردو (۸۳) خمسہ جات اردو (۲۴) قطعات اردو (اکیس) قصائد اردو (پانچ) تاریخیں تہنیت و تعزیت ابیات و مصرعہ جات (۲۰۰ سے زاید) رباعیات فارسی (۳۳) قطعات فارسی (۹) قصائد فارسی (۱۰۰) خمسہ ہائے فارسی، کلام ہندی بھاشا (۱۳۶ نظمیں اور ۶۵۰ شعر ہیں)۔

ڈاکٹر زور کے مطابق رمز کے کلام میں شعر وسخن کا فطری ذوق تھا اور حضرت فیض کی صحبت اور شاگردی کا بھی ان پر اچھا اثر مرتب ہوا۔ رمز کے کلام میں حب الوطنی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

عاشق نہیں دنیا میں کسی رشک چمن کا
گل خوردہ ہوں میں عارض سبزانِ دکن کا
انداز حور خلد کا مشہور ہے مگر
آتی نہیں ہے دلبر ملک دکن کی بات

رمز کے کلام میں ترک دنیا اور اپنی حالت آوارگی اور مستانہ پن اختیار کرنے کے اسباب بھی بیان کیے گیے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کار دنیا کا نتیجہ ہی جو بہتر ہوتا
رمز کیوں چھوڑ کے پھر اس کو قلندر ہوتا
ہیں جذب میں اور حال ہے مستانہ ہمارا
لبریز مئے عشق ہے پیمانہ ہمارا
تھا ناچ پتلیوں کا زمانے کا کھیل رمز
آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہ تجھ کو یقیں ہوا
جب گنج لازوال تو کل ہو دستیاب
خواہاں ہوکر کون دولت ناپائدار کا
خلاق لامکاں مرے دل میں مکیں ہوا
بیت الخزن مقابل عرش بریں ہوا
جواہر میں تلے گا یہ فسانہ عشق کا میرے
چھپے گا بعد میرے قصہ بن کر لعل و گوہر کا

(رمز سخن ص ۲۸)

ڈاکٹر زور کہتے ہیں کہ بہاری لال رمز ایک پکے ہندو ہونے کے باوجود مسلمان بزرگوں کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہ باوجود ہندو ہونے کے اپنے دل میں پنہائی اور وسعت رکھتے تھے۔ جس سے عہد حاضر کے

ہندو اور مسلمان رفتہ رفتہ محروم ہوتے جارہے ہیں۔ ہندو شعراء اسی ملک کی زبان اردو پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی میں ادیبانہ مہارت رکھتے تھے۔ زندہ اور پایندہ قومیں اپنے اسلاف کی علمی و ادبی کارناموں پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ بہاری لال رمز کے کلام کو اسی توقع کے ساتھ شایع کیا جارہا ہے۔ ''کیف سخن'' سلسلۂ انتخاب کی ایک کڑی ہے جس میں ڈاکٹر زور نے سید رضی الدین حسن کیفی کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ اس کتاب میں بھی دکن کی تاریخ کے ذکر کرنے کے بعد کیفی اور ان کی شاعری کے تحت کیفی کے حالات زندگی اور شاعری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ کیفی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کیفی کی شاعرانہ زندگی کا تیسرا دور استاد داغ کی شاگردی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس وقت ان کی فطرت کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے۔ داغ کی صحبت نے ان کے طبعی رجحانات کو پختہ کردیا''۔۳۲

اس کتاب میں غزلوں، رباعیات اور چند اہم نظموں کو درج کیا گیا ہے۔ کیفی کے کلام میں ان کی مشہور نظمیں، طغیانی رودِ موسیٰ، جاپان کا پیغام، حیدرآباد، قرض حسنہ اور غروب آفتاب بھی دستیاب ہیں۔

بادۂ سخن

''بادۂ سخن'' ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا حسن انتخاب ہے۔ ڈاکٹر زور نے مقدمہ میں داغؔ اور مائلؔ کے معرکوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مائل کی شاعری اپنی سادگی و بے ساختگی اور دلکشی کی وجہ سے مقبول ہے۔ مائل کے کلام کے پندرہ ہزار اشعار کا پتہ چلا ہے۔ مائل کی انفرادیت کو ڈاکٹر زور یوں تسلیم کیا ہے۔

> ''مائل کو اپنے ہم عصروں پر یہ فضیلت ہے کہ انھوں نے دبستانِ لکھنو کی بھی پیروی کی ہے اور دبستان دہلی سے بھی علاحدہ نہیں رہے۔ زبان کی ترقی کے خیال میں مختلف فصیح الفاظ اور متروکات کا خیال بھی بالائے طاق تھا۔ ان کی فراخ حوصلگی قابل ستائش ہے۔ اس آزادی کو گمراہی کا مترادف سمجھنا (جیسا کہ سمجھا گیا ہے) صحیح ہو یا نہ ہو مگر وہ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں یکسانیت مقصود ہے۔ باوجود ان باتوں کے وہ پُرگو اور کہنہ مشق نظر آتے ہیں۔ زبان میں لوچ، بیان میں شوخی، خیالات میں صداقت، تخیل میں رفعت ہے۔۳۳

فیض سخن

''فیض سخن''، میر شمس الدین فیض کے کلام کا انتخاب ہے۔فیض ایک بلند پایہ شاعر،لغت نویس اور علم عروض کے ماہرین میں سے تھے۔فیض نے غزل کے علاوہ مثنویاں بھی کہی ہیں۔ڈاکٹر زور نے ان سب پر مقدمہ میں تبصرہ کیا ہے۔اور نمونہ کے طور پر فیض کے کلام کو درج بھی کیا ہے۔

فیضان نے روایتی شاعری سے انحراف کرتے ہوئے عصری حسیت کا ثبوت ہے۔ڈاکٹر زور فیض کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فیض ایک اعلیٰ پائے کے اور ترقی پسند شاعر تھے۔انھوں نے اپنے کلام کو محض عشق عاشقی کا ترجمان ہی نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے عہد کی سیاست اور سماجی حالات کی اصلاح کا بھی ذریعہ بنایا۔انھوں نے انگریزوں کے خلاف کئی غزلوں میں اشارے کیے ہیں''۔

اور پھر فیض کے فیوض باطنی کے بارے میں سماعت فرمالیں:

> ''شعر وسخن سے زیادہ تصنیف وتالیف کی دنیا میں مشہور تھے اور تصنیف و تالیف اور علم وفضل ان کے فیوض باطنی اور کشف وکرامات کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے''۔۳۴

فیض کو استخراج تاریخ پر بھی عبور حاصل تھا۔اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

> ''فیض نے بڑے دلچسپ اور تاریخی قطعات لکھتے ہیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں استخراج تاریخ میں فیض کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔دکن کے کسی اور شاعر نے اتنی تاریخی نہیں نکالیں۔صرف شمس الامرا اور ان کے متعلقہ کاموں کے لیے انھوں نے پانچ ہزار تاریخی استخراج کی تھیں''۔۳۵

متاع سخن

''متاع سخن''، میں نواب عزیز جنگ عزیز کے کلام کو منتخب کیا گیا ہے۔عزیز داغ کے شاگرد تھے اور حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ان کے کلام میں زبان کی چاشنی کے ساتھ لطیف انسانی جذبات کی تصویر کشی بھی پائی جاتی ہے۔

عزیز کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزیز کوئی پیشہ ور شاعر نہیں ہیں بلکہ فطری مناسبت اور بزرگوں کے فیضان صحت کی وجہ سے بچپن ہی سے شعر وسخن کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا اسی کے اقتضا سے شعر گوئی پر مجبور رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیتیں، شگفتگی، شوخی اور بانکپن ہے۔ ان کی طبیعت کی خودداری استغنا اور رندمزاجی ان کے کلام میں جگہ جگہ اپنی جھلکیں دکھاتی ہے''۔۳۶

شاہد احمد نے رسالہ ''ساقی'' فروری ۱۹۳۷ء میں متاع سخن پر تبصرہ شائع کیا تھا۔

''یہ انتخاب نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ ہے۔ عزیز حیدرآبادی کا شاعرانہ ذوق دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوق مرحوم کے دل میں دکن نے کوں چٹکی لی تھی اور میر انیس مرحوم کس لیے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے اگر میں عزیز کے احوال سے بے خبر ہوتا تو بلا مبالغہ یہ سمجھتا کہ مومن خان مرحوم کا کوئی شاگرد ان کی بعض خصوصیات سے الگ ہو کر مرزا داغ کی زبان میں بول رہا ہے''۔۳۷

مرقع سخن

''مرقع سخن'' کی پہلی جلد میں حیدرآباد کے عہد آصفیہ کے پچیس ادبی شخصیتوں کے حالات اور کلام پر تبصرے موجود ہیں۔ آصف سابع کی حکومت کے پچیس سال کے مکمل ہونے پر شایع کیا گیا۔ اس کی دوسری جلد کو ڈاکٹر زور نے مزید پچاس شعراء کے حالات زندگی اور ان کے نمونہ کلام کا اضافہ کر کے ۱۹۳۷ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔

ڈاکٹر زور کی تحقیقی کاوشوں کے بارے میں پروفیسر سیدہ جعفر رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر زور کی تحقیقی کاوشیں ان کے رچے ہوئے تاریخی اور ادبی شعور کی ترجمان ہیں۔ سرزمین دکن سے ڈاکٹر زور کی والہانہ وابستگی نے انہیں اردو کے اس قدیم اور اہم مرکز کے ادب پاروں کی بازیافت کی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم ڈاکٹر زور کی تحقیقی مساعی کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے

یوں تو بہمنی اور عادل شاہی دور کی ادبی شخصیتوں کو بھی گوشہ گمنامی سے باہر نکالا
اور نئی نسل سے ان کے فن کو متعارف کروایا ہے لیکن ڈاکٹر زور کی بہترین تحقیقی
صلاحیتیں ان کی ذہانت و بصیرت اور جگر کاری و ریاضت کا بھرپور اظہار ان ادبی
تحقیقات میں نظر آتا ہے جو قطب شاہی دور سے متعلق ہیں۔'' ۳۸

ڈاکٹر زور کی تحقیقی کاوشوں کے بارے میں پروفیسر سیدہ جعفر نے درست رائے قائم کی ہے کہ دکن سے والہانہ محبت کے سبب انہوں نے تحقیق کے میدان میں بھی دکنی شعرا اور ان کے کارناموں کو کھوج کر نکالا۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے آنے والے دور کے دکنی محققین مزید تحقیقی کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

حواشی

۱ ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مضمون ''تحقیق وتنقید'' مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار ردلوی۔ ممبئی۔ 1984ء۔ ص۔ ۱۱۷

۲ ۔ قاضی عبدالودود۔ مضمون ''اُصولِ تحقیق'' مشمولہ۔ اُردو اور لسانی تحقیق۔ ص۔ ۷۷

۳ ۔ پروفیسر گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ ص۔ ۷

۴ ۔ ڈاکٹر شارب ردولوی ۔ جدید اُردو تنقید اُصول ونظریات ۔ ص۔ ۴۲۲۔ 1981۔ اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی لکھنؤ

۵ ۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اُردو تنقید اُصول ونظریات۔ ص۔ ۴۲۲

۶ ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ اُردو میں تنقید۔ ص۔ ۱۲۵

۷ ۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اُردو تنقید اُصول ونظریات۔ ص۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵

۸ ۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اُردو تنقید اُصول ونظریات۔ ص۔ ۴۴۹

۹ ڈاکٹر زور۔ بہ حوالہ ڈاکٹر زوراز۔ پروفیسر سیدہ جعفر۔ ص۔ ۵۷ دہلی۔ ۱۹۹۰

۱۰ بہ حوالہ۔ مطالعہ زور۔ از اکبر حیدری، ص ۹۲)

۱۱ ڈاکٹر زور۔ مطالعہ زور۔ از اکبر حیدری۔ ص۔ ۹۹

۱۲ ڈاکٹر زور۔ مطالعہ زور۔ از اکبر حیدری۔ ص۔ ۹۷

۱۳ ڈاکٹر زور، عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ص ۷

۱۴ ڈاکٹر زور، عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ص ۳۵

۱۵ ڈاکٹر زور، عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ص ۱۶۶، ۱۶۷

۱۶ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ۔ ص۔ ۵۹

۱۷ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ۔ ص۔ ۶۶

۱۸ میراں یعقوب۔ بہ حوالہ۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص۔ ۷۸

۱۹ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ۔ص۔۸۳

۲۰ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ۔ص۔۱۰۶

۲۱ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ۔ص۔۱۲۵,۱۲۶

۲۲ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ۔ص۔۸

۲۳ ڈاکٹر زور۔طالب ومومنی۔ص۱۱

۲۴ ڈاکٹر زور۔طالب ومومنی۔ص۔۸

۲۵ ڈاکٹر زور۔طالب ومومنی۔ص۔۱۹

۲۶ سیدہ جعفر۔پروفیسر''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' کی تدوین۔ص۔۴۷

۲۷ عبدالمجید صدیقی بہ حوالہ۔ڈاکٹر زور۔از۔سیدہ جعفر۔پروفیسر۔ص۴۷

۲۸ ڈاکٹر زور۔کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔مقدمہ۔ص ۱۲

۲۹ ڈاکٹر زور۔کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔مقدمہ۔ص۔۳۶

۳۰ سیدہ جعفر پروفیسر۔ڈاکٹر زور۔ص۔۷۶۔۷۷

۳۱ ڈاکٹر زور۔تاریخ ادب اردو۔ناشر ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔ص۔۴

۳۲ سیدہ جعفر، ڈاکٹر زور ص ۶۹

۳۳ ڈاکٹر زور۔مقدمہ بادہ سخن۔حیدرآباد

۳۴ ڈاکٹر زور۔فیض سخن۔مقدمہ۔حیدرآباد

۳۵ ڈاکٹر زور۔فیض سخن۔مقدمہ۔

۳۶ ڈاکٹر زور۔متاع سخن۔مقدمہ۔حیدرآباد

۳۷ شاہد احمد۔تبصرہ متاع سخن۔مشمولہ۔رسالہ ساقی لاہور۔۱۹۳۷ء

۳۸ سیدہ جعفر، ڈاکٹر زور ص ۴۷

☆ چوتھا باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد

ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ

☆ روح تنقید ☆ اردو کے اسالیب بیان

☆ تین شاعر ☆ جواہر سخن

☆ ادبی تاثرات ☆ ادبی تحریریں

ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک ممتاز ادبی نقاد بھی تھے، تحقیق و تدوین اور دیگر میدانوں میں جس طرح انھوں نے اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، تنقید میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر زور اردو ادب کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے جدید تنقیدی اصولوں اور مبادیات سے قارئین کو واقف کرایا اور تنقید کے موضوع پر بلند پایہ علمی کتابیں پیش کیں۔ حالی کو اردو تنقید کی تاریخ میں اولیت حاصل ہے لیکن ڈاکٹر زور کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مغربی تنقیدی تصورات سے براہ راست استفادہ کر کے جدید اصول تنقید کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر زور نے اس وقت تنقیدی نظریات یا نظریاتی تنقید پیش کی جب کہ ابھی اس موضوع پر ابہام یا انتشار پایا جاتا تھا۔ انھوں نے خالص علمی لب ولہجہ کے ساتھ تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور اس فن کے مخصوص مسائل سے اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا۔

ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالنے سے پہلے تنقید کی تعریف کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔

تنقید کی تعریف

لفظ ''تنقید'' نقد سے مشتق ہے جس کے معنی جانچنا' کھوج' پرکھ' کھرے کھوٹے کی پہچان' محاسن و معائب میں فرق کرنے کے ہیں۔ اصطلاح ادب میں کسی فن پارے یا تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرتے ہوئے ادب میں اُس کا مقام تعین کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ عربی میں نقد یا انتقاد کا معنی کھرا کھوٹا پرکھنا ہے۔ یونانی زبان میں Krinein کا مطلب "To Judge or discern" ہے۔

ہر زمانے میں تنقید کی مختلف تعریفیں پیش کی گئی ہیں۔ کسی نے ادب کا مقصد مسرت و حظ پہنچانا بتایا۔ اور تنقید کا کام تخلیق میں مسرت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا بتایا۔ کسی نے ادب کو تغیر حیات کا نام دیا۔ اور زندگی کے تغیر و تبدل کے زیر اثر ادب میں رونما ہونے والے مسائل اور تبدیلیوں کو دیکھنا تنقید کے لئے لازمی قرار دیا۔ تنقید کا حل بصیرت و علم کے ساتھ موزوں و مناسب طریقے سے کسی ادب پارے یا فن پارے کے محاسن و مصائب کی قدر شناسی یا اس کے بارے میں ''حکم لگانا'' یا فیصلہ صادر کرنا ہے۔ دوسری تعریف یہ ہے، کسی ادب پارے کی خوبیوں اور کمزوریوں کا مطالعہ ہے۔ Ed Goss کا خیال ہے کہ کسی ''جمال پارے'' ادبی یا فنی کے خصائص اور قیمت کے بارے میں محاکمہ کرنے یا فیصلہ صادر کرنے کا فن تنقید کہلاتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کا کہنا ہے کہ تنقید، فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے فوائد و وظائف کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی شاعری یا نظم اچھی ہے یا بُری ہے۔

ڈاکٹر زور تنقید کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فن تنقید اس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کے حرکات و افعال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جائیں۔ صحیح و غلط اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانے، وقتیہ معتقدات اور ذاتیات کو ملیا میٹ کرنے نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں'' ۔[۲]

دراصل کسی ادب پارے کی تخلیق کے ساتھ ہی تنقیدی عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جب فنکار کے ذہن میں کسی فن پارے کی داغ بیل پڑتی ہے تو وہاں سے اُس کے ذہن میں تنقیدی عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی شاعر نظم یا غزل لکھنے کا ارادہ کرے تو اس کا تنقیدی شعور اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور وہ اشعار کو کانٹ چھانٹ کے اور اُس کے نوک پلک درست کر کے تسلی بخش انداز میں تخلیق کرتا ہے۔ غرض یہ کہ جب کوئی فن پارہ فنکار کے ذہن میں جنم لینے لگتا ہے تو یہیں سے تنقید اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ اور ایک لحاظ سے تخلیق سے پہلے تنقیدی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ بیشتر تخلیقات خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو کے بعد ہی وجود میں آتی ہیں۔ اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''آج زندگی ہر وقت رواں دواں ہے۔ اس میں ہر لمحہ ایک نئے نظریے اور نئی فکر کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ناقص اور بہتر کی تمیز کے لئے تنقید ضروری ہے۔ تنقیدی شعور کے بغیر نہ تو اعلیٰ ادب کے تخلیق ہو سکتی ہے۔ اور نہ فنی تخلیق کی قدروں کا تعین ممکن ہے۔ اس لئے اعلیٰ ادب کی پرکھ کے لئے تنقید لازمی ہے'' ۔[۱]

تخلیق کا مقصد ترسیل ہوتا ہے۔ فنکار چاہتا ہے کہ اُس کی تخلیق کو لوگ دیکھیں پڑھیں، سمجھیں، تخلیق کو دیکھنے والے ناظرین اور پڑھنے والے قارئین کی ذہنی سطح کے مطابق اپنی اپنی تنقیدی نظر ہوتی ہے۔ لوگوں کے پاس کسی فن

پارے کی پسند یا ناپسند کے اپنے اپنے پیمانے ہوتے ہیں۔لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ اپنی پسند یا ناپسند کا سبب نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ تنقید فن پارے اور اُس کے پڑھنے والے کے درمیان مستحکم رشتہ قائم کرتی ہے۔ یہ فن پارے کو جانچتی اور پرکھتی ہے۔اس کی خوبیوں اور خرابیوں کا پتہ لگاتی ہے۔اعلیٰ درجہ کی تنقید اچھے بُرے کا دوٹوک فیصلہ نہیں کرتی۔ بلکہ فیصلہ کرنے میں قاری کی مدد کرتی ہے ایسا کرنے میں وہ اپنا راستہ لمبا کر لیتی ہے۔کبھی وہ فن پارے کی صراحت کرتی ہے کبھی تشریح وترجمانی اور کبھی تحلیل وتجزیے سے کام لیتی ہے۔اس لئے تنقید کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ادب کے لئے اس طرح ضروری ہے جس طرح زندہ رہنے کے لئے سانس۔تنقید کسی تخلیق کے محاسن اور معائب کو اُجاگر کرتے ہوئے غیر جانبداری سے اُس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔تنقید کے لئے غیر جانبدای اہم ہے۔تاہم نقاد کسی نظریے کا حامل ہوسکتا ہے۔بغض وعناد سے پاک تنقید کے لئے ضروری ہے کہ اس میں خارجیت اور معروضیت ہو۔ایک اچھے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادب کا وسیع مطالعہ کرے۔فلسفہ، جمالیات، سائنس، عمرانیات، معاشیات، اقتصادیات، اور نفسیات جیسے علوم سے واقفیت رکھتا ہو۔عالمی ادب کے قدیم وجدید رجحانات سے پوری طرح واقف ہو۔نہ روایت کا پرستار ہو نہ اُس سے بیزار۔اس طرح کے نقاد کی تنقید اُس کی وسیع النظری کے سبب تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے ایک نقاد کسی فن پارے کو دو پہلوؤں سے پرکھتا ہے۔ایک یہ کہ اس میں کیا پیش کیا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ کس طرح پیش کیا گیا ہے۔اس کیا اور کیسے کے لئے تنقید کی اصطلاح میں دو نام مواد اور ہیت کے استعمال ہوتے ہیں۔

تنقید کی روایت

تنقید کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی تخلیق کی تاریخ ہے۔ ہر آرٹ کی تخلیق سے قبل تنقید کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔اردو میں تنقید مغرب کے زیر اثر آئی۔ابتدا میں اردو تذکروں میں تنقیدی شعور پایا گیا۔الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے ذریعے اردو میں باضابطہ تنقید نگاری کا آغاز کیا۔مقدمہ شعر وشاعری میں پیش کردہ اپنے تنقیدی خیالات کے سبب جدید اُردو تنقید نگاری کے بانی قرار پائے۔حالؔی نے تنقید کی جو راہ نکالی اس پر آگے چل کر اُردو تنقید نے طویل فاصلہ طئے کیا۔حالؔی کے بعد اُردو کے نقادوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔جن میں اہم نام شبلؔی، عبدالحق، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، خورشید الاسلام، محمد حسن، احسن فاروقی، وزیر آغا، قمر رئیس، سلیم احمد، مغنی تبسم، سلیمان، اطہر جاوید وغیرہ شامل ہیں، قاری اور نقاد کی پسند کے اعتبار سے جب تخلیق کو قبول یا رد کیا جانے لگا تو ادب میں تنقید کے دبستان وجود میں آئے۔اور اُردو تنقید میں رومانی تنقید، جمالیاتی تنقید، سائنٹفک تنقید، مارکسی تنقید، تاثراتی تنقید، نفسیاتی تنقید، اور تقابلی تنقید جیسی شاخیں وجود میں آئیں۔تنقید کے ابتدائی نظریے، تعریف تشریح،

توضیح اور تجزیے کی شکل میں ہیں۔ سائنٹفک تنقید ادیب اور فنکار کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ اور اُس کے ذریعہ تخلیق میں زمانے کے سماجی حالات اور خیالات کا عکس تلاش کیا جاتا ہے۔ جمالیاتی تنقید میں کسی بھی ادبی تخلیق کے مطالعے یا جائزے سے ذہن پر پڑنے والے تاثر کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اور تخلیق میں حظ' مسرت اور حُسن کے پہلو تلاش کئے جاتے ہیں۔ تاثراتی تنقید میں کسی بھی ادبی تخلیق کے مطالعے یا جائزے سے ذہن پر پڑنے والے تاثر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مارکسی تنقید میں ادب کا تعلق زندگی سے دیکھا جاتا ہے کہ اعلیٰ ادب وہی ہے جو اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرے اور انسانی مقاصد کی ترجمانی کرے۔ نفسیاتی دبستان میں فرد کی نفسیات سے بحث کی جاتی ہے اور اُن میں یکساں خصوصیات تلاش کی جاتی ہیں۔ تنقید کا تعلق تحقیق اور تخلیق سے بھی ہے۔ تینوں میں فضیلت کا معاملہ زیر بحث رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے بغیر تنقید ممکن نہیں۔ اور تنقید کے لئے تخلیق ضروری ہے۔ اچھی تخلیق کے لئے سلجھے ہوئے تنقیدی شعور کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ۔ روح تنقید

روح تنقید، تنقیدی مقالات اور اردو کے اسالیب بیان، ڈاکٹر زور کی اہم تنقیدی نگارشات ہیں۔ ''روح تنقید'' (۱۹۲۵ء) تنقید پر ایک معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔ اس کتاب کا تعارف عمر یافعی نے لکھا ہے۔ دیباچہ خود ڈاکٹر زور نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ مبادیات تنقید سے متعلق ہے جس میں تنقید و ادب کی تعریف، ادب کی پیدائش، ادب کی تقسیم، ادب کا مقصد، تنقید کا مقصد، تنقید نگاری کے فرائض، تنقید نگار کی نگہداشت، اصول تنقید میر حسن اور ان کی مثنوی ''سحر البیان'' پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ ارتقائے تنقید سے متعلق ہے۔ اس حصہ میں مشہور یونانی اور روم کے فلاسفر کے تنقیدی تصورات کو پیش کرتے ہوئے فرانس و انگلستان میں تنقید کے ارتقا کو پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی کے بعد تنقید کی ترقی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پھر کولرج ورڈ سورتھ، میاتھیو آرنلڈ جیسے مشہور نقادوں کی تنقیدی تصورات کو پیش کیا ہے۔ آخر میں کتاب میں درج مصنفین اور مصنفات کی فہرست دی گئی ہے۔

''روح تنقید'' میں ڈاکٹر زور نے اردو داں طبقہ کو مغربی اصول تنقید سے واقف کرایا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی تنقیدی تصورات کا سراغ لگایا۔ ڈاکٹر زور نے تنقید کی چار قسمیں بتائی ہیں۔:

تنقید کی پہلی قسم یہ ہے کہ کسی ادبی کارنامہ کی حقیقی عظمت تک پہنچنے کی

کوشش کی جاتی ہے تا کہ آخر میں اس کے متعلق کوئی حکم صادر کر دیا جائے۔ مشہور پیشہ ور نقاد جیفری اسی قسم کی تنقید پر کاربند تھے مثلاً یہ کہ ورڈ ڈ سوارتھ کے متعلق لکھتے وقت ایک جگہ حکم لگا دیتا ہے کہ ''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا''۔

دوسری قسم کی تنقید وہ ہے جس میں ادبی تصانیف پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے۔ بلکہ صرف واقعات کو ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی قطعی فیصلہ صادر نہیں کیا جاتا۔ اس طرز تنقید کے مشہور علمبردار مولٹن ہاویلس، ٹین اور سنیسٹبری ہیں، جو کسی ادبی کارنامہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد اس کے ماحول و ظاہری حالات نیز اس صنف ادب کو جس میں وہ داخل ہوتا ہے، صرف دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تنقید کی اور بھی دو قسمیں کی جاتی ہیں ایک داخلی (جس کی مثالیں پیش کرنے کے لئے ہنری جیمس کی مصنفات بہت زیادہ موزوں ہیں) اور دوسری خارجی جس پر ایمیل ہے نکوین عمل پیرا تھا) اس کے علاوہ ادبی تنقید متفرق ممالک کے ماحول اور معتقدات کے لحاظ سے اس قدر مختلف ہے کہ اس کو برطانوی، امریکن، فرانسیسی، جرمانی یا روسی قسم تنقید علیحدہ علیحدہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ [۳]

ڈاکٹر زور کے خیال میں تنقید چند اصولوں کے تابع ہوئی ہے۔ وہ اصول درجہ ذیل ہیں۔

(۱) تصنیف جس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے اس کے اہم خدوخال اور خصوصیات اس میں موجود ہیں یا نہیں۔

(۲) معانی و مطالب کے اعتبار سے زیر بحث تصنیف اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کر رہی ہے یا نہیں۔

(۳) زیر تنقید تصنیف کی زبان و اسلوب کی قدر و قیمت کا تعین۔

(۴) شاعر یا مصنف کی شخصیت، اس کے ماحول اور دیگر تصانیف کا مطالعہ۔

(۵) فن پارے کی ادبی تکمیل پر تبصرہ۔

ایک جگہ ادب اور تنقید کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

ادب کا مقصد صداقت کی ترجمانی ہے اور اس کو سمجھنا اور سمجھانا تنقید کا کام ہے۔ ادب کی گہرائیوں تک پہنچنا اور ان بیش بہا موتیوں کو نکال لانا جو عام نظروں سے مختص رہتے ہیں۔ تنقید کا بہترین مقصد ہے۔

ڈاکٹر زور کے نزدیک تنقید کے اہم کام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تنقید کا زبردست کام یہ ہے کہ وہ ادبیات کی عظمت کا صحیح اندازہ لگائے۔ کسی کتاب کی عمیق اور تاریک گہرائیوں تک پہنچ جانا اور اس کی حقیقی خوبصورتیوں اور جوہروں کو روشنی میں لانا تنقید کا کام ہے۔

۲۔ تنقید کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ وہ عوام کو مصنف کی طرف متوجہ کرے۔

۳۔ تنقید مصنف کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ اسے عوام کے سامنے کس حیثیت سے آنا چاہئے۔ تنقید مصنف کو غلط نام ونمود سے بچاتی ہے۔

۴۔ تنقید کا ایک اہم کام ہے کہ وہ ادبی مذاق کی ترتیب وتہذیب میں کوشش کرے تاکہ قوم میں ادب کا اعلیٰ مذاق پیدا ہو، ادبی مذاق اگر بگڑ گیا تو قارئین کا مذاق بھی بگڑ جائے گا۔

۵۔ تنقید ادب کو خودغرضی اور تعصب سے روکتی ہے۔

۶۔ تنقید کا ایک کام یہ بھی ہے کہ عوام یا مصنف کی کمزوریوں کو دور کرے۔

ڈاکٹر زور کے نزدیک تنقید نگار کے فرائض یہ ہیں کہ تنقید نگار، ماضی کے طریقہ تنقید کی پیروی کرے۔ تنقید میں نباتیات یا طبعیات کی طرح بالکل تحقیق وتفتیش اور تجزیہ وتشریح سے کام لے، ادبیات عالیہ سے واقف ہو۔ ہر قسم کی جانبداری سے پاک ہو۔

ڈاکٹر زور کے مزید تنقیدی خیالات کو سمجھنے کے لیے ''روح تنقید'' کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ تنقید میں نہ صرف تقریظی پہلو ہوتا ہے بلکہ تخلیقی بھی۔ اس کا کام نہ صرف برائی کی مذمت کرنا ہے بلکہ اچھائیوں کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کر کے ان میں ترقی دینا ہوگا۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید کا کام خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ محاسن کو ترقی دینا اور مصائب کو ختم کرنا تنقید کا کام ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان تنقید نگاروں پر چوٹ کی ہے جو صرف تنقید کی منفی عمارت کھڑا کرتے ہیں۔

۲۔ ''ادبی تنقید پر جس قدر مضامین لکھتے جاتے ہیں ان میں سے اکثر اسی غلط کاری کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ ان میں ادبی تنقید کے صرف ایک ہی پہلو یعنی

علم بیان سے بحث کی جاتی ہے۔لیکن ہم یہاں اس غلط فہمی کو بھی دور کر دینا چاہتے ہیں کہ فن تنقید اور علم بیان کو ایک سمجھ لینا نادانی ہے۔ بیان لٹریچر کے بیرونی اشکال کے لیے اسما و مصطلحات کا ذریعہ مہیا کر دیتا ہے۔تنقید ذہنی و روحانی آزادانہ ردعمل کو کہتے ہیں جو کسی کام کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بیان درمیانی قواعد کا بکھیڑا ہے۔تنقید آخری رائے ہوتی ہے''۔۴

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید کے لیے صرف علم بیان پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا اور صرف اس پر تکیہ سخت غلطی ہے۔علم بیان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر زور اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ایک نقاد کے لیے اصطلاحات علمیہ، روزمرہ کے محاورے، ادبی شعبوں کے اقسام، نظم و نثر نگاری کے متفرق طریقے و فن عروض اور فنون فصاحت و بلاغت کی معلومات بھی ضروری ہیں۔ڈاکٹر زور نے تنقید سے ہونے والی بے راہ روی کی طرف اس اقتباس میں نشاندہی کی ہے۔

۳۔''ایک زبردست نقاد شاعر بھی بن سکتا ہے اور ایک بہت بڑا انشا پرداز تنقید نگاری میں بھی ماہر ہو سکتا ہے تنقیدی کارنامہ خود تخلیقی پیداوار ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ جس کارنامہ پر تنقید کی گئی ہو اس سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لے۔۵

ڈاکٹر زور کا ماننا تھا کہ تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔اس لیے تنقید بھی صحیح معنوں میں تنقید ہونا چاہئے۔

۴۔''عام طور پر تنقید میں دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔پہلی طرز میں کسی ادبی کارنامہ کی حقیقی عظمت تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ آخر میں اس کے متعلق کوئی حکم صادر کر دیا جائے .....دوسری قسم کی تنقید وہ ہے جس میں ادبی تصانیف پر گہری نظر نہیں ڈالی جاتی بلکہ صرف متفرق واقعات کو ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی قطعی فیصلہ صادر نہیں کیا جاتا''۔۶

اس اقتباس میں ڈاکٹر زور نے تنقید کے دو طریقے بتائے ہیں۔ایک وہ تنقید جس میں کسی ادبی تخلیق کی عظمت کا تعین کرنا دوسری قسم کی تنقید میں ادبی تخلیق پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا جاتا بلکہ آزادانہ رائے ظاہر کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا جس انداز سے مطالعہ کیا اور اس پر تنقیدی روشنی ڈالی اس سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی شعور پختہ تھا۔ سحر البیان کی ظاہری شکل پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے موضوع کی اہمیت اور اس کی زبان وطرز بیان اور اسلوب پر بہت ہی خوبصورتی سے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ ایک جگہ مثنوی کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایک صنف ادب اور ہر موضوع کے لیے انشا پرداز کو ایک خاص زبان سے کام لینا پڑتا ہے، جس طرح قصیدہ کا لطف شوکت الفاظ اور رعب وداب سے حاصل ہوتا ہے، مثنوی میں روزمرہ کی بول چال اور صاف سیدھی زبان سے مزہ ملتا ہے۔ پھر مثنوی میں بھی وہ جو رزمیہ ہے، چُست و چوبند الفاظ کی طلبگار ہوتی ہے، اور وہ جو بزمیہ ہے صفائی بیان اور سلاست زبان کی محتاج ہے، پس سحر البیان جو ایک بزمیہ مثنوی ہے، میر حسن ہی جیسے مصنف سے سحر بیان ہوسکتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان میں لطف محاورہ، شوخی مضمون، طرز ادا، ادا کی نزاکت اور صفائی بیان کی تمام خوبیاں باعتبار رجامعیت حالات صرف میر حسن اور اُن کے خاندان میں نمونۃً جمع کردی گئی تھیں، ورنہ یہ ایک معجزہ سا نظر آتا ہے کہ میر تقی اور میر حسن دونوں تقریباً ہم عصر تھے لیکن میرؔ کی زبان کے اکثر الفاظ آج متروک ہوگئے ہیں اور حسنؔ کی لفظیات کے ہزاروں لفظوں میں سے کہیں کہیں ایک لفظ ایسا نظر آجاتا ہے جو آج کل متروک ہوگیا ہو یا کانوں کو بُرا اور دل کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔[۷]

وہ چونکہ ماہر لسانیات تھے اس لیے لسانی نقطۂ نظر سے بھی مثنوی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

'روح تنقید' کے دوسرے حصہ میں تنقید کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اقوام عالم کے مطالعے کی روشنی میں اپنی بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ افلاطون، ارسطو، تھیوفراسطس، ارسطاکزی نس، ارسطارکس، زائے لمس، ڈایونی سی اس، لانگی نس سسرو، ہوریش، بلو طارقی، پیطراک اور ڈانٹی اور دیگر فرانس کے نقادوں کی تنقیدی رائے کو اپنے زاویہ نگاہ سے جانچ کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حصے کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انھیں مغربی تنقید سے کتنی گہری واقفیت تھی۔

ارتقائے تنقید کی ایک مبسوط تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ارسطو اور افلاطون کی تنقیدی بصیرت پر روشنی

ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جن یونانی علماء نے اس کو ایک علیحدہ فن بنا دینے کی بنا ڈالی وہ افلاطون وارسطو تھے اور حق تو یہ ہے کہ ان دونوں کے سنجیدہ اور غیر معمولی دماغوں نے جن اصول کے تحت کام شروع کیا وہ اس قدر پختہ تھے کہ آج تک ان میں کسی قسم کے نقائص نمودار نہ ہو سکے''۔[۸]

ڈاکٹر زور نے جانس کے ادبی تصورات کو سراہا ہے۔ جانسن کی عملی تنقید بطور خاص انھیں پسند تھی۔ روح تنقید میں اس شاعر کے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایڈیسن نے ایک کامگار نقاد کی خصوصیات میں لکھا تھا کہ بہترین نقاد وہی ہے جو کسی ادبی کارنامے کے محاسن کی نشان دہی کرے، کہ مصائب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے جانس بھی اسی ہم آہنگ ہے اس کی رائے تھی کہ خداداد ذہانت رکھنے والے اور عالم آدمی کے لیے یہ بات کہ ایسے انشا پردازوں کا مطالعہ کریں جن میں محاسن کی کثرت ہو بہ نسبت نقائص ظاہر کرنے کے زیادہ نیچرل ہے۔[۹]

ڈاکٹر زور نے ''روح تنقید'' اپنے طالب علمی کے دور میں تصنیف کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ مغربی ادب سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ روح تنقید میں جا بجا مغربی مصنفین کے حوالے ہمیں کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس دور میں تنقید پر برائے نام کام ہوا تھا۔ اس لیے انھیں مغربی ادب سے استفادہ کرنا ضروری معلوم ہوا۔ روح تنقید کو ڈاکٹر زور بہت پسند کرتے تھے۔ اس لیے کہ یہ کتاب ان کی پہلی ادبی کاوش تھی۔ ان کا یقین تھا کہ روح تنقید بیشتر اردو ادب میں اپنی ایک شناخت بنائے گی اور وہ اردو ادب میں زندہ رہے گی۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''روح تنقید'' مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ میری پہلی علمی و ادبی کوشش ہے اور اگرچہ ''اس کے بعد میری ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں لیکن کوئی کتاب اردو دنیا میں اتنی مفید و مقبول ثابت نہیں ہوئی حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسری کتابیں میری محنت و کاوش اور افادیت کی وجہ سے مقبولیت میں اس سے بڑھ جائیں گی۔ خدا کا شکر ہے کہ ''روح تنقید'' کی مانگ روز افزوں

ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان وقتی کتابوں میں نہیں ہے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اوراق پارینہ بن جاتی ہیں اس میں زندگی کی قوت موجود ہے اور یہ اُردو ادب میں زندہ رہے گی''۔[۱۰]

مولوی عبدالحق ''روح تنقید'' کے پیش کرنے پر ڈاکٹر زور کی سراہنا کی ہے اور ساتھ ہی بعض اعتراضات بھی وہ لکھتے ہیں:

''مؤلف نے یورپی مصنفین اور نقادوں کی رایوں اور تنقید کے ارتقا اور تاریخ کو جس خوبی سے اپنی زبان میں لکھا ہے وہ قابلِ داد ہے اور جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق طالب علم ہی سے اس کی توقع ہوسکتی ہے۔ یہ وہ برتری ہے جو دوسرے کالجوں کے طلبہ کو کم نصیب ہوتی ہے۔ ہم مؤلف کے ساتھ ان کے فاضل پروفیسروں مسٹر سپیٹ اور مولانا وحیدالدین سلیم کو بھی مبارک باد دیتے ہیں جن کے لکچروں کی جھلک کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔[۱۱]

''روح تنقید'' ارتقائے تنقید کی پہلی کاوش ہے۔ ڈاکٹر زور نے مغربی نقادوں کے تنقیدی نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے ایک ابتدائی ادبی کاوش کی ہے جو یقیناً تنقید کے موضوع بیش بہا معلومات فراہم کرتی ہے۔ یقیناً اردو تنقید کے میدان میں وہ ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

اردو کے اسالیب بیان

ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری ''اردو کے اسالیب بیان'' میں بھی ملتی ہے۔ ان کی یہ تصنیف ۱۹۲۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ تصنیف اردو نثر کی تنقیدی تاریخ ہے۔ اس کتاب کے میں ڈاکٹر زور نے اردو کے قدیم و جدید اساتذۂ فن کے طرز و اسلوب پر ناقدانہ رائے زنی کی ہے اور اردو نثر کے ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اردو کے اسالیب بیان کے جملہ مباحث کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے

۲۔ دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشو ونما

۳۔ شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل

۴۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں

۵۔ غدراوراس کے قریبی زمانے میں نثر کی حالت

۶۔ سرسید کی کوششوں کا اثر

۷۔ موجودہ انشاپردازوں کی نثراوراس کے اسالیب

۸۔ اردونثر کے رجحانات

۹۔ اردونثر کا مستقبل

ڈاکٹر زور نے ''اُردو کے اسالیب بیان میں'' اردونثر کے سوسال کے ارتقاء کی ایک مختصر تاریخ رقم کی ہے۔جس میں ایک قدیم دکنی وشمالی ہند کی نثری کے نشوونما کے ابتدائی مراحل سے لے کر دور جدید کے رجحانات تک کا جائزہ لینے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے قدیم اردو بولنے والوں کا معاشرتی اور سماجی پس منظر ہمارے سامنے آجائے گا اوراس منظرنامے کی تبدیلی سے اردوادب کے اسالیب پر کس قدر تغیر ہوارونما ہوجائے گا۔

اردونثر کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر زور نے اردو کے مشہورومعتبر نثر نگاروں کی تحریروں کو اپنے نقطۂ نظر کی تصدیق میں پیش کیا ہے۔چنانچہ شبلی کے طرز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ نہایت سوچ سمجھ کراوراحتیاط سے عبارت آرائی کرتے ہیں۔بے جاالفاظ اوراطناب سے پرہیز کرتے ہیں۔ان کی تحریروں میں مغربی طرز کے محققانہ اسلوب کی جھلکیں پائی جاتی ہیں۔ان کو زبان کی ادبیت قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ان کے ماحول کا عام میلان انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی طرف تھا،لیکن وہ سوائے مشہورومستعمل لفظوں کے بہت کم انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں''۔۱۲

ڈاکٹر زور شبلی کی عظمت کے قائل تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے شبلی کے اسلوب پر اعتراض بھی کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی سلاست وفصاحت کی بھی ڈاکٹر زور نے تعریف کی ہے انھیں اڈیسن کے مشابہ قرار دیا ہے۔

> ''خواجہ اردو کے اڈیسن ہیں، والٹیر نہیں، جس کے متعلق لارڈ میکالے نے اڈیسن اور سوئفٹ سے مقابلہ کرتے وقت کہا تھا کہ جب کبھی وہ دوسروں کو ہنسانا چاہتا تھا تو خود اپنا ماثر ہونا ظاہر کردیتا تھا،مگر چوں کہ والٹیر ''مسخروں کا

شہزادہ'' تھا نیز آزاد ہمیشہ صرف قہقہہ نہیں لگاتے اس لیے ہم انھیں اردو کا پورا پورا والٹیر نہیں کہہ سکتے۔ ہاں شبلی نعمانی اردو کے سوئفٹ کہلائے جا سکتے ہیں جو باوجود اپنی مولویت اور تقدس قائم رکھنے کے کہیں کہیں ایسی شوخی کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا گھنٹوں مزے لیا کرے''۔۱۳

اس اقتباس سے ڈاکٹر زور کے مغربی ادباء کے متعلق معلومات کا پتہ چلتا ہے تبھی تو انھوں نے اردو کے ادبا کا مغربی ادبا سے موازنہ اور تقابل کیا ہے۔ ڈاکٹر زور مختلف اسالیب کا تجزیہ تفصیل سے کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی اور عظمت اللہ خان کے اسالیب کا تقابلی مطالعہ ڈاکٹر زور کی تنقیدی بصیرت کا واضح ثبوت ہے۔

''رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں عربی و فارسی کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے اور عظمت اللہ خاں کی اکثر عبارتیں ہندی بھاشا کے مشتقات سے معمور ہوتی ہیں۔ اول الذکر علامہ شبلی کے دبستان کے پیرو نظر آتے ہیں اور موخر الذکر خواجہ حالی کے متبع''۔۱۴

ڈاکٹر زور نے مرزا غالب کی نثری اسالیب کا جائزہ بھی بڑی وقیع نظری سے لیا ہے۔ ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس طرح اصلیت ہر حقیقی ادب کا اساسی اصول ہے ہر طرز بیان کا بھی ہے۔ وہ شخص جو دراصل کوئی ذاتی بات کہنا چاہتا ہے اس کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی ذاتی طریقہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ خیال جو درحقیقت اس کا ذاتی خیال ہے کبھی گوارا نہ کرے گا کہ کسی دوسرے طریقۂ بیان میں ظاہر ہو۔ مرزا غالب جب اپنے خانگی خطوط لکھنے بیٹھتے ہیں، جن میں ذاتی خیالات کی ترجمانی کرنی ہوتی ہے تو اپنی خاص طرز تحریر سے کام لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب انھیں تقریظوں اور دیباچوں کے لکھنے کے لیے مجبور کیا جاتا تو پھر وہ اسی طرز روش پر چلنے لگتے ہیں جو اس زمانہ میں مقبول خاص و عام تھی''۔۱۵

ہر خیال کے لیے ایک خاص اسلوب ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے مختلف موقعوں پر مختلف اسالیب کا عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ ان کے ذاتی خطوط میں الگ اسلوب اور دیباچوں اور تقریظوں کے لیے الگ اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر زور ایک ماہر لسانیات تھے۔ اسلوب بیان کی لسانی بنیاد پر ان کا موقف بالکل واضح ہوتا۔ معیاری زبان کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان کے حسن و قبح کا کوئی نہ کوئی معیار ہونا ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی خاص شہر یا محلّہ کی زبان کو تمام ملک کے لیے معیار قرار دیا جائے''۔[۱۶]

ڈاکٹر زور نے ایک عمدہ زبان کے لیے حسن بیان کے ارتقاء کو ضروری قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بہترین نہج زبان وہی ہے جس میں حسنِ بیان نہ صرف قائم رہے بلکہ ترقی کرے۔ اس ترقی میں رنگا رنگی اور تنوع کو شامل سمجھا جائے اور ساتھ ہی حسن خیال کو حسن بیان کی جان قرار دیا جائے''۔[۱۷]

ڈاکٹر زور کے نزدیک حسن خیال اور حسن بیان میں ربط ہو اور طرز بیان میں ترقی اور رنگا رنگی ہونی چاہئے۔

تین شاعر

''تین شاعر'' ڈاکٹر زور کی تنقیدی مباحث پر مشتمل تصنیف ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں شمس الاسلام پریس حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے میر تقی میر، میر انیس اور ہوریس اسمتھ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ میر تقی میر کی مثنوی نگاری پر خصوصی تبصرہ کیا ہے۔

میر کی غزل گوئی پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان کی مثنوی نگاری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے آخر الذکر صنف کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مختلف موضوعات جیسے میر کی مثنویاں اور نواب اودھ، میر کی مثنویاں اور فطرت کی ترجمانی، میر کی شخصیت و سیرت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے میر کی شاعری کو اس کے سماجی اور ثقافتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ میر کی شاعری میں انفرادی جذبات کی اہمیت ہے۔

ڈاکٹر زور نے میر انیس پر مبسوط معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میر انیس نے ایک ایسے ماحول کو تبدیل کیا جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ ان کے مراثی اعلیٰ سیرتوں کے مرقع کشی کرتے ہیں۔ میر انیس نے معاشرے میں اصلاحی خدمات انجام دینے کی سعی کی خیالات میں مذہبی اور اسلامی جذبے کو سمویا۔

ڈاکٹر زور میر انیس کے مراثی کو ادبیات عالم کے شہ پاروں مثلاً ایلیڈ، مہا بھارت رامائن، پیراڈائز لاسٹ،

شیکسپیر کے ڈراموں پر فوقیت دیتے ہیں مراثی انیس کی اہم شخصیتوں کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر انیس اگر ہندوستان کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ کیوں کہ ہندوستانی ان کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے اور یہ مغائرت انھیں ان ہمدردیوں اور اس پر خلوص محبت سے روکے رکھتی جو آج میر انیسؔ کے پڑھنے کے بعد حضرت زہرا حضرت زینب حضرت بانو حضرت صغریٰ یا حضرت اُم کلثوم وغیرہ کے متعلق دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے''۔

۱۸

اس کتاب کا آخر شاعر ''ہوریس اسمتھ'' (۱۷۷۹۔۱۸۴۹ء) ہے جو انگلستان کا مشہور شاعر تھا۔ قیام یورپ کے دوران ڈاکٹر زور اس شاعر کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور اس پر اظہار خیال کیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے ہوریس اسمتھ کے مفصل حالات زندگی، خاندانی پس منظر کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نثری خدمات، شعری محاسن کا جائزہ لیا ہے۔ ہوریس کی مشہور نظم ''ایک ممی سے خطاب'' ہے جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر زور نے بھی کیا ہے۔ اس نظم میں تیرہ بند ہیں اور ہر بند میں تین شعر ہیں اور ہر شعر کا ردیف و قافیہ دوسرے مختلف ہے۔ جس میں پہلا اور دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

خدارا بات کر مدت سے تو محوِ خموشی ہے
زباں تو ہے پر اس کے نغمے پر کیوں پردہ پوشی ہے
زمیں پر اے ممی پھر تو کھڑا ہے اپنے پاؤں پر
ترے آگے دوبارہ چاندنی کا ہے وہی منظر
مگر تو ہستی بے جسم ہے کوئی نہ سایہ ہے
وہی ہے گوشت اور ہڈی وہی اعضا میں ڈھانچہ ہے

جواہر سخن

''جواہر سخن'' ڈاکٹر زور کا مختصر کتابچہ ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور رقم کرتے ہیں کہ اردو ادب

میں شاعری کے ایسے انتخابات کی بہت ضرورت ہے جن میں ہر عہد کے بہترین اور نمایندہ شاعروں کی تمام اصناف کے خاص نمونے مندرج ہوں۔ ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف بھی تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف میں قصہ ملک مصر، قصہ لال و گوہر کو ایک ہی شاعر کی تخلیقات قرار دیا ہے۔ ''جواہر سخن'' دراصل ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے حکم سے مولوی محمد مبین عباسی چریاکوٹی نے چار جلدوں میں اردو شاعری کا انتخاب مرتب کیا تھا۔ جس پر ڈاکٹر زور نے طویل تبصرہ کیا تھا جسے بعد میں کتابی شکل میں شایع کیا گیا۔

ادبی تاثرات

''ادبی تاثرات'' ڈاکٹر زور کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر زور نے دوسروں کی تصانیف پر اور خود اپنی کتابوں پر جو تبصرے اور مقدمات لکھے تھے انھیں مرزا قدرت اللہ بیگ نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ ڈاکٹر زور کا پہلا تبصرہ علی حسن لطفی کی کتاب ''مصنوعی بیوی'' پر ہے۔ ان کے تبصرے غیر معمولی اور اہم معلومات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ادبی تاثرات میں ''دنیائے افسانے''، ''کلام احسان''، ''متاع اقبال'' اور ''باغ و بہار'' پر جو تبصرہ کیے ہیں ان سے ڈاکٹر زور کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ مقدمہ ''حکایات رومی'' مترجم عظمت اللہ بیگ میں ڈاکٹر زور کی تحریروں میں انشا پردازے بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مولانائے روم کی مثنوی گنج شائیگاں ہے جس کو کبھی زوال نہیں یہ وہ صنم خانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا حالانکہ اس میں صدیوں سے حریفوں کی بادہ خواری جاری ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک عجائب خانہ کی طرح یہ مثنوی ایسے ایسے عجائب و غرائب سے مالا مال ہے کہ ہر ذوق کا آدمی اس سے مستفید ہوتا ہے۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا اب یہ اپنی ہمت ہے مرغ کو دانہ ڈالو اور ہنس کو موتی''۔[۱۹]

ادبی تحریریں

''ادبی تحریریں'' ڈاکٹر زور کی تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔ کشمیر اور اردو، اردو اور قومی یکجہتی، دکنی ادب، ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں، قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام، مولانا رومی اور علامہ اقبال، صف شعرا و سری نگر، رسا جاودانی، مخمور حسین بدخشی، تمکین کاظمی، بھارت چند کھنہ، بانو طاہرہ سعید، اردو ہندی اور پنجابی،

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان مضامین کو ترتیب دے کر شائع کیا اور ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نے اس مجموعے کے مضامین کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

> زیرِ نظر مجموعے میں زیادہ تر وہی تحریریں شامل ہیں جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سال ڈیڑھ سال میں لکھیں۔ ان میں دو مضامین لسانیات سے متعلق ہیں۔ ایک میں اردو کے جدید تحقیقی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چند تحریریں دکنی ادب کے بارے میں ہیں۔ یہ غالباً ریڈیائی تقریروں کے مسودوں پر مبنی ہیں۔ ''صفہ شعرا'' سے متعلق مضمون میں اس کام کا ذکر ہے جو انھوں نے سری نگر میں فارسی کے بعض اہم شعرا کے مزارات کی نشاندہی دہی کے سلسلے میں کیا تھا۔ وہ ایک مضامین میں نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا ہے۔ یہ مضامین تحقیقی و تنقیدی شاہکار نہیں۔ اردو کے ایک اہم خدمت گذار اور ایک ادیب کی آخری یادگار تحریریں ہیں''۔ ۲۰

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے کے تمام مضامین کو تنقیدی کہنا مناسب نہیں ہے۔ اس میں زیادہ تر مضامین تحقیقی ہیں اس لیے ان میں لسانیات، جدید تحقیقی رجحانات، دکنی ادب کے تعلق سے ڈاکٹر زور نے لکھا گیا، بہت کم تنقید پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے بیشتر نقادوں نے ڈاکٹر زور کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ڈاکٹر زور کی تنقید کو سائیٹفک قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر زور نے تنقید کے لئے جن اصولوں کو ضروری قرار دیا ہے وہ بڑی حد تک سائنٹفک ہیں۔ اگر ان کو سامنے رکھ کر تنقید کی جائے تو ان کی تصانیف کے تمام پہلو پڑھنے والے کے سامنے آ سکتے ہیں۔ ان کی عملی تنقید میں یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔''۲۱

پروفیسر عبدالمغنی ڈاکٹر زور کا اردو تنقید میں مقام متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے بعد جدید اردو تنقید کا جو دور شروع ہوتا ہے اس کی پہلی معتبر آواز محی الدین قادری زور کی ہے۔ وہ پہلے اردو ناقد

ہیں جنہوں نے مغرب کے تنقیدی تصورات و مطالعات پیش کئے۔ اس سلسلے
میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جدید اصول تنقید پر اس وقت
بحث کی جب تنقید کی ماہیت اور حدود تک کا تعین نہیں ہوا تھا۔ اور بالعموم اس
موضوع پر ابہام یا انتشار پایا جاتا تھا۔'' ۲۲

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے بحیثیت تنقید نگار فن تنقید نگاری پر اس وقت لکھا جب کہ تنقید اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ نیز انھوں نے اردو ادب کو مغربی تنقیدی تصورات سے بھی آشنا کرایا۔ ڈاکٹر زور نے تنقید نگاری میں عملی تنقید اور نظری تنقید دونوں میں اپنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری اردو ادب میں ایک اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے۔

حواشی

۱ شارب ردولوی ڈاکٹر۔جدید اردو تنقید اُصول ونظریات۔لکھنو ۱۹۸۱ء۔۴۹

۲ ڈاکٹر زور۔روح تنقید۔حیدرآباد۔۱۹۲۵ء۔ص ۷

۳ ڈاکٹر زور۔روح تنقید۔روح تنقید ص ۱۴,۱۵

۴ ڈاکٹر زور۔روح تنقید۔ص ۴۸

۵ ڈاکٹر زور۔روح تنقید۔ص ۵۴

۶ ڈاکٹر زور۔روح تنقید۔ص ۵۵

۷ ڈاکٹر زور۔روح تنقید۔۶۸

۸ ڈاکٹر زور۔روح تنقید ص ۱۸۱

۹ ڈاکٹر زور۔روح تنقید ص۔۲۵۲

۱۰ ڈاکٹر زور۔بہ حوالہ۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔حیات شخصیت اور کارنامے از مغنی تبسم۔ص۔۲۰۸

۱۱ مولوی عبدالحق۔بہ حوالہ۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔حیات شخصیت اور کارنامے از مغنی تبسم۔ص۔۴۰۱

۱۲ ڈاکٹر زور۔اردو کے اسالیب بیان۔حیدرآباد۔۱۹۲۷ء۔ص ۵۱

۱۳ ڈاکٹر زور۔اردو کے اسالیب بیان۔ص ۶۱

۱۴ ڈاکٹر زور۔اردو کے اسالیب بیان۔ص ۱۰۱

۱۵ ڈاکٹر زور۔اردو کے اسالیب بیان۔ص۔۱۰۷

۱۶ ڈاکٹر زور۔اردو کے اسالیب بیان۔ص ۱۱۹

۱۷ ڈاکٹر زور۔اردو کے اسالیب بیان۔ص ۱۲۱

۱۸ ڈاکٹر زور۔تین شاعر۔حیدرآباد۔۱۹۲۷ء۔ص۔۲۳

۱۹ ڈاکٹر زور۔ادبی تاثرات۔حیدرآباد ۱۹۲۸۔ص۔۱۲

۲۰ ڈاکٹر زور۔ (ادبی تحریریں۔حیدرآباد۔۱۹۳۰ء۔ص ۳۷)

۲۱ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔اردو تنقید کا ارتقاء۔ص۔۳۲۰

۲۲ پروفیسر عبدالمغنی۔محی الدین قادری زور۔مرتبہ۔خلیق انجم۔ص ۱۱۹

☆ پانچواں باب

ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

ڈاکٹر زور کے دیباچوں کا جائزہ

ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

ڈاکٹر زور نے تصنیف وتالیف کو اپنی زندگی بنالیا تھا اور اس راہ میں جو بھی ان کے ساتھ تھے ان کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر زو نے بہت سی کتابوں کے دیباچے تحریر کیے جس سے ان کا مقصد قارئین کو کتاب کی روح سے آشنا کرنے کے علاوہ صاحب کتاب کا حوصلہ بڑھانا بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری کے جائزے سے قبل دیکھیں کہ دیباچہ نگاری کسے کہتے ہیں اور اس کی اردو میں روایت کیا ہے۔

دیباچہ نگاری کی تعریف

دیباچہ نگاری اردو تنقید کی ایک ذیلی صنف ہے۔ جب سے کتابوں کا اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ شعرا اور ادیب اپنی تخلیقات شائع کرانے لگے۔ اپنی کتاب کے تعارف کے لئے تخلیق کار کسی معروف شخصیت سے اپنے اور کتاب کے تعارف پر مبنی دیباچہ لکھواتا ہے جو شامل کتاب ہوتا ہے۔ یہ دیباچہ اگر کوئی معروف شخصیت لکھ دے تو صاحب کتاب کے لیے سند کا درجہ ہوتا ہے اور وہ اس پر فخر محسوس کرتا ہے۔ مصنف کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی تحریر تقریظ، تمہید، مقدمہ، پیش لفظ، پیش نامہ، سر نامہ، دیباچہ یا تعارف کے عنوان سے کتاب میں شامل ہوتی ہے۔۔ اس کا بنیادی مقصد پڑھنے والوں کو کتاب اور مصنف کے بارے میں ایک مستند اور ماہر لکھنے والے یا استاد کے تاثرات سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ تقریظ یا دیباچہ لکھنے والا جس موضوع پر کتاب لکھی گئی اس پر اختصار سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے ساتھ ہی مصنف کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیتا ہے۔ یہ تقریظ یا دیباچے عموماً تعریفی و توصیفی ہی ہوا کرتے ہیں۔

دیباچہ:

دیباچہ کے لُغوی معنی رخسار، پیشانی اور آغاز نامہ کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے Foreword‘ Preface یا Preamble کے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔۔ جبکہ اصطلاحی معنوں میں وہ مضمون یا تبصرہ یا تاثرات ہیں جو کتاب کے شروع میں لکھے جاتے ہیں جس میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے متعلق رائے زنی کی جاتی ہے۔ جو زیادہ تر تعریفی و توصیفی ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات دیباچہ مصنف خود لکھتا ہے لیکن دوسرے فرد سے لکھوائے گئے دیباچہ کو اہمیت حاصل ہے۔ دیباچہ کے بارے میں سیّد قدرت نقوی رقم طراز ہیں:

''کسی کتاب کا ابتدائیہ عرف عام میں دیباچہ کہلاتا ہے، جس میں کتاب سے متعلق کچھ امور بطور تعارف لکھے جاتے ہیں۔ کتب کے علاوہ رسالوں یا کتابچوں کے شروع میں بھی اس قسم کی عبارت ہوتی ہے وہ بھی دیباچے ہی کے ذیل میں شمار کی جاتی ہے۔''[۱]

مقدمہ

مقدمہ کے لغوی معنی '' آگے چلنے والا، آگے جانے والا، فوج کا وہ دستہ یا حصہ جو آگے بھیج دیا جائے، ہراول دستہ، دیباچہ اور تمہید''[۲] کے ہیں جبکہ اصطلاح میں اس کو بھی دیباچہ کے معنوں میں ہی استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک اس میں مصنف کی سوانح اور تعارف نیز کتاب کی تنقید ہوتی ہے۔ مقدمہ کے بارے میں پروفیسر افتخار شفیع لکھتے ہیں:

''مقدمہ کسی عملی و تحقیقی کتاب کی تکمیل کے بعد تحریر کیا جاتا ہے یہ ہر کتاب کے شروع میں ہوتا ہے۔ مصنف مقدمے میں علمی دیانتداری کے ساتھ اہم نکات بیان کرتا ہے۔ مقدمے میں صرف ضروری امور پر بحث کی جاتی ہے۔ مقدمہ نگار کے پیشِ نظر تفہیم و تحسین کا حصول ہوتا ہے۔ مقدمے میں اکثر وسیع معلومات دی جاتی ہیں۔''[۳]

دیباچہ و مقدمہ سے پہلے اس مقصد کے لیے ایک اور اصطلاح '' تقریظ'' استعمال کی جاتی تھی جو اب متروک ہو چکی ہے۔ ''تقریظ کسی ادب پارے کی خیالی انداز میں تعریف و تحسین ہے۔''[۴] بنیادی طور پر تقریظ کا تعلق دو یا دو سے زائد کلام سخن کو انصاف کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے ان کے درمیان تمیز کرنا اور کسی ایک کو اعلیٰ مرتبے پر فائز کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ صرف ایک کتاب کے شروع میں لکھا جانے لگا تو تقابل کے بجائے ایک ہی کتاب کے محاسن پر تبصرہ ہونے لگا۔ یوں دیباچہ یا مقدمہ تقریظ کی ترقی یافتہ صورت بنی۔ تقریظ کے بارے میں پروفیسر افتخار شفیع لکھتے ہیں:۔

''عرب معاشرے میں شعرا کے قصیدے سننے کے بعد ان کا موازنہ کرنے کا رواج تھا۔ مختلف اہل فن مشاعرے کے بعد شاعری کا تقابل کر کے اپنی رائے دیتے تھے اس کو تقریظ کہا جاتا تھا۔ گزشتہ صدی کے پہلے نصف میں

اکثر اردو کتابوں کی تقریظ ملتی ہے۔موجودہ دور میں اس کے متروک ہونے کا
سبب تنقیدی مضامین میں موجود محاسن ومصائب کا اظہار ہے۔تقریظ کی جگہ اب
دیباچہ اور پیش لفظ نے لے لی ہے۔''۵؎

دیباچہ، مقدمہ اور پیش لفظ میں کیا فرق ہے اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی کی رائے سے مکمل طور پر اتفاق کیا جا سکتا ہے۔وہ ان میں کسی قسم کی تفریق کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''دیباچہ، مقدمہ، تمہید ، پیش کلام، پیش لفظ، تعارف وغیرہ کے درمیان
کسی قسم کا کوئی فرق کم سے کم اردو کی کتابوں کی حد تک روا نہیں رکھا گیا، یہ لکھنے
والے پر موقوف ہے کہ کتاب یا مصنف کے بارے میں وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے
اس کا کیا عنوان رکھتا ہے۔''۶؎

مندرجہ بالا اقتباس، دیگر تعریفوں اور مطالعاتی مشاہدے سے قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دیباچہ اور مقدمہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں چاہے اس کو کوئی بھی نام دے دیں۔

کیا مقدمہ یا دیباچہ نگاری ایک صنف ادب ہے؟:

اردو ادب نے اپنی قلیل عمر میں شاعری اور نثر ہر دو میں بے شمار اصناف ادب کو جنم دیا۔اس کے ساتھ ساتھ دیگر زبان وادب کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔تقریظ سرزمین عرب سے سرزمین ہند تک دیباچہ ومقدمہ نگاری کی صورت میں اردو ادب میں مروج ہے۔فضلی کی ''کربل کتھا'' میں اس کے آثار ملتے ہیں جہاں مقدمہ کے ضمن میں لکھا ہے:۔

''ہیں اس مقدمے میں احادیث رونے کی
ان پر عمل کرے جو ہو بے شک نہال ہے''۷؎

مولانا الطاف حسین حالی کا ''مقدمہ شعر وشاعری'' جو اردو ادب میں تنقید کا منبہ ہے حقیقت میں کتاب کا ''مقدمہ'' ہی لکھا گیا۔مولانا عبدالحق کا اس بارے کافی کام ہے۔وہ مقدمات کے حوالے سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔مقدمہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:۔

''مقدمہ نگاری اک فن ضرور ہے۔اس کے کچھ بنیادی اصول بھی ہیں۔
ان اصولوں کا اس میں خیال بھی رکھا جاتا ہے۔بعض لوازم وعناصر کے مجموعی
امتزاج سے اس فن کی تعمیر وتشکیل ہوتی ہے اور لوازم وعناصر ہر صورت اس میں

پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔''[۸]

جب بھی کسی چیز کے اصول وضوابط تشکیل پا جاتے ہیں تو اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ اپنی شناخت رکھتی ہے۔اس کی اپنی الگ پہچان ہوتی ہے۔ان حقائق کی بنیاد پر دیباچہ نگاری اور مقدمہ نگاری کو صنف ادب ماننا ناگزیر ہے۔

دیباچہ ومقدمہ نگاری کی اقسام

اردو ادب میں لکھے گئے مقدمات اور دیباچوں کو درجِ ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا۔تحقیقی:

ایسے دیباچے جو تحقیق پر مبنی ہوں اور تحقیقی کتابوں کے لیے لکھے گئے ہوں تحقیقی دیباچے یا مقدمے کہلاتے ہیں۔اس حوالے سے جو نام سامنے آتے ہیں ان میں مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، عابد علی عابد، مشفق خواجہ، خواجہ زکریا، جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔تنقیدی:

تنقید مقدمے یا دیباچے وہ ہیں جو کسی ناقد نے کسی کتاب کی تدوین وترتیب کے وقت اس کے تجزیے اور تبصرے کے ساتھ کتاب میں شامل کیا ہو۔الطاف حسین حالی کو اس میں اولیت حاصل ہے گو کہ یہ ان کے اپنے دیوان کا حصہ تھا مگر سیر حاصل تبصرے پر مبنی طویل ترین مقدمہ تھا جو بعد میں اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔اس کے علاوہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا ''مقدمہ کلام آتش'' بھی تنقیدی زمرے میں آتا ہے۔

۳۔توصیفی یا تاثراتی:

اس قسم کے دیباچے تقریباً ہر کتاب میں شامل ہوتے ہیں۔اس میں دیباچہ نگار زیادہ تر کلام کے محاسن کے ساتھ ساتھ مصنف کے لیے توصیفی رائے بھی رکھتا ہے اور اس کے لیے حوصلہ افزائی کے کلمات لکھتا ہے تا کہ اس کا حوصلہ بلند ہو اور مزید مشقِ قلم جاری رہے۔مجید امجد کی دیباچہ نگاری بھی اس زمرے میں آتی ہے۔

اردو میں دیباچہ نگاری کی روایت

دیباچہ نگاری ادب کی ایک اہم اور منفرد صنف ہے جس کے بارے میں یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آغاز کب اور کس نے کیا۔لیکن یہ ایک قدیم روایت ہے کہ کتاب لکھنے والا اپنے سے زیادہ مستند لکھنے والے، معروف قلم کار، شاعر و

ادیب، صاحب کمال شخصیت سے کتاب کے بارے میں مختصر رائے لکھوایا کرتے تھے۔ شاید ہی کوئی تقریظ یا دیباچہ ایسا لکھا گیا ہو جس میں دیباچہ نگار نے کتاب یا صاحبِ کتاب کے بارے میں اپنی منفی رائے کا اظہار کیا ہو۔ بھلا منفی رائے کو مصنف کتاب میں کیوں کر شامل کرے گا۔ غالبؔ نے سرسید کی کتاب کی تقریظ میں منفی باتیں لکھیں سرسید نے اس تقریظ کو کتاب میں شامل کرنے صاف انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچے یا تقریظ کتاب پر لکھے گئے تبصروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ دیباچہ دوسروں سے لکھوانے میں ایک مصلحت یہ بھی کارفرما ہوتی ہے کہ مصنف اپنی اور اپنی کتاب کی تعریف از خود لکھے، یہ کسی بھی طور اچھا نہیں لگتا، یہ خودستائی کے زمرہ میں آجاتا ہے، چناچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے سے زیادہ عالم فاضل شخص سے اپنی کتاب کے بارے میں تعریفی و توصیفی کلمات لکھوانے کے لیے دیباچہ سازی نے مقبولیت حاصل کی۔ دیباچہ بنیادی طور پر جس موضوع پر کتاب لکھی گئی اس موضوع کے ماہر قلم کار، عالم فاضل ہی سے لکھوانے کی روایت تھی لیکن وقت کے ساتھ دیباچہ نگاروں میں ملک کی معروف شخصیات جیسے صدر مملکت، وزیر اعظم، وزراء اکرم، معروف سیاست دانوں، معروف شخصیات کو بھی اس فہرست میں شامل کرلیا گیا، یقناً اس کا مقصد کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرنا ہی ہے۔

رضا علی عابدی نے اپنی تصنیف 'کتابیں اپنے آباء کی' میں لکھا ہے کہ ۱۸۰۴ء میں شائع ہونے والی کتاب میر امن کی ''باغ و بہار'' تھی یہ ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا دیباچہ 'جان گلکرسٹ کا تحریر کردہ ہے۔ سرسید کی تصنیف ''آثار الصنادید'' پہلی بار ۱۸۴۷ء میں 'سید الاخبار' کے تحت جب کہ دوسری بار 'منشی نول کشور' لکھنؤ سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے آخر میں تقریظیں شامل ہیں۔ آثار الصنادید پر تقریظیں لکھنے والوں میں محمد مومن خان مومن، مولوی امام بخش صہبائی، مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اور محمد صدر الدین خان شامل ہیں۔ یہ تقریظیں نظم اور نثر دونوں میں لکھی گئیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ ''دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انہوں نے آئین اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی (مولانا امام بخش صہبائی) کی تقریظ چھپی ہے''۔

حالیؔ ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خان نے اپنی کتاب 'آئینِ اکبری' ۱۸۵۵ء میں مکمل کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جو ان کی اس علمی کاوش اور محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ سرسید نے مرزا غالبؔ سے رابطہ کیا کہ وہ اس کتاب کی تقریظ (اس وقت کی روایت کے مطابق ثنائیہ پیش لفظ) تحریر کردیں۔ غالبؔ نے سرسید کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ان کی کاوش کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ غالبؔ نے کتاب کا

احاطہ کرتے ہوئے اپنے طور پر ایک اصلاحی نظم لکھی جو فارسی میں تھی۔ سرسید نے اس تقریظ کو آئین اکبری میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ نظم سرسید کی کتاب آئینِ اکبری' کا پیش لفظ یا تقریظ ضرور ہے لیکن اس کتاب کا حصہ نہیں۔ یہ دیباچہ یا مثنوی تعریفی نہیں بلکہ اس میں مصنف کی سرزنش بھی کی گئی اور بہت سے مفید مشورے غالبؔ نے سرسید کو دئے۔ دیباچہ نگاری کے سفر میں یہ اہم پیش رفت تھی اور غالبؔ کی جانب سے دیباچہ نگاروں کو یہ پیغام بھی تھا کہ دیباچہ یا تقریظ صرف ثنائی ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اصلاحی یا تنقیدی بھی ہوسکتی ہے۔ دیباچہ نگار تصنیف میں کوئی کمی یا خامی محسوس کرے تو بلا تردد اس کا اظہار بھی کردے۔ غالبؔ کی یہ نظم ''کلیاتِ غالب'' کے علاوہ سبط حسن کی کتاب 'نویدِ فکر' میں شامل ہے۔ غالبؔ شاعری کی معراج پر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں خطوط نگاری کے دولھا بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے مکتوب نگاری کو بھی ایک نیا رنگ اور منفرد اسلوب دیا۔ مرزا غالبؔ کی تقریظ کو سرسید نے قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے ظاہر کیا ہے کہ ابو الفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب 'تاریخ ادبِ اردو' جلد چہارم میں بھی اس مثنوری کا ذکر کیا ہے۔ مرزا غالب کے علاوہ مصطفٰے خاں مرحوم نے بھی آئین اکبری پر تقریظ لکھی جو کتاب میں شامل نہ ہوسکی۔

اردو کے ممتاز دیباچہ نگاروں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا مقام بلند نظر آتا ہے۔ بابائے اردو کے لکھے ہوئے مقدمات محض تعریفی و توسیفی ہی نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ان کے مقدمات میں متعلقہ موضوع پر تحقیق ہوا کرتی تھی۔ شاہد دہلوی کے مطابق ''مقدمہ بازی (دیباچہ، تقریظ) تو مولوی عبدالحق مرحوم ہی پر پھبتی تھی' اور ان ہی کے ساتھ ختم ہوگئی''۔

عہد حاضر کے تمام ہی تجربہ کار لکھنے والے اور استاد لا اساتذہ دیباچہ نگاروں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان میں استادالا اساتذہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم کا مقام و مرتبہ بلند نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نزدیک 'دیباچہ نگاری ایک مستقل فن ہے'۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ دیباچے، تقریظ، تعارف، پیش لفظ، مقدمہ، دیباچہ اور فلیپ نہ صرف مصنف اور کتاب کا تعارف کراتے ہیں بلکہ موضوع پر بھرپور روشنی بھی ڈالتے ہیں۔

نامور شخصیات جنہیں دیباچہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا اور انہوں نے بے شمار کتب کے دیباچے بھی تحریر کیے ان میں حکیم محمد سعید شہید کا نام قابل ذکر ہیں۔ حکیم صاحب نے بے شمار مضامین کے علاوہ دوسو سے زیادہ تصانیف و تالیفات تحریر کیں ساتھ ہی بے شمار دیباچے، مقدمے اور تقریظیں لکھیں۔ دیباچہ نگاری اور تقریظ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام بھی معتبر ہے۔ انہوں نے بھی بے شمار مصنفین کی کتب کے دیباچے تحریر کیے۔ اب

تک ان کتابوں کی تعداد سو سے زیادہ ہوگی جن کے دیباچے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھ چکے ہیں۔

اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ بے شمار ہیں جنہوں نے قابل ذکر دیباچے یا مقدمے تحریر کیے۔ان میں احسان دانش ،جمیل الدین عالی، احمد ندیم قاسمی، تابش دہلوی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر وزیر آغا، امجد اسلام امجد، رئیس امروہوی، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، فیض احمد فیض، ادا جعفری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم، عطاء الحق قاسمی، فہمیدہ ریاض اور دیگر بے شمار ادبی شخصیات ایسی ہیں جن سے مصنفین تقریظ لکھوا کر مطمئن وشاد ہوتے ہیں۔دیباچہ نگاری یا تقریظ نگاری ادب کی اہم اور مقبول صنف ہے۔شائع ہوئے والی ہر کتاب نہیں تو ہر دوسری کتاب میں دیباچہ یا تقریظ کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مدد ومعاون ہوتی ہے۔

ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری یا پیش لفظ ایسے ہوتے ہیں جن کے مطالعہ سے کتاب کی اصل روح سمجھ میں آجاتی ہے۔قاری کتاب کے مطالعہ سے قبل اس کا مرکزی خیال سمجھ جاتا ہے۔ڈاکٹر زور نے جن کتابوں کے دیباچے لکھے ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ان کے اکثر دیباچے عمیق مطالعے اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہیں کہیں کہیں مصروفیتوں کے باعث سرسری بھی ہیں لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ڈاکٹر زور نے جن کتابوں کے دیباچے تحریر کیے ہیں ان کے موضوعات شعر وادب، تاریخی معاشرتی، اقتصادی وسائنسی، تنقیدی ولسانی اور نفسیاتی اور فلسفیانہ ہیں۔ان کے علاوہ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ان تمام دیباچوں میں ان کے وسیع مطالعے اور مختلف موضوعات پر ان کی دسترس کا بین ثبوت ملتا ہے۔

ڈاکٹر زور کے دیباچوں میں تنقید جیسے موضوع پر کافی مواد مل جاتا ہے۔انھوں نے اس موضوع پر اس وقت لکھا جبکہ اس کی ابتدا ہو رہی تھی۔''روح تنقید'' ان کے طالب علمی کے دور کا کارنامہ ہے۔اور یہ کتاب تنقید کے اولین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔تنقید کی ماہیئت اور اس کی ضرورت واہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''یہ صرف تنقید ہی ہے جو قوموں کے محسوسات خوابیدہ کو بیدار کر دیتی ہے، جو غلط معتقدات اور باطل خیالات کو زبان دانوں کی ذہنیت سے محو کر دیتی ہے اور جس کے باعث علوم وادب، علوئے مذاق اور رفعتِ تخیل کی خوش نما

شاہراہوں پر گامزن ہونے لگتے ہیں''۔۹

''روح تنقید'' کے دیباچہ میں اردو تنقید کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور کا خیال تھا کہ اگر اردو کو دنیا کی دوسری متمول زبانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا ہے تو تنقید جیسے موضوعات پر توجہ درکار ہوگی۔اس خیال کو وہ روح تنقید کے دیباچہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''اگر ہم اپنی زبان کو دنیا کی تہذیب و ترقی یافتہ زبانوں کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔اگر ہماری خواہش ہے کہ اپنے ادب کو کچھ ہی عرصے کے بعد انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی ادب کے پہلو بہ پہلو دیکھیں۔اگر ہم ملک وقوم میں شکسپیئر ملٹن گوئٹے اور کانٹ، روسو اور اناطول فرنس، ڈائیوسکی اور ٹالسٹائی جیسی عظیم شخصیتیں دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر ہم اس دعوے کو کامیاب بنانے کے متمنی ہیں کہ یہ اردو زبان اور صرف اردو زبان ہی ہے جو نہایت سہولت کے ساتھ ہندوستان کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے تو ہمیں چاہئے کہ بہت جلد تنقید کے صحیح اصول اور مقاصد کے حصول کی طرف متوجہ ہوں''۔۱۰

ڈاکٹر زور اپنے دیباچوں میں کتاب کے موضوع اور مواد کا تجزیہ تاریخی و معاشرتی اور لسانی عوامل و محرکات کے پس منظر میں کرتے ہیں۔''کلیات غواصی'' کا مقدمہ ڈاکٹر زور کی تنقیدی و تحقیقی کاوش کی عکاسی کرتا ہے۔غواصی کے حالات زندگی، دربار گولکنڈہ میں سازشوں کا جال، معاصرانہ چشمک کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اس کے علاوہ غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کے سنہ تصنیف کے تعین میں تاریخی حوالات کی مدد سے چھان بین کرتے ہیں اور غواصی کے کلام کا دیگر شاعروں کے کلام سے تقابلی مطالعہ پیش کر کے اس کے مقدمے کو بہت ہی وقیع بنا دیا ہے۔

یک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''غواصی نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور صاحب کمالی کا بیجاپور میں بھی ایسا عمدہ مظاہرہ کیا کہ وہاں کے بڑے بڑے شاعر ملک الشعرا ملا نصرتی اور مقیمی نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا اور اسی شہرت کی بناء پر بعد کو شمالی ہند کے تذکرہ نویس میر حسن نے اپنے تذکرے میں غواصی کا حال درج کیا''۔۱۱

ڈاکٹر زور کبھی کبھی موضوع کے تعلق سے مصنف کے رویے پر اور کتاب کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار

کرتے ہیں جس سے کتاب اور وقیع ہوجاتی ہے۔مولوی مرزا عصمت اللہ بیگ کی کتاب ''حکایات رومی'' کے مقدمہ میں مثنوی مولانا روم کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

''مثنوی، مولانا روم کی مثنوی ایک کنج شائگاں ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ یہ وہ ''خم خانہ'' ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا حالاں کہ اس میں صدیوں سے ''حریفوں'' کی ''بادہ خواری'' جاری ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک عجائب خانہ کی طرح یہ مثنوی ایسے ایسے عجائب وغرائب سے مالا مال ہے کہ ہر ذوق کا آدمی اس سے مستفید ہوتا ہے۔کوئی ہاتھ خالی نہیں لوٹتا۔اب یہ اپنی اپنی ہمت ہے۔مرغ کو دانہ ملتا ہے اور ہنس کو موتی۔اقبال جیسے مفکر جب اس دریائے مواج میں شناوری کرتے ہیں تو ''فلسفۂ خودی'' نکال لیتے ہیں سرحد جیسے صوفی جب اس کے مطالب ومعانی کی تہہ تک پہنچتے ہیں تو ''انالحق'' پکارنے لگتے ہیں اور ''قال'' کو چھوڑ کر ''حال'' کا ذوق بڑھاتے ہیں تو درویشوں کا ایک حلقہ بن جاتا ہے جو حلقۂ سیارگان کی طرح سرگرم رقص رہتا ہے۔غرض ہر شخص بقدر ذوق مستفید ہوتا ہے''۔۱۲

ڈاکٹر زور نے تقابلی تنقید سے بھی کام لیتے ہوئے خاطر خواہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی شعر وادب سے غیر معمولی آگہی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔مثنوی ''طالب وموہنی'' (سیف محمد والہہ موسوی) کو خود انھوں نے مرتب کیا، تمہید میں تقابلی مطالعہ کی راہ ہموار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مثنوی ''طالب وموہنی'' کی اشاعت سے قدیم اردو کے محقق کو بحث وتحقیق کے لیے ایک نیا موضوع دستیاب ہوگا اور جہاں ابن نشاطی کی ''پھولبن'' سے اس کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔میر تقی میر کی ''دریائے عشق'' سے بھی اس کا موازنہ نہ ہوسکے گا جو اسی کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔حسن اتفاق سے یہ دونوں پہلے ہی چھپ چکی ہیں اور اب ''طالب وموہنی'' کے چھپ جانے سے زنجیر کی سب کڑیاں مربوط ہوجاتی ہیں یہ ایک درمیانی کڑی تھی جو اب تک نظروں سے اوجھل تھی۔اس کی اشاعت سے میرؔ کی ''دریائے عشق'' کا سلسلہ

نشاطی کی ''پھولبن'' تک پہنچ جاتا ہے۔[۱۳]

ڈاکٹر زور کو تاریخ پر گہرا عبور حاصل تھا۔ وہ فن پارے کا تاریخی اور تجزیاتی زاویوں سے بھی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جن اقوام نے اپنی تاریخ اور ماضی کو فراموش کر دیا وہ حرف غلط کی طرح مٹا دی گئیں۔ اپنی تاریخ کو سامنے رکھ کر اپنے حال اور مستقبل کو سنوارا جا سکتا ہے اپنے افسانوی مجموعی کے پیش لفظ میں تاریخی قوتوں کی حیثیت کو تسلیم کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''تاریخ ہمیشہ تعمیر قومیت کی طرح اثر انداز رہی ہے۔ ماضی کی یاد سے مستقبل کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے اس لیے دنیا کی ہر ترقی یافتہ قوم میں تاریخی ادب پر زور دیا جاتا ہے۔ تاریخی ادب کی تحقیق کے لیے تحقیقی صلاحیت اور وسعتِ نظری کی ضرورت ہے تاکہ جدید نسل کے سامنے وہی چیزیں آئیں جن میں صداقت اور واقعیت ہونے کے علاوہ قوموں کے بنانے کی اہلیت بھی ہو''۔[۱۴]

تجزیاتی تنقید سے بھی ڈاکٹر زور نے کام لیا ہے۔ ''روح غالب'' کے دیباچہ میں غالب کی اردو نثر کے بعض اہم مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرزا غالبؔ'' کی اردو نثر ادبی حلاوت، زبان کی پاکیزگی اور اسلوب کی شگفتگی کے لحاظ سے اردو ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہے لیکن اس میں بعض حصے ایسے ہیں جن کا مطالعہ صرف علم و فضل سے تعلق رکھنے والوں ہی کے کام آ سکتا ہے اور جو لوگ غالب کے محض پاکیزہ اسلوب اور خوبیٔ تحریر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ان کو ان خطوط کے علمی مباحث اور فنی مسائل کی وجہ سے جگہ جگہ اُلجھنا پڑتا ہے اور اس طرح اسلوب کی شیرینی کے ساتھ مباحث کی یہ ترشی ناگوار خاطر ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اردو کے اس شاہکار سے صرف ایسے شہ پارے چن لیے جائیں جو زبان و ادب کے لحاظ سے دلچسپ ہوں اور ان علمی و فنی بحثوں کو علاحدہ کر دیا جائے جو تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لیے کارآمد ہیں نہ کہ غالب کے اسلوب خاص سے لطف اندوز ہونے اور

اردو نثر کے پاکیزہ نمونوں سے واقف ہونے والوں کے لیے''۔ ۱۵؎

ڈاکٹر زور اردو زبان بین الاقوامی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صرف شعر اوادب پر توجہ نہیں کی بلکہ زبان کے دوسرے مسائل پر بھی خود متوجہ ہوئے اور دوسروں کو بھی متوجہ کر دیا۔ اردو زبان کے مختلف مسائل جو زور کے عہد سے چلے آ رہے ہیں جن کی طرف انھوں نے توجہ کی ان میں لغت اور املا کے مسائل، تعلیم و تدریس، نفسیات ولسانیات کے مسائل وغیرہ شامل ہیں۔

اردو املا کے مسائل پر توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو اب ہندوستان اور پاکستان کی حدوں کو توڑ کر بہت دور دور پھیل چکی ہے اور روس اور امریکہ جیسے دور دراز اور اہم ملکوں میں بھی اسکی تعلیم و تعلم کا انتظام کیا جا رہا ہے ایسی صورت میں ضروری تھا کہ اردو املا کے بارے میں ایک سائنٹفک کتاب مرتب کی جائے''۔ ۱۶؎

اردو میں انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت کو ڈاکٹر زور نے بہت پہلے محسوس کیا تھا اور اس کی طرف توجہ بھی دلائی۔ مخزن علوم وفنون کے دیباچہ میں انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت، اہمیت اور مسائل کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''عنوانوں کے تعین اور مقالہ نگاروں کے انتخاب ہی پر یہ کام ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مقالے کا مسودہ وصول ہونے کے بعد صحیح معنوں میں کام شروع ہوتا ہے۔ مواد کی جانچ اور زبان کی تنقیح، مسودے کو مبیضہ میں بدلنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بعد طباعت کے مراحل شروع ہوتے ہیں اور ہر منزل میں متعلقہ ماہرین کا علمی اشتراک اور بالغ نظری از بس ضروری ہے''۔ ۱۷؎

علم بلاغت وعلم عروض پر اردو زبان میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ڈاکٹر زور اس موضوع کو بہت ہی آسان اور دلنشین انداز میں لکھنے پر زور دیتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے اس موضوع پر کتابیں شائع کی گئیں۔ ''بلاغت'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''عروض معانی، بیان اور بدیع سے متعلق فارسی اور اردو میں بڑی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا اسلوب بیان اتنا پیچیدہ اور ترتیب اتنی ناقص ہے کہ طلبہ ان سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان قدیم کتابوں کی ایک اور

خصوصیت جو اردو کے طلبہ کے لیے ان کو غیر ضروری بنا دینے کا باعث ہوتی رہی وہ عربی اور فارسی اشعار اور مثالوں کی فراوانی ہے۔ اس لیے ادارہ ادبیات اردو نے ان اصحاب کے لیے جو اپنی زبان کی شاعری اور انشا پردازی کے محاسن کو سمجھنا چاہتے ہیں عروض و بلاغت کی جدید کتابیں خاص طور پر تیار کرائی ہیں جن میں زیر نظر کتاب بلاغت سے متعلق ہے''۔۱۸؎

اردو ادب کی تاریخ پر زورؔ نے توجہ دی، ان کا خیال تھا کہ تاریخ ادب کو تحقیقی اور سائنٹفک انداز پر ترتیب دیا جانا چاہیئے۔ ''مہینوں کی کہانیاں'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''پہلے خیال تھا کہ ڈاکٹر بیلی کی انگریزی کتاب کو اردو میں منتقل کر دیا جائے لیکن جب اس خیال سے کام شروع کیا گیا تو محسوس ہوا کہ اس میں بعض غیر ضروری بحثیں درج ہیں اور بعض ایسی تحریکیں اور اہم معلومات شامل نہیں ہیں جن کے بغیر تاریخ اردو ادب لکھنے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ترجمے کا خیال ترک کر کے تالیف کا طریقہ اختیار کرنا پڑا............اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس تاریخ ادب اردو کی ترتیب بالکل تحقیقی اور سائنٹفک بنیاد پر کی گئی ہے اس معاملے میں ڈاکٹر بیلی کی تاریخ بہت پیچھے ہے کیوں کہ اس میں زبان اور خیالات کی تبدیلیوں اور فطری ارتقاء کے مطابق دور نہیں بنائے گئے ہیں''۔۱۹؎

ڈاکٹر زور طلباء اور بچوں کی ذہنی سطح اور ان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں لکھنے کے آرزومند تھے۔ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن کے مطالعے سے بچوں کے اخلاق و عادات پر مثبت اثر مرتب ہو۔ ''مہینوں کی کہانی'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''راست نصیحت سے بچوں کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر مرتسم نہیں ہوتا جتنا کہ ''حدیث دیگراں'' سننے سے اثر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قوم نے چوہے اور بلی اور چڑیا اور کوّے کے پیرایے میں اشرف المخلوقات کے نونہالوں کو زندگی اور حسنِ عمل کے اعلیٰ سے اعلیٰ سبق سکھلائے ہیں''۔۲۰؎

ڈاکٹر زور نے اپنے دیباچوں سے نہ صرف نفس مضمون پر سیر حاصل بحث کی بلکہ اس کے ضمن میں بہت سی معلومات کو پیش کرنے کی سعی کی، وہ ہرفن مولا تھے۔ اردو زبان وادب کے تعلق سے کام کے جتنے میدان ہو سکتے ہیں ان سب میں ڈاکٹر زور نے طبع آزمائی کی اور اپنی تحقیق کے ذریعہ اس کے میدان کو وسیع کیا۔

ڈاکٹر زور نے لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم جدید کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ نذر محمد قلی قطب شاہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''نومبر ۱۹۵۶ء میں جب قدیم ریاست حیدرآباد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ہندوستان کے نقشے سے غائب ہوگئی اور شہر حیدرآباد آندھراپردیش کا پایہ تخت قرار پایا اور آندھراپردیش کے نقشے چھپ کر سامنے آئے تو سب کو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی ملک ہے جو محمد قلی قطب شاہ کے زیر نگیں تھا اور جس کے لیے اس نے شہر حیدرآباد بطور پایہ تخت بسایا تھا اور جس ملک کے تلگو شاعروں کی سرپرستی اور عام رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اس فیاض بادشاہ نے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے''۔۲۱

ڈاکٹر زور اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح اور سیاسی وفرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کو عام کرنا چاہتے تھے۔ حضرت میر محمد مومنؒ کے دیباچہ میں اپنے اس خیال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کتاب اور اس کے علاوہ ''حیاتِ محمد قلی قطب شاہ'' اور نیم تاریخی افسانوں کے مجموعوں ''گولکنڈے کے ہیرے'' اور ''سیر گولکنڈہ'' کی ترتیب سے مولف کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس قسم کے ضروری موضوعوں کی طرف لوگ متوجہ ہوں اور ملک کی شائستگی اور رواداری کے قدیم ترین اسباق کا اعادہ کریں۔۲۲

ڈاکٹر زور کے دیباچے عموماً مختصر ہوتے تھے۔ ان کے جملے بھی مختصر مگر جمع ہوتے اور ان میں بڑے پتے اور دور اندیشی کی بات بھی ہوتی۔ ایسے چند جملے یہاں نقل کیے جارہے ہیں جو ان کی حکیمانہ اور فلسفیانہ مزاج کی غمازی کرتے ہیں۔

''جو قوم اپنے بزرگوں کے سرمایے اور تجربے سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے حریفوں سے پیچھے رہ جاتی ہے''۔۲۳

''یہ ہمارا سب سے پہلا فریضہ ہے کہ نام نیک رفتگان کو ضائع ہونے نہ

دیں۔ ان کی حیات اور کارناموں کے مطالعے سے مستفید ہوتے رہیں اور اپنے مستقبل کو بنانے میں ان سے سبق حاصل کریں''۔۲۴

''اپنے ملک کے مشہور لوگوں کے حالات معلوم کر کے بچوں میں خود اعتمادی اور ترقی کی اُمنگیں پیدا ہونے لگتی ہیں''۔۲۵

''وہ (میاں دادخاں سیاح) اگرچہ یار باش، زندہ دل اور نرم دم اور گرم نفس انسان تھے لیکن یہی چیزیں ہم چشموں میں بغض و حسد بھی پیدا کرتی ہیں''۔۲۶

ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری عمومی اور رسمی نہیں بلکہ افادی اور مقصدی ہے۔ ان میں اختصار، جامعیت، بلاغت، نفس مضمون پر معلومات کا خزانہ، تنقیدی بصیرت، تحقیقی مزاج ہوتا۔ مجموعی طور پر ان کے دیباچے گراں قدر معلومات کا خزانہ ہیں اور اس فن میں یقیناً لاثانی ہیں۔

حواشی

۱ قدرت نقوی، سیّد، دیباچہ ایک صنف سخن (مضمون)، مشمولہ: ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۱ء

۲ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۷۲ء

۳ محمد افتخار شفیع، اصنافِ نثر، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۲۶۱

۴ عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، مشمولہ: ادبی اصطلاحات (پروفیسر انور جمال)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۲۰۱۲ء، ص: ۳۷

۵ محمد افتخار شفیع، اصنافِ نثر، ص: ۱۲۵

۶ احمد ندیم قاسمی، خط، مشمولہ: اردو ادب میں مقدمہ نگاری کی روایت (ارم سلیم)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۹

۷ محمد احسان الحق (مرتب)، کربل کتھا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص: ۴۳

۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مقدمات عبدالحق (اضافہ شدہ ایڈیشن)، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۶۸

۹۔ ڈاکٹر زور۔ روح تنقید، ص ۳۰

۱۰۔ ڈاکٹر زور۔ روح تنقید، ص۔ ۲۱

۱۱۔ ڈاکٹر زور۔ بحوالہ۔ مغنی تبسم، ڈاکٹر زور حیات، شخصیت اور کارنامے۔ ص ۴۱۶

۱۲۔ ڈاکٹر زور۔ بحوالہ۔ مغنی تبسم، ڈاکٹر زور حیات، شخصیت اور کارنامے۔ ص ۴۱۶

۱۳۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ مثنوی طالب و موہنی۔

۱۴۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ ''گولکنڈے کے ہیرے'' ص ۶

۱۵۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ روح غالب

۱۶۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ 'اردو املا'' ص ۶

۱۷۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ مخزن علوم و فنون یعنی انسائیکلو پیڈیا ص ا۔ ب

۱۸۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ ''بلاغت'' ص ۳

۱۹۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ ''مہینوں کی کہانیاں'' ص ۵

۲۰۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ ''مہینوں کی کہانی'' ص ۵

۲۱۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ ''نذر محمد قلی قطب شاہ'' ص ۳۔۴

۲۲۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ ''حضرت میر محمد مومن۔ ص۔ ۷

۲۳۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ ''''میر محمد مومن'' ص ۱۳

۲۴۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ 'سر سید احمد خاں'' ص ۳

۲۵۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ ''رفیقِ اردو داں'' ص ۵

۲۶۔ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ ''محمد حسین آزاد'' ص ۷

☆ چھٹواں باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب

ڈاکٹر زور کی مرتبہ نگارشات کا جائزہ

☆ تذکرہ مخطوطات جلد اول ☆ تذکرہ مخطوطات جلد دوم
☆ تذکرہ مخطوطات جلد سوم ☆ تذکرہ مخطوطات جلد چہارم
☆ تذکرہ مخطوطات جلد پنجم

ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب

تذکرۂ مخطوطات

ڈاکٹر زور کو قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان میں کئی صلاحیتیں تھیں۔ دکنی زبان و ادب کی بازیافت اور قدیم مخطوطات کے تعارف میں انہیں دلچسپی تھی۔ فن مخطوطہ شناسی میں انھیں غیر معمولی ملکہ اور درک تھا۔ دکن کی سرزمین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ فن مخطوطہ شناسی کی طرف یہیں کی شخصیتوں نے توجہ مبذول کی، حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری کے بعد اہم نام ڈاکٹر راہی کا ہے۔ ڈاکٹر زور نے تمام لوازمات کے ساتھ مخطوطہ شناسی کے فن کو رواج دینے کی کوشش کی اور اس میں بلند مقام پایا۔

قیام ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کے بعد ڈاکٹر زور نے بڑی جانفشانی اور محنت سے ادارہ کے ذخیرہ نوادرات میں اضافہ کیا۔ ان نوادرات میں قدیم بادشاہوں کے فرامین، یادداشتوں، پروانوں، دستاویزوں، احکام، اسناد، سکوں، کتبوں اور مہروں، تصویروں، وصیلوں اور خطاطی کے اعلیٰ نمونے شامل کیے اور قیمتی اور نایاب مخطوطات کو جمع کرنے کے سلسلے میں انھیں نہ صرف دور دراز سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا بلکہ مذہبی خانقاہوں، درسگاہوں، درگاہوں، عبادت گاہوں اور اہل علم حضرات کے گھروں کی خاک چھاننی بھی پڑی۔ تب جا کر انھیں اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''تذکرۂ مخطوطات کی ترتیب کے سلسلے میں مؤلف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنھیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہو۔ اگر مخطوطوں کے مصنفوں کے نام سنہ یا زمانۂ تصنیف اور زمانۂ کتابت وغیرہ کی تحقیق میں بیسیوں قلمی و مطبوعہ کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی اور بڑا وقت صرف ہوا''۔[1]

ڈاکٹر زور نے اپنی ذاتی کوشش و تحقیق سے ادارہ ادبیات اردو میں بیش بہا اور انمول مخطوطات جمع کیے۔ ادارہ کا

کتب خانہ مخطوطات کے اعتبار سے دنیا کے چند اہم کتب خانوں میں سے ایک ہے۔اس کتب خانے سے اساتذہ، طلبہ اور ریسرچ اسکالرس آج بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ منجملہ اس کتب خانے میں ڈاکٹر زور تذکرہ مخطوطات جلد پنجم کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔

''ادارے کے جملہ ۱۵۰۰ مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (پانچ جلدوں میں) منظر عام پر آ رہی ہیں ابھی چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اور اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے''۔[۲]

ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔اس کے چوبیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں محمد اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر دونوں کے اشتراک عمل سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ڈاکٹر زور نے نہ صرف قلمی کتابوں کی فہرست بنائی بلکہ ان مخطوطہ کے تعلق سے دستیاب مواد اور متن کو فہرست میں شامل کر دیا۔انھوں نے جو مخطوطات جمع کیے ہیں ان میں اردو، عربی، ہندی، سنسکرت زبان کے مخطوطات ہیں۔

ڈاکٹر زور نے مخطوطہ کے تعارف کے سلسلہ میں احوال و کوائف کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوسری جلدوں کی طرح اس پانچویں جلد میں بھی مخطوطات کی خصوصیات پر زور دیا گیا ہے۔

مصنفوں اور شاعروں کے حالات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں ان کے بارے میں صرف حوالوں اور ماخذوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ تحقیق کرنے والے اصحاب کتابوں تک پہنچ جائیں ان جلدوں کی ترتیب کا بڑا مقصد یہی ہے کہ ادارے میں جو مخطوطے محفوظ ہیں ان کی نسبت اہل ذوق اصحاب اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو علم ہو جائے کہ ادارے میں کیا کیا کتابیں موجود ہیں''۔[۳]

ایک کامیاب مخطوطہ شناس کے لیے ضروری ہے کہ تحقیقی نگاہ کا حامل ہو۔مخطوطہ شناسی کے فنی لوازمات سے وہ لیس

ہواور مخطوطہ کی ترتیب وتوضیح سے پوری طرح واقف ہو۔ ڈاکٹر زور چند اہم اور نادر مخطوطات کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۱) متعدد ایسے شاعروں کے مجموعوں کی اس میں تفصیلات درج ہیں جن کے کلام تو کجا خود ان کے ناموں اور تخلصوں سے اردو دنیا اس سے پہلے واقف نہ تھی۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

فدوی اورنگ آبادی	دیوان	واجد دہلوی	دیوان
بسمل مدراسی	بیاض	مفتوں اورنگ آبادی	دیوان
سیف وانور	دیوان	ملک محمود جوہر	مثنوی جوہر عشق
شہوار مظفر	دیوان	اشفاق	دیوان
یعقوب	بیاض	متین	بیاض
بہادر اولیاء حیتی	مثنوی	مستعان علی	مثنوی
خالق	مراثی		

(۲) ''بعض شاعروں مثلاً محبّ، مکھن، معزز، مفتوں، عاصی دہلوی وغیرہ کے تخلص تذکروں میں ملتے تھے مگر ان کے کلام کے مجموعوں کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔ حسن اتفاق سے یہ ادارے میں محفوظ ہو گئے اور ان کا ذکر اس جلد میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

(۳) ''بعض مشہور اساتذہ کی نئی کتابوں کے مخطوطوں کا حال اس جلد میں درج ہے مثلاً ملک خوشنود ''بازار حسن'' اور ''نور نامہ'' شمس الدین محمد فیض ''شرح الفیض''۔ ملا وجہی ''تاج الحقائق کا مرمہ نسخہ'' ڈاکٹر احمد حسین مائل ''قصائد'' ضیاء الدین پروانہ ''دیوانِ دوم''۔[۴]

ڈاکٹر زور نے قیام انگلستان کے دوران مخطوطہ شناسی کے فن سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہندوستان لوٹے تو مخطوطات کو جمع کرنے کی دھن نے انھیں اس راہ میں لگایا اور وہ مخطوطات کی بازیافت، ترتیب وتوضیح میں جٹ گئے۔ ڈاکٹر زور کی مخطوطہ شناسی کے تعلق سے نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لندن کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرست جو ڈاکٹر ریتھے ریو اور بلوم ہارٹ نے لکھی ہیں، دنیائے ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں..... ڈاکٹر زورؔ صاحب نے بھی اسی نہج پر ادارۂ ادبیات اردو کے تاریخی موشگافیاں کرنے واقعات کو روایت و درایت کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور اپنی معلومات سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ ہر آئینہ سے قابل ذکر ہیں''۔۵

ڈاکٹر زور کی ترتیب دی گئی وضاحتی فہرست، اختصار اور طوالت دونوں پر مبنی ہے جہاں کہیں تفصیل درکار ہوتی ڈاکٹر زور کی تحقیق و تفتیش کے دروازے کھل جاتے۔ عام طور پر تذکرۂ مخطوطات میں اختصار ہی کو روا رکھا جاتا ہے۔ ورنہ طویل مباحث کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر زور کے طویل تعارفی کلمات ان کے تحقیقی مزاج کے غماز ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اس طویل و بسیط تعارف کے ذریعہ، فن مخطوطہ شناسی کو تحقیق کے قریب پہنچا دیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے مخطوطہ شناسی کے دوران بنیادی حوالوں کے علاوہ ثانوی حوالوں سے بھی مدد لی ہے اور ضعیف متن اور مشکوک حوالہ جات کا سہارا بالکل نہیں لیا۔ ڈاکٹر زور نے اکیلے ۱۵۰ مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی۔ ظاہر ہے اس دشوار گذار اور مشکل مرحلہ میں کہیں کہیں سہو ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار ایک سہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مثال پیش کرتے ہیں:

ڈاکٹر زورؔ نے ''تذکرۂ مخطوطات جلد دوم'' کے صفحہ ۹۳ پر سید یوسف شاہ راجو قتال حسینیؒ والد بزرگوار حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ کے مخطوطے ''تحفۃ النصائح کا تعارف کروایا ہے اور اس کا سنہ تصنیف ۷۹۵ھ تحریر کیا گیا ہے جب کہ ۷۳۱ھ میں حضرت سید یوسف شاہ راجو قتالؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس مخطوطے کے دیگر نقولات کا ذکر تذکرۂ مخطوطات جلد دوم صفحہ (۹۳۔۹۴۔۱۰۴) جلد سوم صفحہ ۲۳۱ تا ۲۳۴ پر بھی کیا گیا ہے اور ہر نسخہ کے تعارف کے دوران مخطوطے کا سنہ تالیف ۷۹۵ھ درج ہے جو نہ صرف تحقیقی رو سے غلط ہے بلکہ تاریخی دلائل بھی اس کی نفی کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد کی رحلت کے ۶۴ سال بعد کی تاریخ کو سنہ تالیف قرار دیا جائے۔۶

اس طرح کی مثالیں ڈاکٹر زور کے یہاں بہت کم ملتی ہیں۔ان کے فنی محاسن معائب پر پوری طرح حاوی نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر زور کی مخطوطہ شناسی میں تحقیق کے ساتھ رائے زنی اور تنقیدی رجحان بھی نظر آتا ہے۔''کلیات سراج'' کے مخطوطہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ڈاکٹر مجید بیدار نے اس ضمن میں پروفیسر سروری سے اختلاف کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے اس کو ڈاکٹر زور کی ''تقابلی تنقید'' کا نام دیا ہے۔اقتباس حسب ذیل ہے:

> ''سب سے پہلے ''درصفت حق سبحانہ تعالیٰ گوید'' کا عنوان قائم کر کے وہ مثنوی لکھی ہے جس کو پروفیسر سروری نے ''حمد باریٔ تعالیٰ'' کے عنوان سے اپنے مرتبہ کلیات مطبوعہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات میں صفحہ ۱۲۳ پر درج کیا ہے۔اس میں اور اس مخطوطہ کی مثنوی میں کچھ لفظی اختلافات بھی ہیں.....مطبوعہ کلیات میں یہ مناجات صفحہ ۱۲۶ پر درج ہے لیکن اس مخطوطہ میں تین شعر زیادہ ہیں۔اس طرح مطبوعہ مثنوی ناقص الاول ہے اس کے علاوہ بہت غلط بھی ہے..... مثنوی مناجات کے بعد زیر نظر مخطوطے میں نعت لکھی ہے جو مطبوعہ کلیات کے صفحات ۱۲۸,۱۲۹ پر شائع ہوئی ہیں۔اس میں بھی ایسی ہی غلطیاں اور اختلافات ہیں .....نعت کے بعد صفت چار یار لکھی ہے جس کے آخری دو شعر مطبوعہ کلیات میں نہیں ہیں۔اس کے بعد مثنوی شروع کی ہے جو مطبوعہ کلیات کے صفحہ ۱۰۵ پر مناجات کے عنوان سے شروع ہوتی ہے .....اس کے بعد ''پیغام فرستادن سوئے دل رہا'' کا عنوان قائم کیا ہے جو مطبوعہ کلیات میں ''نامہ شوق'' کے نام سے جداگانہ مثنوی کے طور پر صفحہ ۱۱۳ پر شروع ہوتی ہے اس کے بعد عنوان ہے ''نامۂ اعمال''، ''احوال نوشتہ است'' جس کو مطبوعہ کلیات میں ''خطِ بندگی'' اور ''مطلب دل'' کے عنوانات سے دو مثنویوں کی شکل میں شائع کیا گیا ہے''۔[۷]

ڈاکٹر زور مخطوطہ شناسی کے فن میں ماہر تھے۔ترقیمے پڑھنا، داخلی اور خارجی شہادتوں سے نتائج اخذ کرنا وغیرہ سے وہ بخوبی واقف تھے۔اس میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔سید حرمت الاکرام ڈاکٹر زور کی مخطوطہ شناسی کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ان کی دوسری تصنیفات وتالیفات سے قطع نظر اگر حیدرآباد اور باقی ماندہ پورے ہندوستان کے مخطوطات ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیے جائیں تو اس میں حیدرآباد سبقت لے جائے گا جس کا سہرا ڈاکٹر زورؔ کی ذات واحد کے سر ہے''۔ ۸؎

درجہ بالا اقتباس ایک حقیقت ہے۔ کیوں آج بھی طلباء و محققین ان کے جمع کیے ہوئے مخطوطوں سے استفادہ کررہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ اس طرح علم وادب کا دائرہ وسیع ہوتا رہے گا۔

ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطات میں ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ مذہبی، اخلاقی، تاریخی موضوعات کو بھی جگہ دی ہے۔ ان تذکرہ مخطوطات اس طرح ہے۔

علوم قرآن وحدیث، فقہ وعقائد، تصوف وعرفان، پند واصلاح، تبلیغ ومناظرہ، تاریخ سیر ومناقب، نظم دیوان، کلیات، بیاض، منظوم قصے، نثری حصے، لغت، قواعد وعروض وانشا جیسے علوم کی مخطوطہ شناسی کا جائزہ لیا ہے۔

تذکرہ مخطوطات جلد اول

تذکرہ مخطوطات کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے پہلی بار شائع ہوئی۔ اس میں ۳۹۶ صفحات ہیں۔ دوسو پچہتر (۲۷۵) مخطوطات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں پہلی جلد کا عکسی ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ اس جلد میں (۷۵) مخطوطات ایسے ہیں جن کا کوئی اور نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے علاوہ کسی اور کتب خانے میں نہیں ملتا اور پچاس مخطوطات ایسے ہیں جنھیں خود مصنفین اور شعراء نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا ان پر ان کے دستخط موجود ہیں۔ اس میں متعدد ایسے نسخے بھی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوسکے۔ اس جلد میں دکنی شعراء وادباء کے علاوہ شمالی ہند کے مصنفین کی قلمی کتابیں بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ان مخطوطات کا نہ صرف خلاصہ پیش کیا بلکہ مصنف کے واقعات حیات، کتاب کی ادبی قدر و قیمت اور اس کے ماخذوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس جلد میں ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ھ اور ۱۲۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء کے درمیان کے عہد سے تعلق رکھنے والی قلمی کتابوں کی تفصیل موجود ہے۔ بعض مخطوطات مختلف فرماں رواؤں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ جیسے محمد قلی قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ، علی عادل شاہ ثانی والیٔ بیجاپور، عبداللہ قطب شاہ والیٔ حیدرآباد، واجد علی شاہ والیٔ لکھنو، نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور وغیرہ۔

ڈاکٹر زور نے آخر میں مخطوطات کی فہرست بلحاظ زمانہ تصنیف بھی شامل کی ہے۔

اس جلد میں معطئین مخطوات کے اسمائے گرامی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس میں نواب عنایت جنگ اپنی لائبریری سے تقریباً سو(۱۰۰) مخطوطات عطا کیے۔ ان مخطوطات میں چند اہم اور نادر مخطوطات کی تفصیل یہ ہے۔

سلسلہ نمبر	مخطوطہ نمبر	عنوان کتاب	مصنف	سنہ	زبان	فن
۱	۵۵۰	معارف محمدیہ (مثنوی)	بہادر اولیاء حسینی	۱۰۰۰ھ	عری، فارسی	مثنوی
۲	۲۵۰	تحفۃ النصائح	سید محمد یوسف حسینی	۱۰۵۷ھ		
۳	۱۴۸	کلیات سودا (معہ دیباچہ فارسی)	مرزا محمد رفیع سودا	۱۱۹۴ھ	اردو	شاعری قصائد
۴	۳۱/۹۲/۱۰۰	روضۃ الشہدا (مختلف سنین کے ۳ نسخے)	محمد فیاض ولی ویلوری	۱۱۳۰ھ	اردو	واقعات کربلا
۵	۱۷	چندر بدن ومہیار	مقیمی	۱۱۲۸ھ	دکنی اردو	مثنوی
۶	۸	سیف الملوک و بدیع الجمال	غواصی	۱۰۳۸ھ	دکنی اردو	مثنوی
۹	۱۲۵	تناولی	فقیر اللہ شاہ حیدر	۱۲۴۴ھ	دکنی اردو	قصبہ بہ شکل مثنوی
۱۰	۲۲۵	شرح چغمنی (مکتوبہ مصنف مترجم)	شاہ علیح متوطن ادھونی	قریب ۱۲۵۰ھ	اردو ترجمہ	علم ہیئت
۱۱	۲۳۴	تاریخ بدر نواب بدر عالم (بیگم واجد علی شاہ اختر) مرتبہ واجد علی شاہ	واجد علی شاہ اختر	۱۲۷۶ھ (مصنفہ ومکتوبہ	اردو	خطوط

(سب رس، نومبر ڈسمبر ۱۹۹۶ء ص ۵۰)

ڈاکٹر زور نے ان نایاب مخطوطات کو ادارہ کی لائبریری میں محفوظ کر دیا۔ اس جلد میں اشخاص کتب اور مقامات کے ناموں کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں ۱۴۲۰ھ سے ۱۹۰۵ء کے درمیانی دو لگ بھگ پانچ سو سال کی کتابوں کا بیان کیا گیا ہے۔ فہرست اس طرح ہے:

۱۔ مخطوطات کی فہرست بہ لحاظ زمانہ تصنیف

۲۔ قلمی کتابوں کے عطیے دہندگان کی فہرست

۳۔ اشخاص، کتب اور مقامات کے ناموں کا اشاریہ

تذکرہ مخطوطات جلد دوم

تذکرہ مخطوطات کی دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں شایع ہوئی۔ اس میں کل ۵۵۴ مخطوطات، عربی کے ۴۸، فارسی کے ۲۵۰، اردو کے ۲۵۱ اور ہندی کے ۵۰ کو موضوعات بحث بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے قول کے مطابق دوسری جلد کی اشاعت بہت جلد اور سرعت کے ساتھ کی گئی۔ دوسری جلد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۳ء میں جو تذکرۂ اردو مخطوطات شائع ہوا تھا۔ اس میں مخطوطوں پر تفصیلی اور تقابلی ڈالی گئی تھی۔ اب نہ اتنا وقت تھا اور نہ اگلی سی صحت اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ کم سے کم وقت اور محنت میں زیادہ مخطوطات کا ایک اجمالی تذکرہ قلم بند ہو جائے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر تذکرۂ مخطوطات کی یہ دوسری جلد مرتب کی گئی ہے اس میں ۵۰۰ قلمی کتابوں کی تفصیلات پیش نظر ہو گئی ہیں''۔
>
> ۹

دوسری جلد میں ۱۴ کتابیں ہندو مصنفین و مؤلفین کے ہیں، پورے ہندو کاتبوں کی تعداد ۲۳ ہے۔ اور ۱۴ قلمی کتابیں قدیم ہندی اور سنسکرت تصانیف کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ دو درجن کے قریب مخطوطات کی کتابت ۱۳۳۶ء اور ۱۵۵۱ء کے درمیانی زمانے کی ہے۔ ابتداء میں زیادہ تر اردو مخطوطات کو جمع کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن اس ضمن میں بعض عربی و فارسی کی قلمی کتابیں دستیاب ہو گئیں جو تحقیقی و تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہیں۔ سنسکرت اور قدیم ہندی کی ۱۴ تصانیف کا بھی ذکر ہے۔ عربی کی مشکاۃ المصابیح مخطوطہ نمبر ۱۲۸۸ ایک ایسی کتاب ہے جس کی کتابت ۷۳۷ھ میں کی گئی تھی۔ اس جلد میں بعض کتابیں نادر اور گرانقدر ہیں۔ جیسے ان دیوان فارسی میر درد، دیوان اردو میر درد، توزک قطب شاہیہ، تاریخ عادل شاہ، کلیات الحقائق، دیوان برہمن وغیرہ۔ اس جلد میں فہرست مخطوطات بہ لحاظ موضوع اور اشاریہ شامل ہیں۔

تذکرہ مخطوطات جلد سوم

تذکرہ مخطوطات کی تیسری جلد کو ۱۹۵۷ء میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے ڈاکٹر زور نے شایع کیا۔ اس میں اردو کے دو سو تاریخی مخطوطات کا ذکر ہے اور ایسے کئی شعراء و ادباء کا ذکر ہے جن سے اردو دنیا زیادہ واقف نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور نے انھیں متعارف کروایا۔ بعض ناموں اور تخلصوں سے اردو دنیا ناآشنا تھی یا واقف نہ بھی تھی تو ان کے کلام کے

مجموعوں سے نابلد تھی۔ جیسے محبّ، مکھن، معزز، مفتوں، عاصمی دہلوی وغیرہ۔ اس جلد میں کچھ ایسے مخطوطات بھی ہیں جن کی نقلیں یا نسخ ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں میں نہیں ملتے ان میں سے بعض صرف یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس میں بعض قلمی نسخے حیدرآباد کی تہذیب وثقافت کے آئینہ دار ہیں اور تاریخ کے اہم گوشوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اس تذکرہ کا آخری مخطوطہ ۷۰۰ نمبر میں تقریباً اردو کے پچاس شعراء منتخب سلام، نوحے اور مرثیے کا انتخاب دیا گیا ہے۔ یہ سارا انتخاب ڈاکٹر زور نے بیاض مراثی وسلام کے تحت دیا ہے۔ تذکرہ میں تینوں جلدوں کی اجمالی فہرست بھی شامل ہے جس میں اردو، فارسی، عربی اور ہندی مخطوطات شامل ہیں۔ آخر میں اشاریہ کے تحت کثیر التعداد ادیبوں، شاعروں اور ان کی تصانیف کا ذکر موجود ہے۔ اس تذکرہ میں بھی ڈاکٹر زور نے معطئین مخطوطات کی فہرست بھی دی ہے۔ اس جلد کا دوسرا عکس ترقی اردو بیورو کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔

تذکرہ مخطوطات جلد چہارم

تذکرہ مخطوطات کی چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۰۰ قلمی کتابوں کی توضیح ہے۔ اس جلد میں تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ، دواوین، نعت وانشا اور علوم وفنون سائنس، ریاضی وغیرہ کے دوسو کتابوں کا توضیحی تذکرہ ہے۔ ہر کتاب کے مصنف اور سنہ تصنیف اور اس کے مندرجات کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ تذکرہ اردو شائقین ادب اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

اس جلد کو بعض وجوہات کی بناء پر اہمیت ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی خوش نویسی کے نمونوں کی توضیحات محفوظ ہیں۔ مخطوطات نمبر ۸۹۲ سے ۱۸۹۹ ایسے نادر ونایاب نسخے ہیں جن کی خطاطی سورت کے محمد زاہد علی ولد حسن محمد نے کی ہے۔ جو ایک اعلیٰ پایے کے خطاط تھے۔ اس کے علاوہ ادارے میں مشہور ومعروف خطاط محمد مومن، محمد اعظم بہادر شاہی، محمد کاظم گیلانی، اخلاص رقم، محمد تقی ولد محمد مومن اعظم شاہی کی خوش نویسی کی ایک البم بھی محفوظ ہے جسے میر رستم نے ۱۱۱۵ میں تیار کروایا تھا۔ چوتھی جلد میں جنوبی ہند کے اعلیٰ پائے کے خطاطوں اور خوش نویسوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ دکن کے جتنے شاہکار اور ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں اتنے اور کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔

ڈاکٹر زور نے اس مخطوطہ میں ایک نام یا تخلص کی دو یا زائد ادبی شخصیتیں ہونے پر ان کی مفصل صراحت کر دی ہے تاکہ محققین کے لیے سہولت ہو۔ اس وضاحتی فہرست سے محققین کے لئے نہایت آسانی اور سہولت فراہم ہوگئی ہے۔

تذکرہ مخطوطات جلد پنجم

تذکرہ مخطوطات کی پانچویں جلد ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ آخری جلد ہے۔ اس جلد میں سلسلہ نشان ۹۰۱ سے ۱۱۵۰ تک یعنی ڈھائی سو کتابوں کا تذکرہ موجود ہے۔ اس جلد کے کل صفحات ۳۴۶ ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اس جلد میں مصنفین کے واقعات حیات کے سلسلہ میں صرف ماخذوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پانچویں جلد میں بھی مخطوطوں کی خصوصیات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، منصفوں اور شاعروں کے حالات کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ صرف حوالوں اور ماخذوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ تحقیق کرنے والے اصحاب کتابوں تک پہنچ جائیں''۔[۱۰]

اس جلد میں فہرست اس طرح ہے۔

(۱) کتابوں کے عطیہ دہندگان کے نام (۲) پانچویں جلدوں کی اجمالی فہرست

(۳) پانچویں جلد کی فہرست بہ لحاظ موضوع (۴) اشاریہ

ڈاکٹر زور نے مخطوطات کی فہرست موضوع کے اعتبار سے کی ہے اور کتابوں، شخصیتوں اور مقالات کا بہ لحاظ حروف تہجی اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔ اس جلد کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر زور نے لکھتے ہیں:

> اس میں ۲۵۰ مخطوطات سے بحث کی گئی ہے اور اس کی اشاعت کے بعد ادارے کے جملہ ۱۱۵۰ مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (۵ جلدوں میں) منظر عام پر آ رہی ہیں۔ ابھی تقریباً چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں جنکی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے''۔[۱۱]

ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرے ایک عام آدمی کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہیں کیوں کہ اس میں صرف کتابوں کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ مصنف، کتابت اور متعلقہ اشخاص و مقامات کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔ کئی شعراء کے کلیات اور دیوان، مذہبی کتابیں، تاریخی مواد اور تذکرے اور اصحاب علم و فن کے بیاض و یادداشتیں اور خطوط کی تفصیل بھی فراہم کر دی ہے۔ ڈاکٹر زور نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ ریزی سے پانچ جلدوں میں مخطوطات کی تفصیل فراہم کر دی۔ ڈاکٹر زور سے

قبل بھی مخطوطات پر دیگر شخصیتوں پروفیسر سروری، شمس اللہ قادری، نصیرالدین ہاشمی وغیرہ نے کام کیا لیکن ڈاکٹر زور نے تشنہ طلب امور کو مکمل کیا اور مخطوطے کی ظاہری حالت جیسے تقطیع اوراق، نہج خط، مسطر، سنہ تصنیف، سنہ کتابت، کاتب کا نام، کاغذ روشنائی وغیرہ تک کا تذکرہ کیا اور مخطوطے تمام ناقص پہلوؤں کی حالت کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ اس کی سدھار اور استحکام کے لیے بھی کوشش کی اور اس کو محفوظ کر دیا۔

ڈاکٹر زور کے تذکرۂ مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے اردو محققین کے لیے تحقیق کی راہ آسان کر دی اور اپنی تحقیقی ولسانی اور تنقیدی صلاحیتوں کے ذریعہ فن مخطوطہ شناسی کو عروج پر پہنچا دیا اور مخطوطہ شناسی کو ایک فن کا درجہ عطا کیا۔ یہ کہنا بلا مبالغہ ہوگا کہ مخطوطہ شناسوں کی فہرست میں ان کا نام پیشہ جگمگا تا رہے گا اور اردو دنیا ان کے کارناموں سے ہمیشہ استفادہ کرتی رہے گی۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر زور۔تذکرہ اردو مخطوطات، جلد اول ص ۱۳

۲۔ ڈاکٹر زور۔تذکرہ اردو مخطوطات، جلد پنجم۔دیباچہ

۳۔ ڈاکٹر زور۔تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم ص ۵۔۶

۴۔ ڈاکٹر زور۔تذکرہ مخطوطات جلد سوم ص ۶۔۷

۵۔ سب رس کراچی، زور نمبر، ۱۹۷۹ء ش ۱۱۰۔۱۱۱۔منقولہ: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، حیات، شخصیت اور کارنامے، مغنی تبسم ص ۳۶۷

۶۔ مجید بیدار ڈاکٹر۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، حیات، شخصیت اور کارنامے، مغنی تبسم ص ۳۷۰

۷۔ ڈاکٹر زور۔تذکرۂ مخطوطات جلد سوم صفحات ۱۱۴۔۱۱۵ مخطوطہ ۵۵۹

۸۔ سب رس کراچی ''زور نمبر'' ص ۱۰۴) (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، مغنی تبسم ص ۳۶۶

۹۔ ڈاکٹر زور۔تذکرۂ اردو مخطوطات جلد دوم ص ۲۵

۱۰۔ ڈاکٹر زور۔تذکرہ مخطوطات جلد پنجم ص ۵

۱۱۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔حیات، شخصیت اور کارنامے۔از۔مغنی تبسم ص ۳۵۸

☆ ساتواں باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ

ڈاکٹر زور کی سوانحی اور تاریخی نگارشات کا جائزہ

☆ حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ☆ حیات میر محمد مومن ☆ گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو ☆ سرگذشت حاتم ☆ سرگذشت غالب ☆ داستان ادب حیدرآباد ☆ فرخندہ بنیاد حیدرآباد ☆ سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ

ڈاکٹر زور ایک محقق، نقاد اور ماہر لسانیات کے علاوہ سوانح نگار اور مورخ بھی تھے۔ انھوں نے تاریخ اور سوانح کے عنوان پر کئی کتابیں اور مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔ اپنی تحقیق سے جدید انکشافات اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخی واقعات کو جانچ پرکھ کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی تصانیف کے مطالعے کے بعد انھیں بہ حیثیت مورخ اور سوانح نگار صف اول میں مقام دیا جا سکتا ہے۔

سوانح نگاری کی تعریف

سوانح نگاری کے ذریعہ ایک شخصیت کی زندگی کے حالات تفصیلی طور پر جمع کرتے ہوئے شخصیت اور اس سے متعلقہ عہد کو محفوظ کر دیا جاتا ہے اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں افراد کی زندگیوں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ دیگر اصناف کی طرح سوانح نگاری کا فن بھی انگریزی ادب کے زیر اثر اردو زبان میں رائج ہوا۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں سوانح عمری کی یہ تعریف کی گئی ہے:

''سوانح عمری کسی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے۔''[1]

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سوانح عمری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سوانح حیات کا مطالعہ ایک خاص نقطہ نظر سے مطالعہ فطرت ہے اور اس کا لکھنا حقیقت میں فطرت نگاری ہے۔ سوانح حیات ایک ریکارڈ ان ارتسامات کا ہوتے ہیں جو گونا گوں خارجی واقعات اور داخلی تاثرات کے تسلسل سے تشکیل پاتے ہیں۔''[2]

انسانی تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادب کی اصناف میں بھی تنوع پیدا ہوتا گیا۔ انیسویں صدی میں چھاپہ خانوں کے عام ہونے سے کتابوں اور اخبارات و رسائل کا چلن عام ہونے لگا۔ تعلیم کے فروغ کے ساتھ لوگوں کی توجہ اپنے اطراف اور اپنے ماضی میں گزری ان سرکردہ شخصیتوں کی جانب ہوئی جن کی شخصیت اور ان کے کارنامے و خدمات اس قابل تھے کہ انھیں محفوظ کر کے آنے والی نسلوں

کے لیے ان سے رہنمائی کا کام لیا جا سکے۔ ایسے ماحول میں افراد کی زندگی کے حالات قلم بند کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ جو متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھوں نے کسی علم یا فن میں کمال حاصل کیا تھا یا اپنے کردار اور تعلیمات سے معاشرے کو فائدہ پہنچانا تھا۔ سوانح میں ہیرو کے کارناموں کے بیان کے ساتھ اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جانے لگا۔ سوانح دو قسم کی ہوتی ہیں تاریخی اور ادبی۔ تاریخی حیثیت سے اس میں فرد کی زندگی کے واقعات سچائی کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ ادبی حیثیت میں سوانح کے اسلوب اور سانچے کے ذریعہ جمالیاتی ذوق پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جدید سوانح نگاروں میں ''پلوٹارک'' اور ''باسول'' شہرت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی سوانح میں کسی انسان کے حالات ہی قلم بند نہیں کیے بلکہ ایک روح کی مکمل تحقیق کی ہے۔ داستان کی طرح سوانح میں بھی ابتدا سے آخر تک دلچسپی برقرار رکھنا سوانح کی کامیابی کی علامت سمجھا جاتا ہے سوانح میں شخصیت کی سیرت بے نقاب ہوتی ہے غیر جانب داری کے ساتھ شخصیت کے ذاتی اور نجی حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ایک معمولی انسان سے لے کر عظیم ترین شخصیات بھی سوانح کا موضوع ہو سکتی ہیں۔ سوانح نگار تصوراتی نہیں بلکہ ایک حقیقی شخصیت کی مرقع کشی کرتے ہیں اور اس دوران مکالمے، لطائف، ظرافت، خطوط اور افسانے کا رنگ استعمال کرتے ہوئے کسی شخصیت کی سوانح میں دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ صابرہ سعید ایک اچھے سوانح نگار کے لیے درکار مہارت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ ایک مکمل تصویر پیش کر دے جو کسی انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام حالات، افکار و افعال کی تاریخ وار نقوش سے مزین ہو۔۔۔ ایک مستقل سیرت میں انسان کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔۔۔ سوانح نگار کو اپنی موضوع کی شخصیت اور کارناموں کو واضح طور پر پیش کرنا پڑتا ہے۔۔۔ سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو ایک انسان کی حیثیت سے سے پیش کرے۔ اس کی شخصیت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہوں تا کہ اس کا ہیرو ایک جیتا جاگتا انسان معلوم ہو اور وہ اپنی انفرادیت کی تمام گہرائیوں اور داخلیت کی ساری

وسعتوں کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔'' ۳؎

اردو ادب میں حالی نے ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' جیسی جامع سوانح عمریاں لکھ کر سوانح نگاری کی ایک پختہ روایت قائم کی جسے آگے چل کر شبلی نعمانی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے پروان چڑھایا۔

سوانح نگاری کی تعریف، اس کے فنی لوازم اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر زور کی سوانحی نگارشات کا تنقیدی جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر زور کی سوانحی نگارشات کا جائزہ

اس ضمن میں ڈاکٹر زور کی تصانیف حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، حیات میر محمد مومن، سرگذشت حاتم، گارساں دتاسی، سرگذشت غالب، سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب کو سوانح و تاریخی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔

حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ: اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، بانی شہر حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء۱۶۱۱ء) کی مکمل تاریخی، سوانحی اور ادبی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ایک بادشاہ کی مکمل سوانح حیات ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری اس کتاب کے مضامین اور خصوصیات کلام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ فرماں روا سلطنت گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ کی سوانح عمری ہے مگر ایسی مکمل سوانح حیات ہے جس میں کہ سلطان کے ذاتی حالات پیدائش آغاز شباب اوائل شباب کی صحبتیں اور رندی و مستی، جوانی و رعنائی تعلیم و تربیت اور عاشق مزاجی شعر و شاعری، تصوف و عرفان اور حافظ کا اثر، عیش و عشرت کی فراوانی، بارہ پیاریاں یعنی ننھی، ساونلی، کونلی، پیاری، گوری چھبیلی، لالا سلالن، موہن، محبوب، مشتری اور بھاگ متی یا حیدر محل (یہ بارہ مہ جبینیں) ایسی ہیں جو خاص طور پر سلطان کی منظور نظر تھیں کیوں کہ محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتے تھے) کی محبت کے افسانے، حب اہل بیت نبیؐ، شیعہ عقائد کی تبلیغ، بھاگ نگر یا حیدرآباد اور اس کی زیبائش و آرائش کے سامان، مراسم محرم، بادشاہی عاشور خانہ، بادشاہ کے مرثیے،

عاشورہ محرم کا نظام العمل، اس زمانے کے رسم و رواج، عیدوں اور تہواروں کی ترویج، عید میلا دالنبیؐ، عید میلا دعلیؑ، عید غدیر، شب برأت، عید رمضان، عید قربان، نوروز، بسنت، مرگ یا آمد برسات کی تقریب معرکہ اارائیاں تدبر و سیاست یعنی دکن کے سیاسی توازن کا خیال مغلوں سے لڑائی بیرونی تعلقات، ہندو رعایا کی سرپرستی، ایرانیوں اور اجنبیوں کی نگہداشت و قدر افزائی، تامل، اولاد اور وفات، کلیات اردو، انتخاب کلام اردو اور خصوصیات کلام کے مضامین پر ناقدانہ انداز میں سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ نویں حصے میں بادشاہ کی فارسی شاعری کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ آخری حصہ میں بادشاہ کی زندگی کی اہم تاریخیں، ماخذ اور حوالے درج کیے گیے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں بتایا گیا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے آخری اور گیارہویں صدی کے ابتدائی سال بادشاہ کی زندگی کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ دکن کی تہذیب وتمدن اور تاریخ کے سنوارنے میں بادشاہ نے اہم حصہ لیا۔ انہی دنوں میں حیدرآباد کی تعمیر و تکمیل ہوئی اور بادشاہ کے مذہبی عقائد پختہ ہوئے۔ ڈاکٹر زور نے بادشاہ کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بہت ہی چھان بین اور گولکنڈہ و حیدرآباد کے بے شمار عمارتوں، مقبروں اور عاشور خانوں اور مختلف کتبوں کی تلاش کے بعد دو سال کے عرصہ میں یہ کتاب مکمل کی۔ اس کتاب کی اشاعت سے اردو کی سوانح عمری میں اضافہ ہوا اور بحیثیت مورخ ڈاکٹر زور کی شناخت ہوئی۔ تاریخی موشگافی کر کے بڑی تحقیق کے بعد واقعات قلمبند کی ہیں۔ قطب شاہی عہد کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشرتی زندگی ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے حیات محمد قلی قطب شاہ لکھ کر اردو ادب کی دنیا میں سلطان قلی قطب شاہ کو ہمیشہ کی زندگی عطا کر دی۔

''یوں تو محمد قلی قطب شاہ تین سو چالیس سال قبل ہی فوت ہو چکا ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ اب تک زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک کہ اردو زبان دنیا میں موجود ہے۔ وہ اردو کا پہلا محسن تھا اور اس نے زبان کی اس وقت دستگیری کی جبکہ وہ اس کی محتاج تھی۔ محمد قلی نے اردو پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر سے نہ ہو سکا۔ اس نے نہ صرف اردو شاعروں اور ادیبوں کی قدر افزائی کی بلکہ خود بھی اردو کا ایسا رسیا تھا کہ اس زبان میں

پچاس ہزار شعر لکھے۔ گویا بارہ سال کی عمر کے بعد سے اوسطاً ہر روز اس نے چار پانچ شعر ضرور لکھے ہوں گے۔ اس کے اردو کلام کی گونا گونی اور وسعت سے پتہ چلتا ہے کہ کاروبار سلطنت کے بعد اگر اس کو کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ اردو شعر و سخن تھا کیونکہ یہی اس کے عشق و عاشقی کے جذبات اور عیش و عشرت کے بہترین ترجمان ثابت ہوئے تھے''۔ ۵

اس کتاب کو بڑے دلکش اور دل نشین لہجہ میں لکھا گیا ہے اس کا اسلوب بھی اور زبان بھی شگفتہ ہے۔ کتاب کے ہر حصہ کے آغاز میں ڈاکٹر زور نے نہایت اختصار کے ساتھ اس حصہ کی اہمیت بیان کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ڈاکٹر زور کی اس کاوش پر کلمات تحسین ادا کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''قدرت نے اس کام کے لیے ڈاکٹر زورؔ کو چن لیا اور انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ خادم زبان و ادب ہوتا تو ان کا پہلے ہی سے مسلم تھا۔ مورخ وہ اب نکلے۔ کتاب قابل دید ہے۔ مفصل بھی جامع بھی اور بقدر امکان مستند بھی۔ مورخانہ شان، ادبی آن دونوں موجود ہیں۔ ہر عبارت سلجھی ہوئی اور شستہ ہر بحث سنجیدہ اور شائستہ''۔ ۶

حیات میر محمد مومن

''حیات میر محمد مومن'' ڈاکٹر زور کی تاریخی سوانحی و ادبی تصنیف ہے اور ان کی تحقیقاتی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۵۸ء میں اس ادارہ سے چھپی۔ کتاب اردو سوانح حیات کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہے۔ میر محمد مومن قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں پیشوائے سلطنت اور وزیر اعظم تھے اور وہ اپنے وقت کے بہتر عالم، آرکیٹکٹ، معلم و سیاست داں بھی تھے۔ شہر حیدرآباد کی تعمیر اور تزئین اور قطب شاہی سلطنت کے فروغ و استحکام میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ جملہ اُمور سلطنت انہی کے نگرانی اور مشورے سے انجام پاتے تھے۔ ان تمام اُمور کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر و مصنف تھے۔ کتاب الرجعت اور رسالہ مقداریہ ان کی مشہور تصنیف ہیں۔ بقول اکبر حیدری ان کا دیوان انڈیا آفس میں موجود ہے۔ ڈاکٹر زور نے میر مومن کے خاندانی حالات، نام و نسبت، ولادت، تعلیم و تربیت، ایران سے ہجرت، دکن میں آمد، قیام حیدرآباد، تعمیر

حیدرآباد، خدمت پیشوائی کے متعلق مستند معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی تاریخ نگاری کا پتہ چلتا ہے۔ ''حیات مومن'' کے تعلق سے ڈاکٹر زور کی اس کاوش پر تبصرہ کرتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

> ''علامہ مومن کے حالات لکھنے کے لیے زورؔ صاحب نے جو تلاش اور تجسس کیا ہے وہ ان کے بہترین مورخ اور عصر حاضر کے بہت بڑے سوانح نگار ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نے ادبیات پر ریسرچ کر کے ڈگری نہیں لی بلکہ بہ حیثیت مورخ انھوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ میر مومنؔ کے حالات جو منتشر اور پراگندہ تھے ان کو جمع کرنے کے لیے نہ صرف بیسیوں کتابوں سے مدد لی ہے بلکہ ان کے آثار قدیمہ اور فن تعمیر پر روشنی ڈالنے کے لیے انھوں نے کئی قصبات اور دیہات کا دورہ کر کے حالات جمع کئے ہیں، کتبات کو پڑھا ہے۔ اس طرح ایک طویل سوانح عمری اردو میں پیش کر کے اس خزانے میں بیش بہا نگینے کا اضافہ کیا ہے''۔
>
> یہ کتاب ۳۱۱ صفحات میں متوسط سائز اور نفیس کاغذ پر ہے اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی زینت و زیبائش دوچند ہوگئی ہے۔[۷]

ڈاکٹر زور نے صرف مومن کے حالات زندگی یا ان کے کارناموں کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس دور کی صحیح ثقافت، تعمیری آثار اور ظروف و اسلحہ پر بھی روشنی ڈالی۔ تاریخ کے بڑے ماخذوں میں قدیم تاریخی آثار، منادر، مساجد، مقبرے، آلات و اسلحہ کا جائزہ لیتے ہوئے ہر گوشہ کی چھان بین کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ماہر لسانیات ہیں بلکہ ایک بڑے پایہ کے مورخ اور سوانح نگار ہیں۔

ڈاکٹر زور نے ایک معتبر سوانح نگار کی طرح میر مومن کی شخصیت و سیرت اور دیگر مصروفیات کی تفصیل بڑی خوبی سے پیش کی ہے اور مومن کی تصانیف کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے فارسی دیوان سے قصائد کے نمونے اور تاریخی قصائد کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔ جب ۱۰۰۱ھ میں سلطان محمد قطب شاہ پیدا ہوئے تو انھوں نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ لکھا اور محمد قلی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ سے ان کی فارسی شاعری پر روشنی پڑتی ہے۔

قطعۂ تاریخ

باز عالم ابتدائے کامرانی کردہ است
ملا بشیر کامرانی می بر دہر سو خبر
دو دمان تر کمان را خوش چراغی بہ فروخت
پر تو شہزادۂ بر چرخ می تابد و گر
رونق عز و شرف سلطان محمد وزاں کہ ہست
بر دو عالم یک صرف از بہر آں عالی گر
خواستم تاریخ آں فرخندہ گو بر عقل گفت
اول کام است و فیروی واقبال و ظفر
چوں دعا بہ دیں نمی دائم ازاں می گوئمش
سرور عالم مثوی در ظل اقبال پدر

''حیات میر مومن'' کی تین سو تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں چونتیس تصاویر بھی ہیں۔اس کتاب کا مواد قدیم قطب شاہی تواریخ اور جدید تاریخوں سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفران قدیم تاریخی کتابوں کی نشاندہی اس طرح کی ہے۔گلزار آصفیہ،محبوب الزمن، حدائق السلاطین، حدیقۃ العالم، تاریخ عالم آرائے عباسی، تواریخ دربار آصف، تاریخ محمد قطب شاہ، تاریخ گولکنڈہ، ماہنامہ بدبان ماثر، گلزار ابراہیم۔

ڈاکٹر زور کی اس تصنیف سے اردو کے تاریخی وسوانحی ذخیرہ میں ایک اہم اضافہ ہے اور سلاطین قطب شاہی کے عہد کی چھان بین کرنے والے محققین کے لیے ایک اہم مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

گارساں دتاسی۔اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو

''گارساں دتاسی۔اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو''۔ڈاکٹر زور کی ایک اور سوانحی تصنیف ہے جس میں اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ گارساں دتاسی کے علمی وادبی کارناموں، طریقہ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کے یورپ کی درسگاہوں، اردو کے

پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتداء میں گارساں دتاسی کی سوانح تفصیل سے قلمبند کی گئی ہے اور ان کی ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور فرانسیسی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے اس لیے انھیں دتاسی کی تالیفات کا براہ راست مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ان تالیفات کے مطالعہ کے بعد دتاسی کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں ڈاکٹر زور کو مستحکم موقف حاصل ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں دیگر یوروپین بہی خواہان اردو کا تذکرہ ہے۔انمیں آرنٹ اسپرنگر، تروبرٹن بمپز، جے پرنسپ ،ٹرویر اور ٹیلر روبک خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر زور کی اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔سوانحی اعتبار سے یہ کتاب بھی اہم مقام کی حامل ہے۔

سرگذشت حاتم

''سرگذشت حاتم'' استاد العشر اظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور ان کے اردو و فارسی کلام پر تبصرہ پر مبنی ہے۔اس کتاب کو ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو سے ۱۹۴۴ء میں شائع کروایا۔اس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) کے ترجمان سہ ماہی ''ہندوستانی'' میں شائع ہوا تھا۔سرگذشت حاتم دراصل حاتم کے ''دیوان زادہ'' کا مقدمہ ہے۔دیوان زادہ کی اشاعت میں تاخیر کے پیش نظر اس کے مقدمہ کو شایع کردیا گیا۔ڈاکٹر زور کے اس مقدمہ کو اتنی مقبولیت ملی کہ کئی افراد نے ڈاکٹر زور سے ''دیوان زادہ'' کو مرتب کرنے کی خواہش کی۔ڈاکٹر زور نے اس کام کے کرنے کی خواہش کی لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر یہ کام معرض التواء میں پڑ گیا۔ڈاکٹر زور حاتم کی صوفی منشی، بے ریائی اور خوش خلقی سادگی اور خلوص سے متاثر تھے جس کی وجہ سے ''سرگذشت حاتم'' منصۂ شہود پر آئی۔اس تصنیف میں ڈاکٹر زور نے حاتم کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں سے اردو داں طبقے کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ڈاکٹر زور کو لندن میں حاتم کے ''دیوان زادہ'' کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔اس دیوان کی انفرادیت یہ بھی کہ شاعر نے اسے ۱۱۷۹ھ خود تحریر کیا تھا۔اس کے تعلق سے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

> ''اس کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں زبان اردو کے درجہ بدرجہ ارتقا لفظوں اور ترکیبوں کی تبدیلیاں اور محاورے اور لب و لہجے کے اختلاف، تاریخ وار مندرج ہوئے ہیں۔یہ ایک ایسا کم یاب گنجینہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو ہندوستانی زبان کی لسانی ساخت پر غور و خوض

میں مصروف ہیں''۔ ۸؎

ڈاکٹر زور کو حاتم کے تعلق سے مواد یورپ میں ہی دستیاب ہو چکا تھا۔ انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ حسین کو ''دیوان زادہ'' دستیاب نہیں ہوا تھا اور حاتم نے سترہ سال کی عمر میں ہی شاعری کی ابتداء کی تھی۔ حاتم نے دیوان زادہ خود مرتب کیا تھا جس کی وجہ سے شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور ڈاکٹر زور کا یہ بھی خیال تھا کہ ولی کے دلی پہنچنے سے قبل ہی ان کی غزلوں کے کا چرچا ولی میں عام ہو چکا تھا اور حاتم نے ولی کی زمین میں ۱۱۳۱ھ میں غزل لکھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

تاباں ہے اس نگہ سے میرے دل میں نور آج

(دیوان زادہ غزل نمبر ۷)

ولی حاتم کو اپنا استاد مانتے تھے۔ دیوان زادہ کے دیباچے میں وہ تحریر کرتے ہیں:

''درشعر فارسی بطرز مرزا صائب و در ریختہ بطور ولی رحمہم اللہ اوقات بسر می کردو ہر دو را استاد می داند''۔ ۹؎

اس لیے حاتم نے ولی کی زمینوں میں تیرہ غزلیں کہی ہیں جس سے ان کی ولی سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے حاتم کے تعلق سے مستند اور مدلل معلومات فراہم کرنے کی سعی کی ہے۔ حاتم کی میر محمد شاکر ناجؔی سے معاصرانہ چشمک کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کا معرکہ بارہ سال تک جاری رہا۔ حاتم نے ناجی کے جواب میں متانت اور سنجیدگی کے ماحول کو برقرار رکھا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

سخن میں فخر اپنا بن کہے رہتا نہیں ناجی
اسے سمجھائے حاتؔم کس طرح اشعار کہہ کہہ کے

ڈاکٹر زور نے حاتم سے میر کی بھی چشمک کا ذکر کیا ہے۔ میر اپنی استادی کا دعویٰ کرنے لگے تو حاتم انھیں خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کا ایک مقطع یہ ہے:

وہی ہیں ریختہ کے فن میں استاد
جو رہیں گے آشنا حاتم کے فن سے

ایک اور غزل میں ہر ہر علانیہ چوٹ کی ہے:

تھا ابھی ہم پاس ابھی جاتا رہا اوروں کے پاس
آشنائی میں وہ لڑکا گنجنے کا میؔر ہے

حاتم پہلے ایہام گوئی کے قائل رہے پھر وہ سادہ نگاری کی طرف لوٹ آئے۔ ڈاکٹر زور نے اس پہلو کی طرف تنقید نظر سے جائزہ لیا ہے۔ حاتم کی نظمیں قصۂ قہوہ، عرض، حال دل اور قطعہ ہند غزلیں، نکتہ چینوں، روز میثاق، قاصد، خوف ورجا، گورستان، ماتم حسن وحسین، بارھویں صدی نیرنگی زمانہ کا تذکرہ کیا ہے۔

''کتاب کے آخر میں حاتم کے فارسی اشعار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سرگذشت حاتم، ڈاکٹر زور کی تاریخی، سوانحی اور تحقیقی تصنیف ہے۔ اور یقیناً اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

سرگذشت غالب

''سرگذشت غالب'' ڈاکٹر زور کی ایک مختصر تصنیف ہے جس میں غالب کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کی اردو و فارسی نثر و نظم کا اجمالاً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی حیات اور ادبی کارناموں کے علاوہ غالب کے احباب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ غالب کے شاگردوں میں میر مہدی مجروح اور ہرگوپال تفتہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''سرگذشت غالب'' مرزا غالب کی حیات و خدمات کا مختصر تعارف ہے اس میں تحقیقی مباحث نہیں ہیں۔ اس لیے اس تصنیف کو سوانحی یا تاریخی کہا جاسکتا ہے۔

داستان ادب حیدرآباد

''داستان ادب حیدرآباد'' ڈاکٹر زور کی مرتبہ ادبی تواریخ کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ تصنیف پہلی بار ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں ڈاکٹر زور نے ۱۰۰۰ھ سے ۱۳۷۰ھ یعنی تین سو ستر سال کے دوران حیدرآباد میں وجود میں آئے علمی و ادبی تحریکوں اور ان کے پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دوران اس سرزمین سے اٹھنے والی اہم علمی و ادبی شخصیتوں کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دس ابواب ہیں۔ ابواب کی تفصیل اس طرح ہے۔

''پہلا باب ۱۰۰۰ھ تا ۱۰۵۰ھ کے دور اندکنی کے ابتدائی سخن وروں اور ان کی تصانیف کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب عہد ابن خاتون اور ابن نشاطی ۱۰۵۰ھ تا ۱۱۰۰ھ کا احاطہ کرتا ہے۔ تیسرا باب ۱۱۰۰ھ تا ۱۱۵۰ھ کے دور انتشار سے متعلق ہے چوتھے باب میں ادب وشعر کا احیا کے عنوان سے ۱۱۵۰ھ تا

۱۲۰۰ھ کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب عہد ارسطو جاہ ۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۰ کے مشاہیر ادب کے اکتسابات کا تعارف کراتا ہے۔ چھٹا باب چندا اور چندولال ۱۲۲۰ھ تا ۱۲۵۰ھ کے آصف جاہی کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ساتواں باب شمس الامراء اور شمس ھالدین فیض ۱۳۵۰ھ تا ۱۲۸۰ھ اور آٹھواں باب مختار الملک اور وقار الملک ۱۲۸۰ھ تا ۱۳۲۰ھ اور نواں باب عہد کشن پرشاد شاد یمین السلطنت ۱۳۲۰ھ تا ۱۳۵۰ھ کے عہد سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کے حالات و ادبی خدمات کے مطالعہ پر مبنی ہے دسویں اور آخری باب کا عنوان جامعہ عثمانیہ ۱۳۵۰ھ تا ۱۳۷۰ھ ہے اس میں جامعہ سے نسبت رکھنے والے اہل قلم کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے''۔[۱۰]

ان ابواب کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں ابتدا سے لے کر جامعہ عثمانیہ کے فرزندان کی ادبی کاوشوں تک کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کے ایسے بہت سے شعراء کو منظر عام پر لایا جو نئی نسل سے مخفی تھے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر زور نے بڑی تلاش جستجو اور تحقیق سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''یہ کوئی مبسوط تاریخ یا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا جائزہ ہے جو زیادہ تر مؤلف کے تاثرات پر مشتمل ہے اور جس میں پہلی بار اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے نہ صرف شاعروں بلکہ ہر موضوع کے نثر نگاروں کی نسبت بھی ضروری معلومات یک جا کردی گئی ہیں''۔ [۱۱]

اس لیے پروفیسر انور الدین نے اس کتاب کو ادبی تواریخ کے ضمن میں جگہ دی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب ڈاکٹر زور کی تحقیقی صلاحیتوں کا بھرپور آئینہ دار ہے۔

فرخندہ بنیاد حیدرآباد

''فرخندہ بنیاد حیدرآباد'' ڈاکٹر زور کی تاریخی، ثقافتی اور ادبی تصنیف ہے جسے ۱۹۵۲ء میں شایع کیا گیا۔ اس کتاب کے ذریعہ حیدرآباد کے قدیم کلچر سے جدید نسل کو واقف کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کے شاندار ماضی

اور روایات کو ہمیشہ کے لیے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔اس کتاب کے دیباچہ میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد بادشاہت اور مطلق العنان حکمرانی کے معائب اور محاسن دانوں کا مکمل مرقع رہا ہے۔علم و ہنر فضل و کمال اور فنون لطیفہ کی قدر دانی ونشو ونما کے لیے گزشتہ ایک صدی میں راجاؤں اور نوابوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کو ہندوستان کبھی نہ بھلا سکے گا اگر ازمنہ وسطیٰ کی یادگار یہ شخصی حکومتیں نہ ہوتیں اور صاحبان کمال کی قدر افزائی نہ کی ہوتیں تو گزشتہ سو دو سو سال کے مغربی تسلط میں مشرق کے بچے کھچے فنونِ لطیفہ بھی بالکل ناپید ہو جاتے''۔۱۲

ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ کا عنوان تاریخ ہے جس کے ضمن میں حیدرآباد کی تعمیر اور اس کی آبادکاری کے تعلق سے معلومات فراہم کی گئی ہیں اور قدیم عہد کی عمارتیں جیسے چار مینار، دولت خانہ عالی، چندن محل، سجن محل، اعلیٰ محل، حنا محل، داد محل، ندی محل اور محل کوہ وغیرہ کے طرز تعمیر اور ان کی ثقافتی و تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے علاوہ حیدرآباد کے باغات، نہروں، محلوں کی بھی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور قطب شاہی عہد کے بعد کے عمارتوں کی تفصیل بھی فراہم کی گئی ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصہ کا عنوان ''داستان ادب حیدرآباد'' ہے۔''روایات'' کی سرخی کے تحت حیدرآبادی لیل ونہار کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔حصہ دوم میں ''سیر گولکنڈہ'' اور ''گولکنڈہ کے ہیرے'' میں جمع کیے ہوئے ۲۰ افسانوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔جس کی وجہ سے تکرار نظر آتی ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر اس تکرار کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''فرخندہ بنیاد حیدرآباد'' کی حیثیت دراصل قند مکرر کی سی ہے اس کتاب کے حصے اول میں قطب شاہی دور کی جن مختلف عمارات کی مرقع کشی کی گئی ہے ان کی تفصیل اس سے قبل ''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' میں بیان کی جا چکی تھی''۔ ۱۳

ڈاکٹر زور اس کتاب کے دیباچہ ''غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد'' میں شہر حیدرآباد کے تمدن او ثقافت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شہر حیدرآباد نے اپنی زندگی کے تین سو بہتر ۳۷۲ سال ختم کر لیے ہیں
اور اس عرصے میں وہ ایسے صاحب کمالوں، فنکاروں اور اہل ذوق کا گہوارہ رہا
ہے جنھوں نے اس مرز بوم کو ایک خاص تمدن اور معاشرت کی علامت بنادیا
ہے۔ یہاں مذہب و عقاید کی کوئی قید نہیں اور سب باہم شیر وشکر ہوکر ایک
مخصوص ثقافت کو پروان چڑھانے کا باعث ہوئے ہیں''۔[۱۴]

غرض یہ کہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد تاریخی، ثقافتی اور ادبی اعتبار سے ڈاکٹر زور کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں حیدرآباد کی خاص طرز معاشرت، طرز تعمیر کو پیش کرتے ہوئے اہم تاریخی معلومات کو پیش کیا گیا ہے۔

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب

''سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب'' بھی ڈاکٹر زور کی مختصر تصنیف ہے جس میں محمود غزلوی کی علم نوازی اور اس کے زیر سرپرستی علوم وفنون کی ترویج وترقی اور عباسی سلطنت وغزنی کے باہمی تعلقات وروابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مکالمہ سے ڈاکٹر زور کی تاریخی اور ادبی معلومات کی وسعت اور مطالعہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

درجہ بالا تصانیف کی روشنی میں ڈاکٹر زور کو اہم مؤرخین اور سوانح نگاروں کی صف اول میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر زور کی تاریخی اور سوانحی تصانیف کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دکنی تہذیب کے دلدادہ تھے اور اس تہذیب کی بازیافت اور تحفظ کا انہیں جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انہیں ''عاشق دکن'' قرار دیتے ہوئے ضیاء الدین انصاری لکھتے ہیں:

ڈاکٹر زور کی تصانیف کی جہات خاصی متنوع اور رنگا رنگ ضرور ہیں۔
لیکن اس تنوع اور رنگارنگی میں بھی ''دکنی اور دکنیات'' کو ایک جزو لاینفک کی
حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تمام تر کدوکاوش اور تلاش وتحقیق کا مرکز دکن ہے۔
انہیں اپنے وطن سے والہانہ محبت ہے۔ اپنی سرزمین سے عقیدت ہے۔ اور
یہاں کے ذرہ ذرہ سے پیار ہے۔ انہیں دکن کی تاریخ، دکنی ادب، دکنی تمدن، دکنی
معاشرت اور وہاں کی عمارتوں پر فخر ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ان سے
سے عوام کو روشناس کرایا جائے۔ ان کی گم شدہ کڑیاں تلاش کی جائیں اور ان

کے ایک ایک پہلو کو اس طرح اجاگر کیا جائیے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی صحیح
عظمت جاگزیں ہو جائے۔ چنانچہ لسانیات کو چھوڑ کر ان کی تمام تصنیفات اور
تالیفات دکن ہی سے متعلق ہیں۔ حتی کے اپنے افسانوں کے لئے بھی انہوں
نے خام مواد سرزمین دکن ہی سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے ان کو اگر عاشق دکن
کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔'' ۱۵؎

ڈاکٹر زور کی سوانحی اور تاریخی تصانیف کے مجموعی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دکن کی نامور شخصیات کے احوال ان تصانیف کے ذریعے محفوظ کر دئے۔ تاکہ اردو کی آنے والی نسلیں قحط الرجال کے عالم میں مثالی شخصیات کے مثالی کارناموں سے روشنی حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ ان شخصیات سے وابستہ حالات اور واقعات سے دکن کی تہذیبی و سماجی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی سوانحی و تاریخی کتابیں اردو کے سوانحی ادب میں اہم اضافہ ہیں۔ اور ساری دنیا میں دکن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

حواشی

۱ مشمولہ ''اردو ادب میں خاکہ نگاری''، صابرہ سعید، ص:۶۷

۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ''عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے'' حیدرآباد ۱۹۸۷ء، ص:۶

۳ صابرہ سعید ''اردو ادب میں خاکہ نگاری''، ص:۷۷، ۷۸، ۷۹

۴ ڈاکٹر اکبر حیدری۔ مطالعہ زور، ص ۱۱۷

۵ ڈاکٹر زور۔ حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ص ۱۲۳

۶ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مطالعہ زور۔ ایضاً ص ۱۲۴

۷ اکبر حیدری مطالعۂ زور۔ ص ۱۰۴

۸ سیدہ جعفر۔ ڈاکٹر زور۔ ۸۳، ۸۴

۹ سیدہ جعفر۔ ڈاکٹر زور ص۔ ۸۴

۱۰ بہ حوالہ۔ سب رس، نومبر ڈسمبر ۱۹۹۶ء ص ۳۸

۱۱ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ سرگذشت غالب۔ ص ۳۸

۱۲ سیدہ جعفر، ڈاکٹر زور، ص ۹۰

۱۳ سیدہ جعفر، ڈاکٹر زور، ص ۸۹

۱۴ ایضاً ص ۸۹

۱۵ ضیاء الدین انصاری۔ زور صاحب کی تصانیف کا تعارف۔ مشمولہ محی الدین قادری زور۔ ص۔ ۱۷۲

☆ آٹھواں باب

ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر زور کے افسانوی مجموعوں کا جائزہ

☆ طلسم تقدیر

☆ سیر گولکنڈہ

☆ گولکنڈے کے ہیرے

ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر زور ایک ماہر لسانیات، بلند پایہ محقق اور دیدہ ور نقاد ہونے کے علاوہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی تھے۔ دکنی تہذیب کے پیار کو انہوں نے افسانہ نگاری میں بھی برتا اور دکن کی تاریخ کو افسانے کے سانچے میں ڈھال کے یادگار افسانے لکھے۔ لیکن اس فن پر انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی لیکن جس قدر وہ افسانے لکھے اس کے مطالعے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک کامیاب افسانہ نویس تھے۔ ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کے جائزے سے قبل آیئے دیکھیں کہ افسانہ کیا ہے اور اردو میں افسانہ نگاری کی روایت کیا ہے۔

افسانے کی تعریف

افسانہ دور حاضر کی مقبول نثری صنف ہے۔ وقت کی کمی نے افسانے کو مقبول بنا دیا کہ کم وقت میں انسان کوئی دلچسپ قصہ افسانے کی شکل میں پڑھ لیتا ہے اور اس سے اپنا تاثر لیتا ہے۔ افسانے کی بہت سی تعریفیں کی جاسکتی ہیں۔ جیسے ہر وہ نثری تخلیق جس میں پلاٹ ہو، کردار ہوں اور کہانی کا اُتار چڑھاؤ ہو۔۔۔ "افسانہ" کی تعریف میں آتی ہے۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے۔ جیسے ایک یا چند کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو۔ افسانے کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ یہ اپنے اختتام پر قاری کے ذہن پر واحد تاثر قائم کرتا ہے، وحدتِ تاثر کہلاتا ہے۔

اس طرح ہم افسانے کی تعریف یوں کر سکتے ہیں۔

> ''افسانہ زندگی سے متعلق کسی واقعے کا اختصار کے ساتھ ایسا فنکارانہ بیان ہے جس میں وحدت تاثر ہو اور وہ قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑے''۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی: افسانے میں کہانی، کرداروں، مکالموں اور الفاظ کے سوچ سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چونکا دینے والے انجام کے ساتھ قاری کو متاثر کیا جاتا ہے۔ افسانے کو کامیاب بنانے کے لئے کسی قصے یا کہانی کو فنکاری کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ داستان یا ناول کی طرح افسانے کے بھی اجزاے ترکیبی ہیں۔ اور ان اجزاء کے باہم جڑے رہنے سے ایک افسانہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ایک افسانہ جن اجزا سے مل کر مکمل ہوتا ہے اسے افسانے کے اجزائے ترکیبی کہتے ہیں۔ وہ اس طرح ہیں۔
1) موضوع 2) پلاٹ 3) کردار 4) مکالمے 5) زماں ومکاں اور منظر نگاری 6) تکنیک 7) انجام اور وحدت تاثر 8) اسلوب 9) عنوان۔

افسانے کی روایت

اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز انگریزی سے ہوا۔ ناول کے زوال اور ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کے فروغ کی راہ ہموار کی۔ پریم چند ابتدائی دور کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے بعد منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس اور عزیز احمد نے اردو افسانے کو پروان چڑھایا۔ عصمت کے علاوہ خاتون افسانہ نگاروں میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور مشہور ہوئیں۔ نئے دور کے افسانہ نگاروں میں بلراج کومل، سریندر پرکاش، کمار پاشی، دیوندر اسر، نیر مسعود، عوض سعید، اکرام باگ، سلام بن رزاق طارق چھتاری، اقبال متین، جیلانی بانو، علی ظہیر، بیگ احساس وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کی ابتدا

ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۲۵ء سے پہلے ہوتا ہے جب کہ انھوں نے مختلف افسانے لکھ کر ادبی رسالوں میں شائع کرائے۔ اس وقت ڈاکٹر زور ایم اے کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر زور اپنے افسانہ نویسی کے آغاز کے تعلق سے طلسم تقدیر کے مقدمہ بہ عنوان ''سخن ہائے گفتنی'' (۵؍رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ) میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے گزشتہ ماہ سرما کی تعطیلات میں ایک افسانہ لکھا ہے جو ''تازیانہ'' کے عنوان سے رسالہ ''نگار'' میں شائع ہوا ہے''۔[۱]

پروفیسر گیان چند جین کے مطابق ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کی ابتدا دسمبر ۱۹۲۵ء اور جنوری ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ طلسم تقدیر ڈاکٹر زور کا دوسرا افسانہ تھا۔ اس کے مقدمے میں افسانہ لکھنے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

> ''اس (تازیانے) کے بعد ایک انگریزی افسانہ نظر سے گزرا جس کو مایرہ ایچ ورتھ نے غالباً کسی ترکی افسانے سے ماخوذ کیا ہے۔ چوں کہ اس قسم کے خیالات کی ہمیں شدید ضرورت ہے اس لیے میں نے اس امر کی کوشش کی

کہ اس افسانے کو اپنی زبان میں ظاہر کیا جائے''۔[۲]

ڈاکٹر گیان چند جین طلسم تقدیر کو ڈاکٹر زور کی تصنیف نہیں تالیف مانتے ہیں۔ طلسم تقدیر کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ یہ افسانہ دراصل مولوی محمد افضل شریف مدیر رسالہ ''ارتقا'' سکندرآباد کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور شائع بھی انھوں نے کیا اس افسانہ کا مقدمہ عبدالقادر سروری نے لکھا تھا۔

ڈاکٹر زور کے افسانوں کا جائزہ لینے سے پہلے افسانوں کے متعلق ان کے نقطہ نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ''گولکنڈے کے ہیرے'' کے دیباچہ میں ان کا تحریر کردہ ایک اقتباس ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

> ''اس امر کی بے حد ضرورت ہے کہ ہر ممکنہ مواد سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کے مختلف اقطاع کی ایسی تاریخیں مرتب کی جائیں جن میں بادشاہوں اور امیروں کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام اور غریبوں کی زندگی نمایاں ہو۔ درباروں اور حرم سراؤں کی پرتکلف آرائش و زیبائش کے علاوہ بازاری اور پست مکانوں میں رہنے سہنے والوں کی معاشرت بھی ظاہر ہو سکے اور سب سے بڑھ کر وہ اسرار بے نقاب کئے جائیں جن پر اُس زمانے کے لوگوں کے قلبی اطمینان اور راحت و آرام کا انحصار تھا اُن کا اخلاقی معیار کتنا بلند اور پختہ تھا۔ نیک نیتی، خلوص اور ہمدردی ان کی زندگیوں کے اصل مقاصد تھے۔ مذہبی رواداری اور امن پسندی ان کی گھٹیوں میں پڑی تھی۔ قلب و دماغ کی آزادی جتنی ان کو نصیب تھی، موجودہ نسلوں کو شاید ہی نصیب ہو سکے۔ غرض جب تک ان خوبیوں کے خاص نمونے اور ان کے اسباب و علل نہ پیش کئے جائیں، ہماری تاریخیں اور درس گاہیں بیکار ہیں اور ہماری جدید نسلیں ان کے ذریعہ سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے گر نہیں سیکھ سکتیں.....
>
> گولکنڈے کے یہ تاریخی افسانے اسی نقطۂ نظر سے لکھے جا رہے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے اہم خطۂ دکن کے قدیم حکمرانوں، امیروں اور عوام کے ایسے سچے کردار اور اصلی حالات زندگی پیش کیے جا رہے ہیں جن کے مطالعہ سے عہد حاضر کے نوجوان اپنے ملک کی حقیقی عظمت سے واقف ہو سکتے

ہیں.....'' ۳؎

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ ملک کی تاریخی روایات خصوصاً حیدرآباد دکن کے اسلاف کے کارناموں اور ان کے بلند کردار سے نئی نسل کو واقف کرایا جائے۔ ڈاکٹر زور کے افسانوں میں حیدرآباد اور گولکنڈے کی سیاسی، تہذیبی، ادبی اور سماجی زندگی کو سادہ اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں وحدت خیال کے ساتھ ساتھ ''کہانی پن'' بھی موجود ہوتا ہے اور یہی ان کی مقبولیت کی وجہ بھی ہے۔

ڈاکٹر زور کے افسانوں کے کل تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ طلسم تقدیر (۱۹۲۶ء)، سیر گولکنڈہ (۱۹۳۷) اور ''گولکنڈہ کے ہیرے'' (۱۹۳۷ء)

ڈاکٹر زور کی افسانوی نگارشات کا جائزہ۔ طلسم تقدیر

طلسم تقدیر کا مجموعہ بقول گیان چند جین ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا۔ اکرام جاوید اور ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے طبع اول ۱۹۲۵ء لکھا ہے۔ اسی طرح اکثر ادیبوں نے طلسم تقدیر کو ایک نیم تاریخی افسانہ تسلیم کیا ہے لیکن گیان چند جین اس سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

> ''طلسم تقدیر'' اس کے سرورق پر اسے ایک ''نیم تاریخی'' افسانہ ظاہر کیا ہے۔ میری رائے میں یہ سراسر تخیل ہے، تاریخی بالکل نہیں، اس کا موضوع تقدیر وتدبیر کی آویزش ہے''۔ ۴؎

روح اللہ خاں کے ساتھ سوداگروں کے بھیس میں سرشام شہر حیدرآباد کی سیر کرتا ہے۔ شاید اس تمہید کی وجہ سے اس میں تاریخ کا عنصر فرض کر لیا گیا ہو۔ لیکن یہ بھی غیر تاریخی واقعہ ہے۔ اورنگ زیب کب خلیفہ ہارون الرشید کی طرح شہر میں شب گشت کرتا تھا''۔

ڈاکٹر گیان چند جین کے قول کے مطابق قصے کے واقعات پوری طرح تخیلی ہیں اس لیے اس کو کسی بھی طرح تاریخی نہیں کہہ سکتے۔ میرے خیال میں اس کو نیم تاریخی افسانہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تاریخی کردار یعنی اورنگ زیب، گولکنڈہ کے حالات کا ذکر ہے۔ قصہ البتہ تخیلی ہی ہے۔

اس افسانہ میں تدبیر اور تقدیر کی گتھیاں دو بھائیوں بد بخت کمال اور فیاض الدین کے کردار اور حالات زندگی تانا شاہ اور اورنگ زیب کے معرکوں کے ذریعہ سلجھائی گئی ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب اپنے نائب روح اللہ خاں کے

ساتھ سوداگروں کے بھیس میں سرشام شہر حیدرآباد کی سیر کرتا ہے۔ سیر کے دوران دونوں میں تقدیر اور تدبیر کے موضوع پر بحث ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ ہر قسم کی ترقی کا انحصار تدبیر اور محنت پر ہے۔ روح اللہ کا ماننا تھا کہ ترقی و زوال محض تقدیر پر ہی منحصر ہے۔ اس سلسلہ میں وہ دو بھائیوں سے ملتے ہیں۔ پہلے بد بخت کمال سے ملتے ہیں وہ بتاتا ہے کہ ولادت سے لے کر اب تک مصائب و آلام پیچھا نہیں چھوڑتے بدبختی اور بدقسمتی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ اگر کچھ روپیے بھی ملیں تو فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس فیاض الدین بڑا ہی خوش قسمت انسان ہے وہ اپنی عقلمندی اور دانائی کے ذریعہ خوب دولت بٹورتا ہے۔ فیاض الدین اپنے بھائی کی بار ہا مدد کرتا ہے۔ اورنگ زیب دونوں کے حالات سن کر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عقل مندی ہی کامیابی کی ضامن ہے۔ اس نے بد بخت کمال کا نام بے وقوف کمال اور خوش قسمت کا نام خوش قسمت فیاض الدین رکھا۔ لیکن اس کہانی کا انجام فیاض الدین کے لیے بہت ہی عجیب و غریب تھا۔ افسانے کا انجام اس طرح ہوتا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ عقل مند فیاض الدین کے یہاں گولکنڈے کے جتنے ہیرے محفوظ ہیں، ان سب کو شاہی خزانہ میں شامل کر دیا جائے۔ اس پر بد بخت بھائی نے کہا کہ تم پر میری بدبختی کا سایہ پڑ ہی گیا کیوں کہ تم نے اپنے سارے راز اجنبیوں کے سامنے ظاہر کر دیئے۔

ڈاکٹر زور کا یہ افسانہ بقول سیدہ جعفر یہ طویل مختصر افسانہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے داستان اور افسانے کی درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں مافوق الفطرت واقعات کے بجائے روزمرہ کی زندگی کے تجربات کی عکاسی کی گئی ہے ہے۔ ڈاکٹر زور یہ افسانہ زوال گولکنڈہ کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ یہ طویل مختصر افسانہ کل ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

''سیر گولکنڈہ'' ڈاکٹر زور کا دوسرا افسانہ ہے۔ سیر گولکنڈہ پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے سرسری مطالعہ کے طور پر نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سیر گولکنڈہ

سیر گولکنڈہ میں کل ۱۱۶ افسانے اور صفحات ۱۶۰ ہیں۔ یہ افسانے گولکنڈہ کے پس منظر میں ۱۰۱۰ھ سے ۱۰۹۸ھ کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ افسانے سن وقوع کی ترتیب کے ساتھ اس طرح درج کیے گیے ہیں۔

(۱) مشک محل ۱۰۱۰ھ (۲) مکہ مسجد ۱۰۲۳ھ (۳) کھویا ہوا چاند ۱۰۳۶ھ (۴) ملک خوشنود ۱۰۳۶ھ (۵) شہزادی کا عقد ۱۰۴۵ھ (۶) انار کے چودہ دانے ۱۰۹۰ھ (۷) اورنگ زیب و تاناشاہ (۸) کاغذی برج (۹) غیبی امداد (۱۰)

آخری سرفروش (۱۱) خاصے کا وقت (۱۲) مٹی کی کلھیا۔آخری کے چھ افسانے سقوط گولکنڈے کے متعلق ہیں۔

ان تمام افسانوں کی بنیاد مضبوط تاریخی بنیادوں پر قائم ہے۔اس مجموعہ کے دیباچہ میں ڈاکٹر زور نے قطب شاہی خاندان کے سلاطین کی خوبیاں بیان کی ہیں۔دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''نیم تاریخی افسانوں کے اس مجموعہ میں گولکنڈہ کی عظمت کو وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ایک حد تک بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سرزمین کے قطب شاہی حکمرانوں کو اُن لازوال خدمات کی جھلکیں دکھائی گئی ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کی تاریخ، ادبی، تمدنی معاشرتی اور عمرانی نقطۂ نظر سے دنیا کی بہتر سے بہتر اور ترقی یافتہ ممالک کی تاریخوں کے پہلو بہ پہلو رکھی جاسکتی ہے اور رکھی گئی ہے''۔۵

افسانے لکھنے کے بعد آخری میں دس صفحات پر مشتمل ایک مضمون ''گولکنڈہ کی تاریخی عمارتوں کی موجودہ حالت'' لکھا گیا ہے۔اس کے بعد خاندان قطب شاہیہ کا شجرہ دیا گیا ہے جس میں ہر بادشاہ کا سن موجود ہے۔

درج ذیل سطور میں ان افسانوں کا مختصر تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

افسانہ ''مشک محل'' ۱۰۱۰ھ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی سخاوت پر مشتمل ہے۔

گولکنڈہ کا بادشاہ، محمد قلی قطب شاہ اپنے درباریوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہوکر تفریح کے لئے نکلتا ہے۔ایک جگہ تاجروں کا قافلہ ایک امیر کے زیر تعمیر محل کے قریب لمبے عرصے سے پڑاؤ کیا ہوا تھا۔بادشاہ نے طویل قیام کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مشک کے ان سوداگروں کی مشک کا سودا طے نہیں ہوا ہے۔یہ سن کر بادشاہ توشہ خانے کے داروغہ کو حکم دیتا ہے کہ ان سوداگروں کی مشک خریدی جائے۔داروغہ کہتا ہے کہ پہلے ہی سے توشہ خانہ میں مشک کے انبار لگے ہوئے ہیں یہ سن کر بادشاہ حکم دیتا ہے کہ وہ مشک اس امیر کے زیر تعمیر محل کی بنیادوں میں ڈال دی جائے جہاں سوداگروں کا قافلہ پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔چنانچہ اس دن سے امیر کا یہ محل مشک محل کہلانے لگا۔

مشک محل کا پلاٹ مضبوط اور انداز ڈرامائی ہے اس کے علاوہ اس افسانے میں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

''انہی بنیادوں کے قریب ندی کے اس پار ایک نیا قافلہ خیمہ زن ہے جس کے اردگرد بیسیوں اونٹ نظر آرہے ہیں۔صبح کا سہانا وقت ہے آفتاب کی

کرنیں ابھی ابھی بالائی حصار کی بالائی چوٹیوں پر چمکنی شروع ہوئی ہیں۔ گولکنڈہ کی فصیلوں کی طرف سے چند سوار موسیٰ ندی کی آہستہ خرام موجوں کی طرف بڑھتے نظر آرہے ہیں اوران کا رُخ ندی کے پار اس زیرِ تعمیر محل کی جانب پلٹا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ابھی ندی تک پہنچنے نہیں پاتے ہیں کہ اُن کے سردار کی نظر ان اونٹوں اوران کے درمیان کے خیموں پر پڑ جاتی ہے اور فوراً اس کے گھوڑے کی رفتار کم ہوجاتی ہے وہ اپنے قریب کے ایک سوار سے پلٹ کر پوچھتا ہے''

(مشک محل)

منظر نگاری کی دلکشی اس اقتباس سے صاف نظر آرہی ہے۔''مشک محل''افسانے سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی سخاوت اور فیاضی اوران کی تجارت کوفروغ دینے والی پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

افسانہ''مکہ مسجد'' سلطان محمد قطب شاہ صالحیت تقویٰ و پرہیزگاری کا مظہر ہے۔اس افسانے میں وہی مرکزی کردار بھی ہے۔وحدت تاثر کے اعتبار سے یہ افسانہ کامیاب معلوم ہوتا ہے۔افسانہ میں پلاٹ کی سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اس میں وحدت اثر اور وحدت تحریک کی خوبیاں موجود ہیں۔افسانے کے آغاز وانجام میں ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔اس کا انجام بے حد سادہ اور مؤثر لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔افسانہ کا پلاٹ ملاحظہ ہو۔سلطان محمد قطب شاہ ایک جمعہ کومخاطب کر کے کہتا ہے کہ''مکہ مسجد کا سنگ بنیاد وہی رکھ سکتا ہے جس نے بارہ سال کی عمر سے اب تک ایک وقت کی نماز بھی قضا نہ کی ہو''۔[٦]

غرض فنی اعتبار سے یہ افسانہ بھی کامیاب نظر آتا ہے۔

''افسانہ''کھویا ہوا چند''سلطان عبداللہ قطب شاہ اور ملکہ حیات بخشی بیگم کے دور کی سماجی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ایک ماں کی ممتا اوراس کے پاکیزہ جذبات کی عکاسی اس افسانہ میں دلکش اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس افسانہ کوکردار نگاری کی بدولت ایک اہم افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس افسانہ میں شہزادہ عبداللہ قطب شاہ اور ملکہ حیات بخشی بیگم کے دور کی سماجی اور مذہبی رسومات بری سادگی سے بیان کیے گیے ہیں۔

''ملک خوشنود''افسانے میں ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق کی طرف اشارے کیے ہیں۔بقول ڈاکٹر زوردکنی کا معروف شاعر وجہی سلطان قلی قطب شاہ کے بچپن کا ندیم اور مقرب خاص تھا اور قلی قطب شاہ تخت نشین ہونے کے بعد وجہی کوخطاب سے سرفراز کیا اور''قطب مشتری'' لکھنے کی ہدایت کی۔ڈاکٹر زور نے بھاگ متی کے کردار

کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ روایت ڈاکٹر زور نے نظام الدین احمد کی تصنیف ''طبقات اکبر شاہی'' ۱۰۲ء مطابق ۱۵۹۴ کے تتبع میں لکھی ہے۔

ملک خوشنود افسانہ تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ ادبی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ جیسے ڈاکٹر زور نے شعراء کے مختلف گروہ حوض کٹورہ کی مختلف سمتوں کا ذکر کیا ہے جیسے ملا وجہی کا گروہ حوض کٹورہ کا ''مغربی حلقہ'' کہلاتا تھا۔ احمد گجراتی کا حلقہ جنوبی گروہ کہلاتا تھا۔ ملک خوشنود ملا وجہی کا شاگرد تھا اس کی قسمت اور شاعرانہ صلاحیتیں بیجاپور میں چمکیں۔ اور وہ شعراء کی صف میں داخل ہو گیا۔ ملک خوشنود نے عادل شاہ کو بے وفا خواص خان کے پنجے سے بھی رہائی دلائی۔ جس کے عوض سلطان بیجاپور نے ملک خوشنود کو خاص اعزاز عطا کیا تھا۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ نے ملک خوشنود کے مشورے سے غواصی کو گولکنڈہ کا سفیر بنا کر بیجاپور کے بادشاہ کو اس کی کامیابی پر مختلف تحفے تحائف اور بیش بہا انعامات بھیجا تھا۔

اس طرح اس افسانہ میں تاریخی و ادبی معلومات کا وافر حصہ موجود ہے۔ ڈاکٹر زور کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان معلومات کو قصے کے پیرایے میں بیان کر کے اس کو بہت دلچسپ اور مؤثر بنا دیا ہے۔

افسانہ ''شہزادی کا عقد'' بھی قطب شاہی عہد کی ثقافت و کلچر کا بہترین مظہر ہے۔

اس افسانے میں شاہ راجو کے ایک مرید فقیر ابوالحسن تانا شاہ کا عبداللہ قطب شاہ کی بیٹی سے عقد کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانہ میں سلاطین کے دل میں صوفیاء اور فقراء کا احترام، دربار گولکنڈہ میں صوفیاء کا اثر و رسوخ کو پیش کیا گیا ہے اور قطب شاہی عہد کی شادی بیاہ اور مختلف رسومات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً ایک اقتباس میں ابوالحسن تانا شاہ کے ساچق کی تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں۔

> ''دیکھتے دیکھتے ساچق کا دن آ گیا اور دراصل اسی رسم سے شادی اور اس کی دلچسپیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے شاہی فوجوں کا ملبوس، طرح طرح کے باجوں ہنگامہ اور پھر سینکڑوں نازک اندام اور شوخ و شنگ کا ماٹنوں کے سر پر ساچق کی رنگا رنگ ٹھیلیوں کا قلعہ سے شہر کی طرف جانا ایک ایسا پیدا کر رہا تھا جس کو زبان قلم سے بیان کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ جہاں تک نظر دوڑتی ہے یہی رنگین سبو چے قطار در قطار (سر پر لیے چلنے والیوں کی مستانہ رفتار کے ساتھ) ایک رزخار سمندر کی مست موجوں کی طرح حرکت کرتے اور آگے کو

بڑھتے نظر آتے تھے''۔ے

''انار کے چودہ دانے'' میں ڈاکٹر زور نے گولکنڈہ کے آخری بادشاہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے کردار کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ڈاکٹر زور کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تانا شاہ کے چند منفی پہلوؤں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔جیسے وہ ایک عیش پرست اور نازک مزاج بادشاہ تھا۔ڈاکٹر زور نے اسے ایک دور اندیش اور قلندر منش حاکم کے روپ میں پیش کیا ہے۔اس افسانے میں ابوالحسن کے کردار کی بلندی کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔اورنگ زیب جب قطب شاہی قلعہ کے سامنے امامت کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو قطب شاہی نشانہ باز اورنگ زیب پر تیر چلانے چاہتا ہے تو ابوالحسن اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہا ہے۔ظالم کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے''۔

''کاغذی برج'' افسانے میں ڈاکٹر زور نے مغل فوجوں اور قطب شاہی لشکر کے درمیان ہونے والی گولکنڈہ کی آخری جنگ کا منظر اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔قطب شاہی برج کو اورنگ زیب کا لشکر سمار کر دیتا ہے۔لیکن اگلے دن وہ برج کو دوبارہ تعمیر پایا تو وہ تعجب میں پڑ گیے۔لیکن جب لشکر گولکنڈہ میں داخل ہوا اور برج کو غور سے دیکھا تو انھیں انتہائی تعجب ہوا کہ یہ برج کاغذی لکڑی اور ٹاٹ سے تیار کیا گیا ہے۔

''غیبی امداد'' میں محاصرہ گولکنڈہ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔جس کے ضمن میں اہل اللہ کی کرامات اور تصرفات قلمبند کیے گیے ہیں۔

''آخری سرفروش'' اس افسانہ میں ان پانچ سو حبشی مردوں اور عورتوں کی داستان صرف بیان کی گئی ہے جنھوں نے گولکنڈہ کے بادشاہ کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

''خاصے کا وقت'' میں بھی فتح گولکنڈہ کے بعد کے واقعات اور حالات بڑے مؤثر انداز میں پیش کیے گیے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ان کی فطری ہمت ان کا بلند پایہ وقار اور تحمل اور ان کا شیوۂ تسلیم و رضا دنیا میں ہمیشہ آفت زدہ اور غم دیدہ انسانوں کے لیے درس عبرت بنا رہے گا۔ تانا شاہ اور ان کے آخری رفیقوں نے امیری میں قلندری کی ایک ایسی مثال پیش کر دی ہے کہ دنیا کی تاریخ شاید ہی اس کا جواب دکھا سکے''۔۸

اسی طرح قطب شاہی سپہ سالار عبدالرزاق جو عالم نزاع میں ہے جب بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کو قید کر کے اس

کے سامنے لایا جاتا ہے تو عبدالرزاق کی زبان سے یہ کلمات نکلتے ہیں۔

''سلطان ابوالحسن قطب شاہ جیسی ہستی سے بے وفائی کرنا میرے نزدیک کفر ہے۔ میری دلی تمنا تھی کہ ظل اللہ پر سے اپنی جان قربان کر کے میں بھی حضرت امام مظلوم ابی عبداللہ الحسین علیہ السلام کے ساتھی بہتر شہداء میں داخل ہو جاؤں اور خدا کا شکر ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میں کبھی کا ختم ہو جاتا اگر باہر پڑا رہتا۔ یہ صرف بالا حصار کی روح پرور فضا، نگینہ باغ کا جانفزا ماحول اور قربِ سلطانی کا اثر تھا جس کی وجہ سے اس تنِ بے جان میں جان آئی اور بندگانِ عالی کی قدم بوسی کا .....عبدالرزاق پر پھر سے بے ہوشی طاری ہوگئی''۔

''مٹی کی کلہیا'' سیر گولکنڈہ کا آخری افسانہ ہے۔ اس افسانے میں سقوط گولکنڈہ کے واقعات بیان کیے گیے ہیں۔ قطب شاہی سلطان ابوالحسن تانا شاہ کی رخصت کا منظر ڈاکٹر زور نے بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں قطب شاہی کلچر سے جذباتی لگاؤ تھا۔

سوار ہونے سے قبل بادشاہ نے اپنے امراء کا آخری سلام لیا۔ لیکن اسی معمولی انداز میں بادشاہ کا رعب داب ایسا تھا کہ امراء بھی اپنے جذبات ضبط کیے ہوئے تھے جب تک بادشاہ ان کی طرف متوجہ رہے ان کی زبان سے اُف تک نہ نکلا، لیکن ان کے مغیر چہرے بتا رہے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک متلاطم سمندر پوشیدہ ہے اتفاق کی بات تھی یا نہ معلوم جان بوجھ کر بادشاہ نے فصیلوں کے اوپر محل کے جھروکوں کی طرف نظر نہیں اٹھائی ورنہ وہ محل کی پردہ نشینوں کو پریشان حال اور بے تاب دیکھ کر متاثر ہوتے۔ وہ سب دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھی ہوئی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو..... جب بادشاہ کا گھوڑا نظر سے اوجھل ہو گیا اور دنیا ان کے لیے تیرہ و تار ہوگئی تو انھوں نے فلک شگاف نالوں اور آہ دشیون سے بالا حصار اور محلات شاہی کو سر

پر اٹھا لینا چاہا لیکن انھوں نے سوچا کہ دم کے دم میں مغل سپاہی محل کے اندر گھس آئیں گے اور پھر نہ معلوم ہمارا کیا حشر ہو انھوں نے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک ساتھ اس عظیم الشان حوض نما باولی میں گرنے لگیں، جو انھیں جھروکوں کے پیچھے محل کے صحن میں اب تک موجود ہے''۔[9]

سیر گولکنڈہ میں ڈاکٹر زور نے قطب شاہی سلاطین کے عہد کی سیاسی وسماجی اور ادبی زندگی کے متعلق قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان سلاطین کے حسن اخلاق، کردار کی عظمت اہل اللہ اور صوفیائے کرام کی عظمت بھی بیان کی ہے۔''سیر گولکنڈہ'' تاریخی بنیادوں پر قائم ہے اس میں تاریخی حوالات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

طرز تحریر کا اگر جائزہ لیا جائے تو ڈاکٹر زور کا اسلوب نہایت شگفتہ، دلکش اور سادہ ہے ان کے افسانوں میں منظر نگاری کے بہترین مثالیں بھر پائے جاتے ہیں۔

''مشک محل'' افسانے میں لکھتے ہیں:

''انھیں بنیادوں کے قریب ندی کے اس پار ایک نیا قافلہ خیمہ زن ہے جس کے ارد گرد بیسیوں اونٹ نظر آرہے ہیں صبح کا سہانا وقت ہے آفتاب کی کرنیں ابھی ابھی بالا حصار کی بالائی چوٹیوں پر چمکتی شروع ہوتی ہیں گولکنڈے کی فصیلوں کی طرف سے چند سوار موسیٰ ندی کے کنارے آہستہ خرام موجوں کی طرح بڑھتے نظر آرہے ہیں اور ان کا رُخ ندی کے پار اس زیر تعمیر محل کی جانب پلٹا ہوا نظر آتا ہے وہ ابھی ندی تک پہنچنے نہیں پاتے ہیں کہ ان کے سردار کی نظر ان اونٹوں اور ان کے درمیان کے خیموں پر پڑ جاتی ہے اور خود اس کے گھوڑے کی رفتار کم ہو جاتی ہے وہ قریب کے ایک سوار سے پلٹ کر پوچھتا ہے''۔[10]

ڈاکٹر زور کے افسانوں کے پلاٹ سادہ اور دلکش ہیں۔فنی اعتبار سے افسانے شاید مکمل بھی نہ ہوں لیکن ان میں کہانی پن اور دلچسپی ضرور ہے۔

گولکنڈے کے ہیرے

''گولکنڈے کے ہیرے'' ڈاکٹر زور کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں چھ افسانے ہیں۔ یہ مجموعہ بقول گیان چند جین سیر گولکنڈہ سے بالیقین افسانوی لحاظ سے بہتر ہے۔ اس مجموعہ کے افسانے زیادہ طویل اور افسانوی دلچسپی کے حامل ہیں۔ ''گولکنڈے کے ہیرے'' میں ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کے تاریخی مقامات کی سیر کرائی ہے۔ ان افسانوں کا مقصد یہ ہے کہ سلاطین قطب شاہی کے حالات زندگی اور اس عہد کے امیر و غریب کے حالات سے واقف کرایا جائے۔ اس مجموعہ کے دیباچہ میں ڈاکٹر زور نے اپنے نقطۂ نظر کی اس طرح وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''اس امر کی بے حد ضرورت ہے کہ ہر ممکنہ مواد سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مختلف اقطاع کی ایسی تاریخیں مرتب کی جائیں جن میں بادشاہوں اور امیروں کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام اور غریبوں کی زندگی نمایاں ہو۔ درباروں اور حرم سراؤں کی پرتکلف آرائش و زیبائش کے علاوہ بازاری اور پست مکانوں میں رہنے سہنے والوں کی معاشرت بھی ظاہر ہو سکے اور سب سے بڑھ کر وہ اسرار بے نقاب کئے جائیں جن پر اُس زمانے کے لوگوں کے قلبی اطمینان اور راحت و آرام کا انحصار تھا اُن کا اخلاقی معیار کتنا بلند اور پختہ تھا۔ نیک نیتی، خلوص اور ہمدردی ان کی زندگیوں کے اصلی مقاصد تھے۔ مذہبی رواداری اور امن پسندی ان کی گھٹیوں میں پڑی تھی۔ قلب و دماغ کی آزادی جتنی ان کو نصیب تھی۔ موجودہ نسلوں کو شائد ہی نصیب ہو سکے۔ غرض جب تک ان خوبیوں کے خاص نمونے اور ان کے اسباب و علل نہ پیش کئے جائیں ہماری تاریخیں اور درس گاہیں اور ہماری جدید نسلیں ان کے ذریعہ سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے گر نہیں سیکھ سکتیں۔ گولکنڈے کے یہ تاریخی افسانے اس نقطۂ نظر سے لکھے جا رہے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے اسم خطۂ دکن کے قدیم حکمرانوں امیروں اور عوام کے ایسے سچے کردار اور اصلی حالات زندگی پیش کیے جا رہے ہیں جن کے مطالعہ سے عہد حاضر کے نوجوان اپنے ملک کی حقیقی عظمت

سے واقف ہو سکتے ہیں''۔ ۱۱؎

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''بالا'' گولکنڈہ کی آخری ہندو رقاصہ ہے۔ جو آخری بادشاہ کے دیوان مادنا کے بھتیجے کے لیے متعین تھی لیکن وہ سقوط قلعہ کے بعد مغل شہزادہ معظم کے ہاتھوں پکڑی گئی لیکن وہ اس کے ساتھ رہنے سے انکار کردی۔ اس قصہ میں بالا کے کردار کی بلندی، فہم وفراست کو بتایا گیا ہے۔ اس افسانہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس عظیم الشان محل کا گوشہ گوشہ اپنی عظمت گزشتہ پر نوحہ خوانی کرتا نظر آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی نویلی اور آراستہ و پیراستہ دلہن یکا یک بیوہ ہوگئی ہے اور اس کا تمام سنگھار اس کے سہاگ کے ساتھ ختم ہوگیا ہے۔ لیکن اس تباہی کے باوجود اس کے نوعروسی کے آثار باقی ہیں''۔
>
> ''کام بخش کے مضطرب دل کو اس ستم زدہ ماحول اور اُجڑے دیار کا چپہ ہر گھڑی ایک نئی ٹھیس لگاتا تھا جب کبھی کسی دروازہ یا کھڑکی کے اکھڑے ہوئے زریں یا ہاتھی دانت کے نقش و نگار یا چھتوں، محرابوں اور دیواروں کے طلا کار حاشیوں کے باقی ماندہ آثار پر اس کی نظر پڑتی ہے تو اس کی وحشت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ وہ بھی اپنے فتح مند باپ کی ظالم فوجوں اور اس کے متعین کردہ صوبہ داروں کی ان تباہ کاریوں پر افسوس کرتا اور کبھی قطب شاہی حکمرانوں کے ذوقِ لطیف اور سلیقۂ زندگی کی بے تحاشہ تعریف اس کے منہ سے نکل پڑتی''۔ ۱۲؎

دوسرا افسانہ ''پانچ گنڈے'' ہے۔ پانچ گنڈے سے مراد ۲۰ پیسے ہیں۔ اس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ فارغ اوقات میں قرآن مجید کی کتابت کرکے پیسے کماتا تھا اور اس کی ملکہ پنکھے سی کر کماتی تھی۔ بادشاہ کا ایک باورچی اپنے وطن ایران گیا تو بادشاہ نے اسے پانچ گنڈے عطا کیے ان کی برکت یہ تھی کہ ہر پیسے کے عوض باورچی کو ایک ہزار اشرفیاں ملتی تھیں۔

تیسرا افسانہ ''پانچ اشرفیاں'' ہے۔ یہ افسانہ حیات بخشی بیگم کے متعلق ہے۔ جس نے حیدرآباد کے عوام کی مالی اور اخلاقی حالت کا امتحان لینے کے لیے چارمینار کے نیچے صدقے کے طور پر پانچ اشرفیاں اور چاندی کی کچھ اشیاء رکھوادیں۔ لیکن ۹ نو دن تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا جس سے رعایا کی معاشی اور اخلاقی بلندی ثابت ہوتی ہے۔ اس

افسانے میں عبداللہ قطب شاہ کے اقوال بھی درج ہیں۔ مثلاً ایک قول ہے:

''امرا ہمیشہ طاقت وروں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا ضمیر سیاست کا غلام ہوتا ہے غریب ہر وقت اپنے ضمیر کے تابع اور ایمان و ایقان کے پکے ہوتے ہیں اور ان کا جذبۂ وفاداری ہمیشہ قابل اعتماد ہوتا ہے''۔[۱۳]

''پانچ اشرفیاں'' میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ عوام اور گولکنڈہ کے حکمرانوں میں بہت گہری محبت تھی۔ بادشاہ عوام کا خیر خواہ اور ہمدرد تھا تو عوام بھی اس پر جاں چھڑکتے تھے۔

چوتھا افسانہ ''سرد صحرا'' ہے۔ اس میں ابوالحسن کی عشق کا قصہ ہے۔ وہ ایک کسان کی جھونپڑی سے ایک حسین دوشیزہ کو اپنے محل میں لے آتا ہے اور اسے دل دے بیٹھتا ہے لیکن وہ لڑکی ہر طرح کے عیش و آرام کے باوجود خوش نہیں رہتا وہ کہتی ہے:

''یہ سب میرے لیے بیکار ہیں۔ میں اس تنگ و تاریک قید خانے کی تنہائی سے بیزار ہوں مجھے جنگل کے کھلے میدان، لہلہاتا ہوا سبزہ، بہتا ہوا صاف وشفاف پانی، طرارے بھرتی ہوئی ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر آزادی چاہیے۔ خدا کے لیے مجھے آزاد کر دیجیے۔[۱۴]

یہ افسانہ ڈاکٹر زور کی بہترین افسانوی تخلیق ہے۔ پانچواں افسانہ ''دفینہ'' خالص ایک رومانی قصہ ہے۔ اس افسانے کا اہم کردار مرحوم سردار کا مفلس بیٹا ہے جو اپنے گم شدہ ہیروں کی تلاش میں ہے آخر وہ ہیرے ایک خوفناک رساں دار کے گھر کے عقبی باولی میں دریافت ہوتے ہیں۔ وہ وہاں پہنچتا ہے تو اسے رسال دار کی حسین بیٹی نظر آتی ہے۔ ایک بار اس حسین لڑکی کا پاؤں پھلا اور وہ کنویں میں جا گری لیکن ہیرو اسے باہر نکالتا ہے اس منظر کو ڈاکٹر زور نے حسین پیرائے میں پیش کیا ہے۔

''رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ آنکھیں بند کرتا تو باولی اور اس کا منظر سامنے آجاتا۔ آنکھیں کھلی رہتیں تو معلوم ہوتا کہ اس حسین دوشیزہ کو اٹھاتے ہوئے دوڑ رہا ہوں اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی حرکت میرے دل کو محسوس ہو رہی ہے۔ اس کی شیریں آواز کانوں میں گونج رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے اچٹتے ہوئے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔ اس کے نرم

ونازک اعضاء کا میری گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپنا اس کے صاف و پاک جسم
کی میرے بھیگے ہوئے کپڑوں سے آلودگی اور سب سے بڑھ کر ایک ماہ پیکر
دوشیزہ کی اس بے حجابانہ عالم میں ایسی قربت و پیوستگی مردہ دل سے مردہ دل شخص
کو گرمانے کے لیے کافی تھی پھر میں تو ایک ایسا نوجوان تھا جس کو عمر میں پہلی
دفعہ ایک عورت، ایک نازنین، ایک پیکر رنگ و بو، ایک مجسمۂ حسن، ایک غزالِ
رعنا کی قربت نصیب ہوئی تھی''۔ ۱۵

ڈاکٹر گیان چند جین اس افسانے کے تعلق سے کہتے ہیں:

''اس افسانے کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور اگر افسانہ نگاری کی
طرف نکل پڑتے تو یقیناً اس کوچے میں بھی سرخ رو ہوتے''۔ ۱۶

''ننھی سانولی'' ڈاکٹر زور کا ایک رومانی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ دراصل سلطان محمد قطب شاہ کے آغاز شباب اور عشق اول کی درد بھری داستان ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے شاہی محلات کی زندگی کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ کا بھتیجا محمد قطب شاہ محل کی ایک حسینہ ننھی سانولی پر فریفتہ ہوجاتا ہے لیکن ننھی سانولی اپنے محبوب کی سلامتی، ترقی اور اسے سلطنت کا حکمراں دیکھنے کی تمنا میں خودکشی کر لیتی ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ زندگی بھر اپنے محبوب کی قربانی کو بھول نہ سکا۔

ڈاکٹر زور کے رومانی افسانوں میں اس افسانے کو بے حد اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔

''کوہ نور'' (۱۰۶۶ھ) بھی ڈاکٹر زور کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا موضوع یہ ہے کہ محمد سعید، اردستان کے ایک تیلی کا بیٹا تھا جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اسے میر جملہ اور امیر الملک جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ لیکن اس نے اورنگ زیب سے ملکر بادشاہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جو ناکام ہوگیا لیکن اس سے حیدرآباد میں قتل وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ اس افسانہ میں غدار محمد سعید اردستانی کے کردار کو بڑی خوبی سے ڈاکٹر زور نے پیش کیا ہے۔ ''شعلہ انتقام'' افسانے میں بھی عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت کے امرا کی سازشوں اور غداریوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

''چچلم کی رقاصہ'' میں بھاگ متی اور قلی قطب شاہ کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شہزادہ بھاگ متی کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس کی اطلاع بادشاہ کو ملتی ہے تو بادشاہ شہزادہ کو محل میں قید کر دیتا ہے اور محل کی حسین

لڑکیوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ جو کوئی حسینہ چچلم کی رقاصہ کا خیال شہزادہ کے دل سے نکال دے گی وہی اس سلطنت کی ملکہ ہوگی۔لیکن کوئی حسینہ شہزادہ کو اپنی طرف مائل نہ کرسکی۔ایک دن طوفانی بارش ہوئی تو شہزادہ بھاگ متی کے لیے بے قرار ہوگیا اور سب سے نظریں بچا کر موسیٰ ندی کی طرف بڑھنے لگا۔ندی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ شہزادہ پرواہ کیے بغیر اپنا گھوڑا ندی میں ڈال دیتا ہے اور ندی پار کر جاتا ہے اور بھاگ متی کو پالیتا ہے۔

ڈاکٹر زور افسانے کے آخر میں تحریر کرتے ہیں کہ سلطان ابراہیم قطب شاہ اس ندی پر ایک پُل تعمیر کرنے کا حکم دیتے ہیں جس کو شہزادہ نے پار کیا تھا اور آج کل اسے لوگ پرانا پل کہتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس واقعے کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔۱۷

ڈاکٹر زور کا یہ افسانہ گرچہ کہ حقیقت سے قریب نہ ہو لیکن رومانی افسانوں میں اسے ضرور جگہ مل سکتی ہے۔

''گولکنڈے کے ہیرے'' کو مجموعی طور نیم افسانوی نیم تاریخی کہہ سکتے ہیں۔ان افسانوں سے حیدرآباد کی قدیم قدیم تہذیب وتمدن اور تاریخی عمارتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

''گولکنڈہ کے ہیرے'' کے تعلق سے مولوی عبدالحق تحریر کرتے ہیں۔

> ''یہ تو بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمو دیا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی کتاب میں ہیں۔اور نہ وہ لطف کیفیت ہے جو اس کتاب میں ہے۔اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے۔اس میں زمانے کے بادشاہوں،شعراء اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جس سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی''۔۱۸

ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کا عمومی جائزہ

ڈاکٹر زور نے شعوری طور پر افسانہ نگاری کو اختیار کیا۔لیکن ان کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تاریخی افسانے لکھے اور اپنے افسانوں میں دکنی تہذیب وتمدن کو اجاگر کیا۔انہوں نے مختصر اور طویل دونوں قسم کے افسانے لکھے۔ان کے افسانے بے حد مقبول ہوئے اور آج بھی اردو کی نصابی کتابوں کا حصہ ہیں۔انہوں نے

دکن کی حقیقی تاریخ کو اپنے تخیل کی مدد سے ان افسانوں میں دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ باتیں جو تاریخ کا حصہ ہیں وہ ان کے افسانوں میں شامل ہونے کے بعد افسانوی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ افسانے تاریخی ہونے کے باوجود فن افسانہ نگاری کی تکنیک پر پورے اترتے ہیں۔

افسانہ نگاری میں موضوع کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تاریخی افسانہ نگاری میں موضوع کی اہمیت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ افسانہ نگار جو موضوع منتخب کرے اس پر اسے پوری طرح دسترس حاصل ہو۔ ورنہ تاریخ کا کم تر شعور رکھنے سے افسانے کے قصہ پن میں جھول آ جائے گا۔ ڈاکٹر زور چونکہ دکن کی تاریخ پر عبور رکھتے تھے اس لئے انہوں نے دکن کی تاریخ کے موضوع کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر زور اپنے افسانوں میں دکن کی معاشرت کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے انہوں نے اس معاشرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ جیسے:

> ''دن کے وقت زرق برق لباس پہنے ہوئے شاہی خدام کا طرح طرح سے سجے ہوئے ہاتھیوں اور اونٹوں اور گھوڑوں پر قلعہ سے شہر اور شہر سے قلعہ کو آنا جانا ہر ہاتھی اور اونٹ کی جداگانہ آرائش اور زیبائش امیروں کے ہاتھیوں پر قسم قسم کی وضع کی روپہلی اور سنہری عماریوں کا دھوپ میں جگمگانہ اور نقالوں اور بھانڈوں کے حیرت انگیز کرتب اور رات میں طرح طرح کے رنگ اور زہرہ جبیں طوائف کے ناچ اور گانے۔ ۱۹

ڈاکٹر زور کے افسانوں میں پلاٹ سیدھے سادھے ہیں۔ ان میں کوئی کشمکش یا گھماؤ پھراؤ نہیں پایا جاتا۔ وہ کہانی کو تخیل کا رنگ بھی دیں تو اس حد تک دیتے ہیں کہ وہ حقیقت سے قریب لگے۔ ان کے پلاٹ چست اور سادہ ہوتے ہیں۔ کہانی کے سہارے وہ قاری کی توجہ برقرار رکھتے ہیں۔ اگر کہانی میں جھول پیدا ہو جائے تو قاری کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر زور کے افسانوں کے پلاٹ کے تعلق سے پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> ''ان افسانوں کے پلاٹ سادہ اور دلکش ہوتے ہیں۔ ان میں نہ عروج کا کوئی خاص اہتمام ہوتا ہے اور نہ ڈرامائی مکالموں کا التزام۔ ڈاکٹر زور کے افسانوں میں کہانی پن اور دلچسپی کی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور کے افسانے قاری کی توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر اسے تھوڑی دیر کے لئے مسحور کر دیتے ہیں۔ ان کہانیوں کو ہم ایک بار شروع کر دیں تو ختم کئے بغیر نہیں رہ

سکتے۔اسی میں ڈاکٹر زور کے افسانوں کی شہرت اور مقبولیت کا راز مضمر ہے۔''

۲۰

ڈاکٹر زور کے افسانوں میں پلاٹ کے علاوہ منظر نگاری' واقعہ نگاری' کردار نگاری اور زبان و بیان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔انہوں نے دکنی ماحول میں پرورش پانے کے باجود خالص اردو زبان میں یہ افسانے لکھے۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ بیان میں تصنع نہیں پایا جاتا۔ڈاکٹر زور کے افسانوں میں کہیں کہیں دکنی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ چونکہ وہ دکن کے تھے اس لیے دکنی انداز تحریر پایا جانا امر محال نہیں ہے۔جیسے الٹا پلٹا کر، لانبی چوڑی چتالیٹ جانا وغیرہ ان الفاظ کی تعداد بہت ہی کم ہے۔بات میں خوبی پیدا کرنے کے لئے تشبیہات واستعارات کا بھی برمحل استعمال کرتے ہیں۔ایک افسانے میں تشبیہ کے استعمال سے معنوں میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

''انسانوں کا سیلاب ہے کہ ہر گلی کوچے سے چار مینار کی طرف جانے
والی سڑکوں میں داخل ہو رہا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں سڑکیں بڑے
بڑے دریا ہیں۔ جن میں چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالوں سے آنے والے
سیلابوں کی وجہہ سے طغیانی کے آثار نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔انسانی سیلاب
ایک ہی مرکز کی طرف بہہ رہا ہے۔'' ۲۱

ڈاکٹر زور کے افسانوں میں کردار نگاری کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔تاریخی افسانوں میں تاریخی کردار ہوتے ہیں اور ان سے متصف اوصاف کے بیان سے کردار میں جان پڑتی ہے۔ڈاکٹر زور نے شاہی کرداروں کے علاوہ سماجی کردار بھی اپنے افسانوں میں پیش کئے۔ جیسے میر جملہ۔ننھی سانولی۔ بھاگ متی۔غواصی۔ ملک خوشنود۔ بالا۔اشرف اور بانو وغیرہ۔جیسے کردار ہوتے ہیں وہ ان کرداروں کی مناسبت سے زبان اور مکالمے پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے چونکہ اپنے افسانوں کے لئے تاریخ سے موضوعات کا انتخاب کیا اس لئے افسانے کے ناقدین نے انہیں افسانہ نگار ماننے سے انکار کردیا۔ بلکہ انہیں تاریخی مرقع نگار قرار دیا۔ڈاکٹر اسلم پرویز اس طرح کا خیال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ افسانے تخلیقی نہیں بلکہ وہ مرقعے ہیں جن کے ذریعے مصنف نے
دکن کے قطب شاہی دور کی بازیافت کی۔'' ۲۲

ڈاکٹر زور کے افسانے دکن کی تاریخ کے حسین مرقعے ہونے کے ساتھ ساتھ افسانوی رنگ کے حامل ہونے کی

وجہہ سے مکمل افسانے ہیں۔صرف موضوع اور کہانی کے تاریخی ہونے کے علاوہ ان افسانوں میں فن افسانہ نگاری کے دیگر لوازمات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر زور کے افسانوں کو کامیاب افسانے قرار دیتے ہوئے پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر زور کے تاریخی افسانے اس لئے بھی غیر معمولی طور پر کامیاب ہیں کہ یہ افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔مختصر افسانے کی پہلی اور اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں زندگی کا ایک واقعہ یا ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔لیکن یہ واقعہ یا جھلک اتنی جامع ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے افسانے کے مرکزی کردار کی پوری زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔جیسے''مشک محل'' میں سلطان کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کیا گیا لیکن اس واقعہ کے ذریعے ہم سلطان کے طرز حکمرانی کو پوری طرح جان لیتے ہیں۔''مکہ مسجد'' میں بھی مسجد کے سنگ بنیاد رکھنے کی یہ شرط رکھی جاتی ہے کہ ایسا شخص مسجد کا سنگ بنیاد رکھے جس کی بارہ سال کی عمر سے نماز قضا نہ ہوئی ہو۔پورے مجمع میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو اس شرط کو پوری کرتا ہو۔لیکن سلطان بڑھ کر سنگ بنیاد رکھتا ہے کیوں کہ وہی اس شرط کو پوری کرتا ہے۔۔مختصر افسانے میں ہر بات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔۔ڈاکٹر زور کے افسانے اس فنی خوبی پر بھی پورے اترتے ہیں۔'' ۲۳

ڈاکٹر زور کا کمال رہا کہ انہوں نے دکن کی صدیوں قدیم تاریخ کو اپنے افسانوں میں محفوظ کر دیا۔اپنی ذاتی اپج سے ان افسانوں میں جان ڈال دی۔ان کے افسانے قدیم دکنی تہذیب و معاشرت کی بازیافت کرتے ہیں۔ان کے تاریخی افسانوں کی تہذیبی افادیت کے پیش نظر وہ اردو کے ایک کامیاب افسانہ نگار قرار پاتے ہیں۔اور ان کے افسانوں سے ہمیں حیدرآباد کی حقیقی عظمت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

حواشی

۱ ڈاکٹر زور بہ حوالہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ حیات شخصیت اور کارنامے ۔از۔ مغنی تبسم ۔ص ۔۴۲۸

۲ ڈاکٹر زور بہ حوالہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ حیات شخصیت اور کارنامے ۔از۔ مغنی تبسم ۔ص ۔۴۲۸

۳ ڈاکٹر زور۔ دیباچہ۔ گولکنڈے کے ہیرے۔

۴ گیان چند جین ۔ بہ حوالہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ حیات شخصیت اور کارنامے ۔از۔ مغنی تبسم ۔ص ۴۳۰,۴۲۹

۵ خلیق انجم، ۔ڈاکٹر زور ص ۲۰۴

۶ اکبر حیدری، ڈاکٹر زور ص ۱۴۵

۷ ڈاکٹر زور۔ سیر گولکنڈہ ۔۔ص ۵۱

۸ ڈاکٹر زور۔ سیر گولکنڈہ ۔ص ۸۳

۹ ڈاکٹر زور۔ سیر گولکنڈہ ۔ص ۱۱۳

۱۰ سیدہ جعفر۔ ڈاکٹر زور۔ ص ۱۴۶

۱۱ ڈاکٹر زور۔ گولکنڈے کے ہیرے ۔ دیباچہ

۱۲ ڈاکٹر زور۔ گولکنڈے کے ہیرے ۔ افسانہ۔ بالا۔ گولکنڈے کی آخری رقاصہ۔

۱۳ ڈاکٹر زور۔ گولکنڈے کے ہیرے ۔ افسانہ۔ پانچ اشرفیاں ۔۴۲۔۴۱

۱۴ ڈاکٹر زور۔ گولکنڈے کے ہیرے ۔ افسانہ۔ سر دصحرا۔ ص ۴۸۔۴۷

۱۵ ڈاکٹر زور۔ گولکنڈے کے ہیرے ۔ افسانہ۔ دفینہ۔ ص ۶۲۔۶۱

۱۶ گیان چند جین۔ بحوالہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ حیات شخصیت اور کارنامے ۔از ۔مغنی تبسم ۔ص۔۴۳۷

۱۷ سیدہ جعفر۔ ڈاکٹر زور، ص ۱۵۰

۱۸ مولوی عبدالحق ۔ گولکنڈے کے ہیرے ۔ دیباچہ ۔ص ۔۴

۱۹ ڈاکٹر زور۔ شہزادی کا عقد۔ ص ۲۹

۲۰ پروفیسر سیدہ جعفر۔ڈاکٹر زور۔ص۱۴۶

۲۱ ڈاکٹر زور افسانہ مکہ مسجد۔ص۔۱۷

۲۲ ڈاکٹر اسلم پرویز۔مضمون ۔ڈاکٹر زور ادب کی ایک ماڈل شخصیت۔مشمولہ۔محی الدین قادری زور مرتبہ خلیق انجم۔ص۸۳

۲۳ یوسف سرمست پروفیسر۔ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری۔مشمولہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور خصوصی مطالعہ۔ایم اے اردو عثمانیہ یونیورسٹی۔مرتبہ محمد علی اثر ڈاکٹر۔ص۔۷۵

☆ نواں باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

ڈاکٹر زور کے مکاتیب کا جائزہ

ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک علمی و ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ بحیثیت ادیب، محقق اور ماہر لسانیات وہ سارے ہندوستان میں معروف تھے اور وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اپنے دوست احباب سے ان کی خط و کتابت جاری رہتی تھی۔ جس میں ذاتی امور کے علاوہ اردو زبان و ادب کی ترقی کے ضمن میں گفتگو بھی شامل رہتی تھی۔ ان کے مکاتیب بھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے علمبردار ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور کی مکتوب نگاری کے جائزے سے قبل آیئے دیکھیں کہ خط کسے کہتے ہیں اور اردو میں مکتوب نگاری کی روایت کیا ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت

مکتوب نگاری باہمی ترسیل کا ایک قدیم اور مقبول ذریعہ رہا ہے۔ جب ہم کسی سے کوئی بات کہنا چاہیں اور وہ ہمارے سامنے موجود نہ ہو تو اپنی بات اور گفتگو اُسے لکھ بھیجنا مکتوب نگاری کہلائے گا۔ مولوی عبدالحق کے بموجب ''خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔'' مکتوب نگاری ادب کی قدیم صنف ہے۔ خطوط نگاری خود ادب نہیں مگر اردو کے بعض انشا پردازوں کی مکتوب نگاری سے اس میں ادبی شان آ گئی ہے۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ تو اس میں بھی خطوط نویسی کا دامن بہت وسیع ہے۔ اور خطوط نویسی کی روایت اتنی توانا ہے کہ بذات خود ایک صنف ادب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال غالب کے خطوط ہیں۔ خطوط غالب کے بارے میں یہ بات مشہور ہوئی کہ غالب نے ''مراسلہ کو مکالمہ'' بنا دیا تھا۔ ابوالکلام آزاد بھی مکتوب نگاری میں ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ مولانا کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں غبار خاطر'' مکاتیب ابوالکلام آزاد''، ''نقش آزاد''، ''تبرکات آزاد'' اور ''کاروانِ خیال'' قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت ''غبار خاطر'' کے حصے میں آئی۔ ابوالکلام آزاد کے اسلوب کے بارے میں کہا گیا کہ ''اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو ابوالکلام کی نثر میں نازل ہوتا''۔

اردو زبان میں مکتوب نگاری کو بہ طور صنف ادب متعارف کرانے میں اولیت کا اعزاز مرزا رجب علی بیگ سرور کو ملتا ہے۔ تاریخ ادب اردو میں اگرچہ یہ خطوط اپنی قدامت اور اولیت کی بدولت قابل ذکر ہیں لیکن تخلیقی اعتبار سے یہ خطوط اسلوب کی چاشنی اور موضوعاتی تنوع کا کوئی قابل قدر پہلو سامنے نہ لا سکے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے

والے قارئین ادب اس حقیقت سے بہ خوبی آ گاہ ہیں کہ اردو زبان میں مکتوب نگاری کو بہ حیثیت ایک ہر دل عزیز صنف ادب متعارف کرانے کا سہرا مرزا اسداللہ خان غالب (1797-1869) کے سر ہے۔ مرزا اسداللہ خان غالب کے مکاتیب گلشن اردو میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئے ان خطوط کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ غالب نے اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز 1846 یا 1848 کے دوران کیا۔۔غالب کی مکتوب نگاری اردو نثر کے فروغ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مشاہیر کے مکاتیب تاریخ، تہذیب، ثقافت اور درخشاں اقدار و روایات کے امین ہوتے ہیں۔ غالب نے اپنے مکاتیب میں اپنی دلی کیفیات، سچے جذبات اور حقیقی احساسات کے اظہار کے لیے جس طرز خاص کا انتخاب کیا وہ بعد میں آنے والوں کے لائق تقلید بن گئی۔ مرزا اسداللہ خان غالب کے بعد جن مشاہیر ادب نے مکتوب نگاری پر توجہ دی ان میں سر سید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی محسن الملک، وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی،، داغ دہلوی، امیر مینائی، ریاض خیر آبادی اور سید علی ناصر کے نا قابل ذکر ہیں۔ اردو میں مکتوب نگاری کو ایک مضبوط، مستحکم اور درخشاں روایت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس کے ابتدائی نقوش تو غالب کے ہاں ملتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتے ساتھ اس میں متعدد نئے لکھنے والے شامل ہوتے چلے گئے۔ اردو مکتوب نگاری کی روایت کو استحکام دینے اور مکاتیب کے ذریعے اردو زبان و ادب کی ثروت میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں بعد میں جن نامور ادیبوں نے حصہ لیا ان میں ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال، مہدی افادی، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، نیاز فتح پوری، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی اور محمد علی ردولوی کی خدمات تاریخ ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں ان تمام مشاہیر ادب نے خون بن کر رگ سنگ میں اترنے کی جو سعی کی وہ تاریخ ادب میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

ڈاکٹر زور کے مکاتیب

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں ڈاکٹر زور کے مکاتیب بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے تعلقات کا حلقہ بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ ان کے خطوط زیادہ تر ادبی شخصیتوں کے نام ہیں جن میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے کس حد تک مستعد رہتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے اردو کی خدمت کی اور اپنے خطوط کے ذریعہ دوسروں کو بھی اردو کی خدمت کے لیے تیار کیا۔ ڈاکٹر زور خود خطوط کے مرتب ہیں۔ اقبال اور شاؔد کے درمیان تقریباً تیس سال سے زیادہ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی

رہی۔ڈاکٹر زور نے ان خطوط کو مرتب کر کے شایع کیا۔ڈاکٹر زور کے نزدیک ان خطوط کی بے حد اہمیت تھی کیوں کہ ان خطوط کے مطالعے سے دو بڑے انسانوں کے قلبی و ذہنی رجحانات بے نقاب ہوتے ہیں۔ان خطوط میں اخلاقی اور روحانی قوتیں صاف آئینہ کی طرح نظر آتی ہیں۔ڈاکٹر زور کے خطوط بھی ایسے ہی ہیں،ان خطوط میں بے تکلف باتیں، سادگی، بے باکی اور دلآویزی، عام زندگی کی جھلکیاں اور سفر و حضر کے واقعات قلم بند کیے گیے ہیں۔

ڈاکٹر زور ہمہ وقت اردو کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ایک خط میں کام کے تعلق سے عارف الدین حسن کو لکھتے ہیں:

''ایسے موسم اور ایسی سردی میں کیا کام ہوگا۔اور میں کام کا بندہ ہوں اور خدا نے مزدور پیدا کیا ہے اور قسمت میں کام لکھا ہے''۔[۱]

ایک اور خط میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام اسی جذبے کا اظہار کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''انسان بڑا سخت اور بے غیرت واقع ہوا ہے۔اس لیے ہر حالت میں کام کیے جاتا ہے اور میں تو اپنے آپ کو مزدور سمجھتا ہوں، بہر حال کیے جانا ہے اور کرتا رہتا ہوں''۔[۲]

ممتاز حسن صاحب احسن کے نام اردو کی خدمت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''میں مئی میں یہاں (سری نگر) آ گیا اور اردو کی خدمت میں منہمک ہوں۔ایک کشمیر اردو اکیڈیمی بھی بنا رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ اردو ادب اور زبان کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو سکے''۔[۳]

ڈاکٹر زور نہ صرف اردو کی خدمت میں مصروف رہتے بلکہ اپنے احباب کو بھی معروف رہنے اور مضامین لکھنے کی ترغیب دیتے رہتے۔خواجہ حمید الدین شاہد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی علمی و ادبی مصروفیتوں کا بھی علم نہیں ہوا..... وہاں سے جو رسائل و جرائد آتے ہیں ان میں آپ کا نام ڈھونڈتا ہوں کہیں نظر نہیں آتا، بڑی مایوسی ہوتی ہے.....جلد جلد لکھا کیجیے۔[۴]

پروفیسر مبازالدین رفعت کو انکی اردو خدمات پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کی علمی اور تحقیقاتی کاوش سے بڑی خوشی ہوئی اور باوجود ناسازی

مزاج کے آپ جو کام کرتے رہتے ہیں اس کا دلی قدر دان ہوں''۔۵؎

ڈاکٹر زور کے خطوط میں کئی مضامین کے حوالے ملتے ہیں جو انھوں نے مختلف شخصیتوں کے نام لکھے ہیں۔مولوی عبدالحق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> زبان اردو جدید اصول لسانیات کے انطباق کے ساتھ اپنا ایک مضمون لکھ رہا ہوں مکمل ہونے کے بعد انشاء اور رسالہ اردو کے لیے روانہ کروں گا۔اگر آپ مناسب تصور فرمائیں تو اردو کے لیے یہاں کے مخطوطوں میں سے کسی پر مضمون لکھ سکتا ہوں''۔۶؎

ڈاکٹر زور کے خطوط میں خالص علمی مضامین،مخطوطات کے تعلق سے جستجو،طلب دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر عبدالحق کے نام خط میں خالص علمی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔

> ''میں نے ''گلزار ابراہیم'' اور ''گلشنِ ہند'' پر جو مضمون لکھا وہ تیار ہے۔ اول الذکر کا خلاصہ بھی۔میں نے شعراء کے حالات میں کم فرصتی کی وجہ سے ان کے اشعار نہیں نقل کیے کیا ان کی ضرورت ہوگی؟ آپ گلشن ہند کے دوسرے اڈیشن کو کب تک شائع کرنا چاہتے ہیں۔گلزار ابراہیم کے خلاصے کو اس میں کس طرح شامل کرنا ہوگا۔آیا گلشن ہند کے اختتام پر بہ طور ضمیمہ کے خلاصہ گلزار ابراہیم میں شامل رہے گا۔یا گلشنِ ہند کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر کے گلزار ابراہیم کا خاکہ قائم کیا جائے۔اس میں لطف نے جن جن شعراء کا ترجمہ کیا ہے انھیں لطف کے الفاظ میں مختصر سا نوٹ کیا تھا کہ اس ترجمہ میں لطفؔ نے اس میں اضافہ کیا یا نہیں اور اگر کیا تو وہ کون سا ہے نقل کیا جائے؟ یہ امر غالباً غور طلب ہے۔
>
> ''گلشن ہند'' کے بھی یہاں جو مخطوطے ہیں اور ''گلزارِ ابراہیم کے بھی ایک سے زیادہ معلوم ہوا کہ انجمن کی جانب سے کلیات حسنؔ شائع ہونے والا ہے۔یہاں کلیات حسنؔ کا ایک نفیس مخطوطہ ہے۔میں نے اس بارے میں شروانی صاحب سے بھی خط و کتابت کی تھی معلوم ہوا کہ یہاں ان کے مخطوطہ سے زیادہ کلام موجود ہے۔نہ معلوم انجمن کا مخطوطہ کس حد تک مکمل ہے''۔۷؎

ڈاکٹر زور ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک لندن میں قیام پذیر تھے۔ اس دوران انھوں نے اپنے نہایت عزیز دوست نواب عبدالرحمٰن شریف صاحب کے نام چند خطوط لکھے جن کی تعداد ۴۶ ہے۔ عبدالرحمٰن شریف نہایت شریف منکسر المزاج طبیعت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر زور ان کے تعلق سے کہتے ہیں آپ میرے اکیلے بے غرض اور پرخلوص دوست ہیں اور یہ کہ میں ہمیشہ آپ کے مشوروں کو وقعت کی نظر سے دیکھتا ہوں''۔ ان خطوط میں ڈاکٹر زور نے جو بھی لکھا وہ نہایت بے تکلف اور قلم برداشتہ لکھا۔ ان خطوط کی خاصیت یہ ہے کہ ان میں بلا سادگی، بے باکی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔ یہ خطوط ایک ادیب کی نجی اور علمی زندگی کی مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زور اپنے دوست عبدالرحمٰن شریف سے علمی اور ادبی استفسارات کے بارے میں خطوط میں دریافت کرتے ہی رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان سے معاونت کی خواہش بھی کرتے ہیں۔ ایک خط میں کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''میں نے ایک کتاب تذکرۂ مصحفی کو برٹش میوزیم سے نقل کرلیا ہے اور اس پر حاشئے چڑھائے ہیں۔ اس کے علاوہ مصحفی پر ایک خاص کتاب لکھ رہا ہوں جو اُردو میں نہایت کام کی چیز ہوگی، تین حصوں میں اس کو شائع کرانے کا ارادہ ہے۔ (۱) سوانح مصحفی (۲) تذکرۂ مصحفی (۳) کلام مصحفی۔ اس کے متعلق میں نے مکتبہ والوں کو لکھا ہے انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے اس کو اپنے خرچے سے شائع کروں۔ جن کی لکھائی، چھپائی کا انتظام مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ خود بلدہ آنے تک ٹھہروں، لیکن جلد اشاعت کی اس لیے خواہش ہے کہ ایک نسخہ ہندوستان میں صرف ایک جگہ ''دارالمصنفین اعظم گڑھ'' میں موجود ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لوگ اس کو چھپوا نہ دیں اور میری محنت بیکار نہ جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستان آنے کے بعد تو بہت سی چیزیں چھپانے کی اپنے ساتھ لاؤں گا۔ آخر اس سال بھی تو کوئی چیز چھپے''۔ ۸

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور سفر میں ہوں یا حضر میں ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ذاتی مصارف برداشت کرکے کتابوں کی اشاعت کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ ڈاکٹر زور کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خود لکھتے اور دوسروں کو بھی دعوت عمل دیتے۔ اپنے ایک دوست کو عمل دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ گھر کے کاموں سے باہر نکلیے اور دنیا کے کام کاج میں عملی حصہ
لینا شروع کر دیجئے میرے واپس ہونے تک آپ کو پورا عملی آدمی اور مکتبہ میں
خاصا دخیل ہو جانا چاہیے کیوں کہ ہمیں عملی کام شروع کرنا ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے جن جن مقامات کا سفر کیا ان میں سب سے زیادہ مقام انھیں پسند آیا وہ پیرس ہے اس کی تعریف ۲۶/ڈسمبر ۱۹۲۹ء کے خط میں یوں کرتے ہیں:

''یہاں طرح طرح کے انسانوں سے ملاقات ہوتی ہے، لندن میں یہ
موقع نصیب نہیں جو کوئی یورپ آتا ہے، پیرس ضرور آتا ہے اور اسی طرح یہ شہر
ہر وقت نئے نئے لوگوں کا مرکز بنا رہتا ہے جہاں کی دل چسپیاں شاید ہی دنیا
میں کہیں اور نصیب ہوں۔ کاش آپ بھی ساتھ ہوتے، نواب صاحب! میں ان
لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اکیلے ہی مزے لیتے ہیں''۔

ممبئی سے جہاز ''کرکویا'' سے روانہ ہونے کا منظر اس طرح لکھا ہے:

''جہاز میں سوار ہونے اور احباب سے الوداعی ملاقات کرنے کا منظر
اس قدر تکلیف دہ تو نہیں تھا جیسا حیدرآباد کے اسٹیشن پر تھا، تاہم اگر میں ضبط
سے کام نہ لیتا تو غالباً اپنے وطن کو چھوڑتے وقت میری آنکھوں سے ضرور آنسو
نکل پڑتے''۔

ایک خط میں لندن کی آب وہوا، موسم سرما کی برفباری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''لندن کی آب و ہوا بڑی خراب ہے، میں اس سے بیزار آ گیا ہوں،
گزشتہ دو ہفتوں میں خاصی برف گری۔ یہ چیز میرے لیے بالکل نئی اور ساتھ
ہی پر لطف بھی۔ خصوصاً علی الصباح مطلع ابر آلود ہو تو برف سے ڈھکے مکان،
درخت اور سڑکیں بقعۂ نور نظر آتے ہیں''۔

اسی طرح پیرس شہر کے تعلق سے بھی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

۱۶/اکتوبر ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں نواب عبدالرحمٰن شریف کو لکھتے ہیں:

''پیرس کی دل چسپیاں اور لطف بیان نہیں کی جاسکتیں، اس شہر سے مجھے

اتنی محبت ہوگئی ہے کہ حیدرآباد کے بعد میں اسی کو اپنا وطن بنانے تیار ہوں، دنیا میں یہ ایک شہر ہے جہاں آدمی خود کو At home محسوس کرتا ہے۔غریب سے غریب اور امیر سے امیر دونوں یہاں آرام سے رہ سکتے ہیں۔اس کی گلی گلی رومانی فضا سے معمور ہے اور اس کا ذرّہ ذرّہ محبت اور لطافت سے خالی نہیں''۔

۱۵/اگست ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں سوئٹزرلینڈ کی تعریف کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''سوئزرلینڈ واقعی بہشت ہے میری صحت اچھی ہورہی ہے اور زندگی کا بہترین زمانہ گزر رہا ہے۔ بلند برف سے بھرے پہاڑ میلوں تک نظر آتے ہیں۔ سرسبز وادیاں اور پانی کے آبشار، واقعی خدا کی قدرت نظر آتی ہے ایسے مناظر سے انسان اُسی وقت لطف اُٹھا سکتا ہے جب کہ اس کے ساتھ اچھے دوست موجود ہوں نہ تنہائی کا غم اچھا نہ تنہائی کی خوشی اچھی''۔[۹]

قیام لندن کے دوران ان کے افکار وخیالات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ڈاکٹر زور کا ماننا ہے کہ یورپ انسان کو زیادہ عقلی بنا دیتا ہے اور علمی زندگی کے مناسب اور موزوں ہے ان خیالات کا اظہار وہ ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

''میں یہاں وہ آدمی نہیں رہا ہوں جو کبھی تھا۔ میرا لباس بدل گیا، میری صورت بدل گئی، میرا کھانا بدل گیا، میرا طریقۂ بود و باش بدل گیا۔ جہاں تک میری علمی زندگی کا تعلق ہے میرا قیام یورپ زیادہ بہتر ہے یورپ انسان کو زیادہ عقلی بنا دیتا ہے۔اس کی ہر چیز کاروباری نقطۂ نظر سے سرزد ہوجاتی ہے۔خصوصاً پیرس کے دو مہینے کے قیام نے میرے خیالات کی رو کو ایک ایسی طرف پلٹا دیا جس کا رُخ شاید ہی تبدیل ہوسکے۔ کاش میرے سارے دن وہیں بسر ہوتے''۔

ڈاکٹر زور وطن سے دور رہتے ہوئے اپنے وطن عزیز کی علمی سرگرمیوں سے کسی نہ کسی طرح آگاہ رہنے کی کوشش کرتے۔ ڈاکٹر زور اپنے خطوط میں کبھی کبھی ایام گزشتہ کی پر لطف باتیں بھی یاد کرتے ہیں۔یادوں کے خوابوں میں کبھی کبھی وہ کسی محبوب شاعر کے اشعار گنگنانے لگتے ہیں۔ایک خط میں وہ ماضی کی یادوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں۔اسلوب بیان کی چاشنی ملاحظہ ہو:

مخاطب عبدالرحمٰن شریف ہیں۔

''جب مجھے آپ کے ساتھ ہائی کورٹ کے سامنے یا موسیٰ ندی کے کنارے گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں اُس کا لطف عمر بھر یاد رہے گا اور اُمید نہیں کہ ایسے دن پھر آسکیں وہ دن نہیں رہے۔ وہ طبیعت نہیں رہی، میرے واپس آنے کے بعد فضا ہی دوسری ہوگی۔ ایک ذمہ داری کی زندگی رہے گی۔ مقابل کی چوٹیں ہوں گی اور اس کے لیے سخت سے سخت محنتیں کرنی پڑیں گی .....وہ چاندنی راتیں یاد آتی ہیں جب موسیٰ ندی کے کنارے تصنیف وتالیف کی نسبت بحث ہوتی تھی۔ وہ باتیں یاد آتی ہیں جب حسین ساگر کے کٹے پر مٹھائی کھاتے بیٹھتے تھے تو میں نہیں کہہ سکتا اے میرے عزیز کرم فرما میں کیا محسوس کرنے لگتا ہوں، ہائے اس وقت غالب یاد آرہا ہے۔ [۱۰]

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

ڈاکٹر زور کے ان تمام خطوط کو اگر ادبی خطوط کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ ان خطوط میں اردو زبان وادب کے حوالے باتیں کی گئی ہیں کہیں کہیں اپنے ذاتی تجربات اور واقعات بھی آنے والی نسل کے لیے مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے خطوط سیاسی نوعیت کے بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوسکتی ہے اور راقمۃ الحروف کو دستیاب بھی نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس ادبی نوعیت کے خطوط جن میں اردو زبان وادب اور کتابوں کی اشاعت اور مضامین کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں زیادہ ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور بالکل صاف گو تھے۔ ان کے خطوط میں بھی صاف گوئی کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ تصنع وتکلف سے وہ کوسوں دور دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو لکھے گیے خطوط میں تصنیف وتالیف، مضامین کی اشاعت اور رسالہ سب رس کے تعلق سے وافر معلومات ہیں۔ ساتھ ساتھ اسلوب بیان بھی صاف اور واضح ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''چند ماہ ہوئے محکمۂ زبان پٹیالہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اردو، ہندی اور پنجابی پر ایک مقالہ لکھوں۔ چنانچہ اسی مضمون کو مناسب اضافے کے بعد ان کے یہاں بھیج دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی نقل بھیج دوں۔ ریڈیو کشمیر سے میری ایک تقریر ''اردو شاعری میں انسان دوستی'' اور ریڈیو حیدرآباد سے ''ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں'' نشر ہو رہی ہیں۔ آپ فرمائیں تو یہ دونوں بھیج دوں۔ اسی دوران میں کئی اور مضمون لکھے یعنی ''چند یادیں''۔ ''بحرالعلوم عبدالقدیر صدیقی''، ''عبدالرحمٰن خان'' کیا ان کی نقلیں آپ کو ملیں؟ کون کون سے مضمون آپ کے یہاں ہیں۔ اگر زحمت کر کے فہرست بھیج دیں تو عنایت ہوگی اور مذکورہ مضمونوں میں سے جس کی نقل کی ضرورت ہو یا جس کو آپ شامل کرنا چاہیں اس کا نام لکھ بھیجیں۔ وہ بھی بھیج دوں گا۔ آپ کے دوست غلط کہتے ہیں۔ میں نے ۱۹۳۰ء میں ''ہندوستانی لسانیات'' لکھی تھی اور اس میں پہلی بار اکثر و بیشتر لسانیاتی اصطلاحوں کے ترجمے کیے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں ''اردو انسائیکلو پیڈیا'' کی ترتیب کے سلسلے میں لسانیاتی اصطلاحیں ترتیب کر کے ماہرین کو بھجوائی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر سدھیشور ورما نے ان کی توثیق کی تھی اور مشورے دیے تھے۔ آپ کے مقدمہ کا انتظار ہے۔ محمد بن عمر کی کتاب آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ اُردوئے معلیٰ کے دو آف پرنٹ مل چکے ہیں۔ اگر کچھ اور ہوں تو بھجوائیے۔ اور کیا لکھوں آپ تو بہت مصروف رہتے ہیں؟ اور میں جب سنتا ہوں، دعا کرتا ہوں''۔ [۱۱] مخلص: سید محی الدین قادری زورؔ

اس خط میں ڈاکٹر زور کی بے پناہ مصروفیتوں کا حال بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے اور ڈاکٹر زور اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھاتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ایک خط میں اپنے بھائی جلال الدین حسینی (عرف قادر پاشاہ) کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں:

''قادر پاشاہ کو سٹی کالج کی بورڈنگ میں شریک کرائیے اور اخلاق و عادات پر خفیہ طور پر نگرانی رکھیے۔ میں بے حد ممنون ہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ

آپ ہفتہ میں دو تین دن ضرور اس لڑکے کو اپنے پاس بلا کر ساتھ چائے وغیرہ
پلائیے اور مختلف اُمور پر گفتگو کیجئے تا کہ لڑکے میں سمجھ پیدا ہو کلچر کی سخت ضرورت
ہے اور یہ اچھے لوگوں کی صحبت میں پیدا ہوتی ہے''۔۱۲؎

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بھائی کی ذمہ داریاں بھی بخوبی نبھا رہے ہیں اور چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور کے مکاتیب میں نجی خطوط کی خاصی تعداد میں ملتی ہے۔ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں وہ ایک مشفق باپ، رحم دل بھائی، محبت کرنے والا شوہر، ہمدرد استاد اور مخلص دوست کے روپ میں نظر آتے ہیں۔

اپنی شریک حیات تہنیت صاحبہ سے وہ بے حد محبت کرتے تھے۔جب کبھی وہ بیمار ہوتیں تو ڈاکٹر صاحب ان کے علاج و معالجہ میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے۔۴؍نومبر ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں اپنی اہلیہ کی علالت کا ذکر کیا ہے:

''بیگم صاحبہ کی صحت کی وجہ سے پریشان ہوں۔بیگم صاحبہ کو فمِ معدہ میں
درد ہوتا تھا اور سینے میں بھی۔کارڈیوگرام کیا گیا تو قلب کے عارضے کا بھی شبہ
ہے۔اس لیے کئی روز سے لٹا دیا گیا ہے۔پستی بھی محسوس کرتی ہیں۔مجھے ہر
وقت ان کے قریب نہ ہونے سے بے چینی رہتی ہے..... جب تک حسب
معمول چلنے پھرنے نہ لگیں پریشان رہوں گا''۔ ۱۳؎

ڈاکٹر زور ایک مشفق، رحم دل اور ذمہ دار باپ بھی تھے۔اولاد کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے ہی مشفقانہ انداز سے پیش آتے تھے۔شاہد صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تسنیم آرکٹیکچر اور توفیق بی۔اے میں شریک ہو رہی ہیں .....
تہذیب کا ابھی کچھ نہیں ہوا۔بڑی ہے۔خدا کرے کہ جلد کسی اچھے گھر میں طے
پا جائے۔لکچراری کا ابھی کچھ نہ ہوا''۔۱۴؎

ڈاکٹر زور ان افراد سے بھی خوش دلی سے پیش آتے جن سے وہ اختلاف رکھتے تھے۔پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے بھاگ متی کے تعلق شدید اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود خطوط میں نہایت اخلاص اور محبت کا اظہار ملتا ہے۔ایک خط میں کشمیر آنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ تشریف لائیں تو تمام تاریخی مقامات میرے ساتھ ملاحظہ

فرما سکتے ہیں۔ مجھے بھی ان کا شوق ہے اور جاتا رہتا ہوں ..... کسی مناسب
جگہ قیام کا انتظام رہے گا مطمئن رہیئے ..... آنے کی تاریخ اور وقت سے
مطلع فرمائیں تو میں خود حاضر ہو کر استقبال کروں گا''۔۱۵

ڈاکٹر زور کے خطوط میں طنز وظرافت کی عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ وہ نہایت خوش مزاج اور ظریف الطبع انسان تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''راستے میں ایک ایک فٹ برف ہے۔ گاڑیاں پھسل رہی ہیں۔ ڈسمبر
کے پہلے ہفتے میں نکلنے کا ارادہ ہے دعا فرمایئے کہ خیریت کے ساتھ یہ پل صراط
پار کرسکوں''۔ (بہ نام نارنگ ۶۱۔۱۱۔۱۸) ''پل صراط'' توجہ کا طالب ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''حکومت کی جانب سے ادارے کو حسب دل خواہ امداد نہ ملی تو لکھتے ہیں
(طنز کا انداز دیکھا چاہیے) ''آج آزاد صاحب کا خط بھی آیا ہے اور خوش خبری
بھی ملی ہے مگر سمندر سے شبنم والی بات ہے''۔ (بہ نام نارنگ ۵۷۔۷۔۲۶)

ڈاکٹر زور کے خطوط میں عربی وفارسی کے بے شمار ضرب الامثال بھی ملتے ہیں۔ جو جملے میں معنوی حسن کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ''آپ جیسے اصحاب وہاں اُردو کے لیے جو کچھ توجہ فرما رہے ہیں
غنیمت ہے مگر ضرورت ہے کہ مزید توجہ منعطف ہو۔ حدی را تیز تر می خواں چو
محمل را گراں بینی''۔ (بہ نام ممتاز حسن ۵۷۔۶۔۵)

۲۔ ''اگر آپ ان پر لکھیں تو بجائے خود دکن کے چند برے عوامی خدمت
گزاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ تازہ خواہی داشتن ایں داغ ہائے سینہ را''۔
(بہ نام مبارز الدین رفعت ۵۶۔۸۔۱۲)

۳۔ ''میری قسمت بھی عجیب ہے۔ اس اہتمام سے درگاہ کی عمارتیں
بنوائیں اور کچھ عرصے کے بعد اس سے بے تعلق ہو گیا۔ ایوان اردو بنا۔ اپنی
زندگی ہی میں چھوڑ آیا اب یہاں کشمیر اُردو اکیڈیمی کی بنیاد ڈال رہا ہوں۔ شاید

یہ عمارت بن جانے کے بعد اس کو بھی چھوڑ دوں۔ موتو قبل ان تموتو کی مثل صادق آ رہی ہے''۔ (بہ نام شاہد ۶۱۔۷۔۴)

۴۔''تہذیب کے لیے پاکستان کا پیام ہے۔ اپنے ارادے کے خلاف وہاں دینا پڑے تو وہ مقولہ صادق آئے گا۔ عرفت ربی بفسخ العزایم''۔ (بہ نام شاہد ۶۰۔۳۔۲۸)

ڈاکٹر زور کے خطوط میں انشا پردازی اور ادبی حسن نکھر کر سامنے آتا ہے اور ان کے جملوں میں بے ساختگی ہے۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

ا۔''یہاں بارش شروع ہوگئی ہے۔ مطلع ابر آلود ہے۔ پھوار جاری ہے۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی ہر طرف سبزہ اور موسم خوش گوار ہے مگر اب دل میں اُمنگ اور طبیعت میں جوش کی کمی ہوتی جا رہی ہے''۔ (بہ نام شاہد ۵۹۔۷۔۱)

۲۔''خوش قسمت ہیں آپ کہ اس قدر جلد قدر دان بھی پیدا ہو گئے ورنہ کتنے ایسے پھول ہوں گے جن کی بہار بے کسی اور ناقدر دانی کی وجہ سے بہت جلد ختم ہوگئی اور آج دنیا انھیں جانتی بھی نہیں''۔ ۱۶

ڈاکٹر زور کے خطوط ادبی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ کی خاطر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ہمیشہ متحرک اور فعال رہے اور اپنے خطوط کے ذریعہ دوست و احباب کو عمل پر اُبھارا۔ ادبی معلومات کے علاوہ وہ اپنے خطوط میں ایک مشفق باپ، رحم دل بھائی اور محبت کرنے والا شوہر کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر زور قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے لیکن اس کے باوجود ان کے خطوط میں زبان اور اسلوب کی چاشنی بھی موجود ہے جس کی وجہ سے جملوں میں ادبی حسن پیدا ہو گیا ہے۔ فارسی اور عربی زبان کے ضرب الامثال بھی پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کے مکاتیب میں ان کی نجی زندگی بھی صاف ستھری نظر آتی ہے اور ان کے مختلف افکار و خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سب رس اور اس کے ادارت کے مسائل کو ڈاکٹر زور نے کس خوش اسلوبی سے انجام دیا اس کا تفصیلی حال ان کے خطوط میں ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کی شخصیت کے مختلف گوشے کھل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے نہایت قریبی دوستوں کے حالات سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ غرض ڈاکٹر زور کے خطوط اپنے اندر ایک عہد کی تاریخ رکھتے ہیں۔

حواشی

۱ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔عارف الدین حسن۔سب رس ۱۹۶۳ء ص ۳۴۲

۲ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔گوپی چند نارنگ۔۳۳۴

۳ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔ممتاز حسن احسن۔۳۴۳

۴ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔خواجہ حمید الدین شاہد۔۔۳۴۹

۵ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔مبارز الدین رفعت۔سب رس ۹۷ ص ۲۳۲

۶ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔مولوی عبدالحق۔بہ حوالہ، ڈاکٹر زور حیات شخصیت اور کارنامے از مغنی تبسم ص ۴۲

۷ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔مولوی عبدالحق۔بہ حوالہ، ڈاکٹر زور حیات شخصیت اور کارنامے از مغنی تبسم ص۔۴۳

۸ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔عبدالرحمٰن شریف

۹ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔عبدالرحمٰن شریف

۱۰ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔عبدالرحمٰن شریف

۱۱ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔گوپی چند نارنگ

۱۲ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔قادر پاشاہ برادر۔بہ حوالہ، ڈاکٹر زور حیات شخصیت اور کارنامے از مغنی تبسم ص۔۴۶۰

۱۳ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام۔قادر پاشاہ برادر۔ماہ نامہ سب رس کراچی ستمبر ۸۰ء ص نمبر ۲۱

۱۴ مکتوبہ ۲۵/جون ۱۹۵۹ء بہ حوالہ ماہ نامہ سب رس کراچی ستمبر ۱۹۸۰ء ص نمبر ۱۸

۱۵ ڈاکٹر زور۔مکتوب بنام پروفیسر ہارون خان شیروانی۔مرقومہ ۲۲/ستمبر ۱۹۶۲ء ''سب رس'' زور نمبر

۱۶ ڈاکٹر زور۔مکتوب بہ نام صاحب زادہ میکش حیدرآبادی بحوالہ ''ڈاکٹر زور'' مرتبہ محمد بن عمر

☆ دسواں باب

ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

ڈاکٹر زور کی شاعری کا جائزہ

ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

ڈاکٹر زور کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلجھے ہوئے شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر زور کو شعر گوئی کا ملکہ ورثہ میں ملا تھا۔ خود ان کے والد ماجد حضرت زعمؔ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ اس طرح ڈاکٹر زور کو موروثی شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں حیدرآباد شعر و سخن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ نظم طباطبائی، جلیل مانک پوری، ماہر القادری، علی اختر، حضرت امجد، صفی اورنگ آبادی، نظام شاہ لبیب، صدق جائسی اور فانی بدایونی جیسے شعراء حیدرآباد کے آسمان شاعری پر جگمگا رہے تھے۔ اُس ماحول میں ڈاکٹر زور جیسا قابل انسان شعر گوئی کی طرف مائل ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے بچپن، شباب اور آخری عمری میں شاعری کی، ان کی شاعری کا اتنا وافر مقدار میں کلام تھا کہ وہ مجموعہ بن سکتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر زور کی کم توجہی کے سبب بہت سارا کلام ضائع ہو گیا لیکن جو بھی کلام ہے اس سے ڈاکٹر زور کو ایک کامیاب شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر شعر گوئی کے میدان میں ڈاکٹر زور مداومت اور مستقل مزاجی سے کام لیتے تو دکن کے معروف ترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔ ڈاکٹر زور نے شاعری ترک کی اور تحقیق و تنقید کے میدان میں کود پڑے۔ لیکن انھیں شاعری میں کافی تجربات تھے۔ قدیم شاعری اور ترقی پسند شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''اپنے خاندانی یا موروثی مزاج کے مطابق دونوں میں خوبیاں دیکھتا ہوں۔ رواداری اور مرنجاں مرنج طرز زندگی میرے حصے میں آئی ہے۔ غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پیرس میں دو سال بہت اعلیٰ پایے کے کمیونسٹ احباب کے ساتھ رہا ہوں اور اب بھی سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند ادیبوں کا شمار میرے مخصوص دوستوں میں ہے۔ میں کام کی قدر و قیمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ نہیں دیکھتا کہ کس گروہ یا کس مذہب اور مسلک کے ادیب و شاعر کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمر ہے''۔[1]

ڈاکٹر زور کا خیال تھا کہ اردو زبان و ادب کی خدمت کا ذریعہ صرف شاعری ہی نہیں ہے بلکہ اور طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نثر کا میدان چنا۔ اور اس میدان میں شاعر سے بڑھ کر نام کمایا۔

قاضی عیاذ انصاری کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اپنی ابتدائی شاعری، ماحول اور نثر کی طرف ملتفت ہونے کو

واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''عیاذ صاحب میں نے اسکول کے زمانے ہی سے شاعری شروع کردی تھی جو کالج کے زمانے میں بھی جاری رہی۔اس وقت حیدرآباد شعروسخن کا مرکز تھا اور پورے ہندوستان کے اچھے اچھے شاعر مثلاً نظم طباطبائی، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، صدق جائسی، ماہرالقادری، نظام شاہ لبیب، جلیل مانک پوری، کیفی، عزیز، صفی، امجد، علی اختر ..... کے والد باغ وغیرہ یہاں موجود تھے اور کثرت سے مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔حیدرآباد کے گلی کوچوں میں شعروسخن کا چرچا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص شاعر بن سکتا ہے۔لیکن ادیب، نقاد اور محقق بننا ہر کس و ناکس کی بات نہ تھی۔ ہمارے کالج کے استاد وحیدالدین سلیم ہمیشہ اردو کی جدید ضرورتوں کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے، اسی لیے میں نے بھی عام راستے سے ہٹ کر نئے نئے کام کرنے اور اپنی مادر جامعہ کا نام روشن کرنے کی خاطر شاعری کی جگہ نثر اور اس میں بھی تنقید وتحقیق کی طرف بطور خاص توجہ کی۔ یوں تو کہنے کو میں نے افسانے بھی لکھے ہیں جن کے دو مجموعے ''سیر گولکنڈہ'' اور ''گولکنڈے کے ہیرے'' چھپ چکے ہیں۔اسی طرح میرا کلام بھی اتنا موجود ہے کہ ایک اچھا خاصا دیوان چھپ سکتا ہے۔مگر دوسرے کاموں کے مقابلے میں اس کو میں اہم نہیں سمجھتا'' ۔[۲]

ڈاکٹر زور ایک فطری اور موروثی شاعر تھے انھیں بچپن ہی سے شعروسخن کا ماحول ملا۔ان کی یادداشت اور قوت حافظہ غضب کی تھی۔انھیں سینکڑوں دکنی اشعار ازبر تھے۔خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے صدہا اشعار انھیں ازبر تھے۔

تخلص

ڈاکٹر صاحب اپنا تخلص زورؔ استعمال کرتے تھے۔کم شعرگوئی کے باوجود وہ اپنے تخلص ہی سے مشہور ہوئے اور آج بھی اپنے نام کی بہ نسبت تخلص ہی سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

اساتذۂ سخن:

ڈاکٹر زور کے اساتذۂ سخن کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔ وہ اصلاح کس سے لیتے تھے اس کا بھی حال معلوم نہ ہوسکا۔

ڈاکٹر زور کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک دور جامعہ عثمانیہ کا ہے یعنی ڈاکٹر زور جامعہ میں زیر تعلیم تھے۔ یہ دور ان کی شاعری کا ابتدائی دور بھی ہے۔ دوسرا دور قیام کشمیر کا ہے جب وہ وہاں فارسی اور اردو کے معلم تھے۔

ابتدائی شاعری:

ڈاکٹر زور کی ابتدائی شاعری میں ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر داخلی ہے اور ذوق سخن روایتی اور عمومی تھا ان میں غالب اور مومن کا سا رنگ پوری طرح نہیں چڑھا تھا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں شب مہتاب، شب وصال، محبوب، نگہہ ناز، دیدۂ گریاں، انفاس مسیحا جیسی اصطلاحیں ہمیں ملتی ہیں:

کالج کے دور کی شاعری کے چند نمونے یہاں تحریر کیے جاتے ہیں:

لڑکن اور جوانی کا کلام یہ ہے:

مرے حق میں کچھ اور بھی سوجھتی ہے
جفا ہی جفا کیا یہی سوجھتی ہے؟
جفا ہے ، ستم ہے ، غضب ہر گھڑی ہے
تمہیں میرے حق میں یہی سوجھتی ہے؟
اے شافع محشر مجھے بلوائیے طیبہ
اپنوں کو کوئی دور بٹھایا نہیں کرتے
میرے سردارِ دو عالم کی بھی کیسی شان ہے
خود خدا بھی شیفتہ ہے روئے تاباں دیکھ کر

ان کی مشہور نظم نونہالان دکن کا آخری بند ملاحظہ ہو:

وہ بزم غیر وہ جھوٹے فسانے
انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا؟

گنا کرتے ہو راتوں کو جو تارے
یہ آخر زورؔ تم کو ہوگیا کیا؟

دل ہوس ہائے مجازی میں ہے چشم حساد
خوف ہے راز حقیقت کہیں افشا کردے
عاشقی میں ہے مواخات کا رشتہ قائم
شمع ہر روز نہ کیوں خون کا دعویٰ کردے

دل جب سے ہوا ہے خوگر غم آزار میں لذت پاتا ہوں
گلبانگ مسرت دور رہے میں اس سے بہت گھبراتا ہوں
ہر روز ہزاروں زخم نئے اس زخمۂ دل پر کھاتا ہوں
اُفتاد سے ہوں مجبور مگر ، کب چاہ سے میں باز آتا ہوں

اس کے ہر ذرہ کو رشک آفتاب اب دیکھئے
عظمت ملک دکن کو بے نقاب اب دیکھئے
ہوچکا منت کشی کا سدباب اب دیکھئے
دیکھئے ہاں دیکھئے ، یہ انقلاب اب دیکھئے
داغ ہائے منت اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ دکن شاداب ہوتے جائیں گے

ڈاکٹر زور کی ابتدائی نظمیں ہلکی پھلکی اور عشقیہ مزاج کی حامل ہیں۔عنفوان شباب کے لطیف اور معصوم جذبات سے معمور ہیں۔افسانہ محبت کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ہیں یاد ابھی وہ دن تھی تیری جبیں سادہ
عاری تھا جفا سے تو تھا جور سے بیگانہ

تھا دخلنہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی
انداز سے کچھ مطلب شوخی سے نہ یارانہ
وہ راحت جاں بننا وہ روٹھ کے من جانا
وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا
وہ نور کی کرنوں کا چہرے پہ چمک جانا
وہ وقتِ خرام ان کے اعضاء کا لچک جانا
مخمور سی آنکھیں وہ محجوب سی باتیں وہ
محبوب ادائیں وہ رفتار وہ مستانہ

''جامعہ عثمانیہ اور نونہالان دکن'' کے عنوان سے ڈاکٹر زور نے ایک نظم کہی جس میں دکن کی عظمت انقلاب اور شادابیٔ نونہالان چمن کے تعلق سے اُمیدیں وابستہ کی ہیں۔

اس کے ہر ذرے کو رشک آفتاب اب دیکھیے
عظمت ملک دکن کو بے نقاب اب دیکھیے
ہوچکا منت کشی کا سدباب اب دیکھیے
دیکھیے ہاں دیکھیے یہ انقلاب اب دیکھیے
داغ ہائے منت اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالان چمن شاداب ہوتے جائیں گے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور تغیر اور انقلاب کے حامی تھے اور دکن کی عظمت اور حب وطن کی اُمنگ ان کے دل میں سمائے ہوئے تھی۔ کالج کے دور کی شاعری میں ڈاکٹر زور ایک اُبھرتے ہوئے شاعر اور ہونہار طالب علم کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی ایک نظم ''چاندنی'' بھی ان کے ابتدائی مشق سخن کی یادگار ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

پھر ذکر رونقِ شب مہتاب آگیا
سامانِ وحشت دل بیتاب آگیا
موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی

اے کاش مل سکے نگہ یار بھی وہی
ہوگا یونہی فلک پہ صداماہ ضوفشاں
مل جائے میرا چاندہے وہ چاندنی کہاں

ڈاکٹر زورؔ کوسرسید کی طرح قوم وملت کی حددرجہ فکرتھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کوآگے بڑھانے کا گُرسکھائیں۔ اورخوداس قافلہ کے ''سالار'' بن جائیں۔اس بات کی وضاحت نظم ''آسمان کی زبان'' کے اس بند سے ہوتی ہے۔

قافلہ زیست کا کاروانِ سالار ہوں
مخزنِ اسرار ہوں
مطلع انوار ہوں
مرجع افکار ہوں
درپے رفتار ہوں
قافلہ زیست کا کاروانِ سالار ہوں

نظم ''ساتھیو'' میں اپنی قوم سے مخاطب ہیں۔ان کی موضوعاتی نظموں میں بھی غزلیات کا گہرا رنگ جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پونچھ بھی ڈالو اب چشم نمو ساتھیو
کیوں کریں آج کل کا غم ساتھیو
ہمدمو! جی نہ چھوڑو یہی وقت ہے
یوں ہ ی بڑھتا رہے ہر قدم ساتھیو
ہمتیں پست ہونے نہ پائیں گی اب
ختم ہوتا ہے دورِ ستم ساتھیو

ابتدائی دور کی شاعری میں خصوصاً نظموں میں تعلق خاطر کی غمازی بھی ہوتی ہے۔ڈاکٹر زور کواپنی مادرعلمی سے خصوصی لگاؤ تھا۔اس کا اظہار ''جامعہ عثمانیہ'' کی نظم میں ہوتا ہے۔ابتدائی دور میں ڈاکٹر زور نے غزلوں سے زیادہ نظمیں کہیں اوران کی طبیعت بھی زیادہ اسی کی طرف مائل تھی۔ بقول حکیم یوسف حسین خاں ڈاکٹر زور کے پہلے دور کی شاعری میں غم جان تھااور دوسرے دور کے کلام میں حتمی طور پرغم دوراں تھا۔(سب رس ۱۹۶۳ء ص ۲۳۰)

ڈاکٹر زور کی شاعری کا دوسرا دور قیام کشمیر سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر زور اپنی عمر کے آخری حصہ میں کشمیر پہنچ گئے۔ کشمیر کے دلفریب نظاروں، پُر فضا اور فرحت بخش ماحول اور جنت نشان کی دلکش رعنائیوں سے مسحور ہوکر انھوں نے ایک طویل عرصہ کے بعد پھر سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ کشمیر کی شاعری ماحول کی مناسبت سے زیادہ تر غزلوں پر محیط ہے۔ کشمیر میں ڈاکٹر زور نے جو شعر کہے وہ جذبات کی حرارت سے تابندہ اور شدت احساس سے منور ہیں۔ ڈاکٹر زور نے کشمیر کی فضا میں ۱۵ غزلیں اور ایک خیر مقدمی نظم جو فارسی میں ہے کہی ہیں۔ ان پندرہ غزلوں میں ۱۸۸ اشعار ہیں۔ بقول حکیم یوسف حسین یہ ۱۸۸ اشعار، اشعار نہیں ہیں دیوان ہیں اور ایسا کہنا غلط تو نہ ہوگا کہ ان ۱۸۸ شعروں میں سے بیشتر شعر ایسے ہیں جو فرداً فرداً اگر جانچے جائیں تو ان میں سے ہر ایک مطالب اور تاثر کے لحاظ سے اس قدر وزنی اور وقیع ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس قدر بیش بہا کیسے ہو گیے۔ (ایضاً ۲۳۰)

''چاندنی'' والی نظم ڈاکٹر زور کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

نشتر دل و جگر میں چبھوئے ہوئے سے ہیں
نغمے مرے رباب میں سوئے ہوئے سے ہیں
آتی ہیں یاد شوق کی سر مستیاں مجھے
تڑپاتی ہیں زمانے کی نیرنگیاں مجھے
اب دل میں خواہشِ شبِ مہتاب ہی نہیں
تفریح و انبساط کے اسباب ہی نہیں
ہاں عمر بھر کریں گے یاد چاندنی
اس قیدِ غم سے ہوں گے نہ آزاد چاندنی

''اہل دکن'' والی نظم میں ڈاکٹر زور نے تدبیر کرنے پر زور دیا ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں تدبیر سے ہی تقدیر بنتی ہے۔ اپنے اس خیال کو نظم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے
قدریں بدل گئی ہیں کہ معلوم ہی نہیں
منحصر ہے یہ دنیا جو اسباب پر
سیکھی ہے رہبروں نے امیروں سے رہزنی

ہمتیں پست ہونے نہ پائیں گی اب
کشمیر میں کوئی تو کراچی میں ہے کوئی

ان اشعار میں اہل سے ڈاکٹر زور مخاطب ہیں اور انھیں نئے منزلیں نئی راہیں طے کرنے کی ہمت دے رہے ہیں۔ڈاکٹر زور نے اپنی غزلوں میں مغربی تہذیب پر چوٹ بھی کی ہے۔ایک غزل میں کہتے ہیں:

یہ جو خوش پوش ہیں پروردۂ تہذیب جدید
ڈھونڈتا ہوں کوئی انسان ہے ان میں کہ نہیں

ڈاکٹر زور زندگی بھر اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ چاہتے تو سبکدوشی کے بعد راحت وسکون کے ساتھ رہ سکتے تھے لیکن ان ے پاس کام کی اہمیت تھی۔عہد پیری بھی ان کے پاؤں میں زنجیر لگا نہ سکی بلکہ ان کے شوق عمل میں مزید اضافہ ہوتا ہی گیا۔تبھی تو ان کی زبان سے یہ ضرب المثل شعر جاری ہوا:

زندگی زندہ دلی ، ذوق طلب ، شوق عمل
عہد پیری میں بھی اے زورؔ جواں ہیں کچھ لوگ

ڈاکٹر زور پہلے دور کے مقابلہ میں دوسری دور میں ایک مفکر و مدبر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ان کی غزل کا ایک ملاحظہ ہو جس میں شعری پختگی کا احساس ملتا ہے:

پینے والے مے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں
چشم ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں ہم لوگ

اس شعر میں شاعر چشم ساقی جیسی چھوٹی چیز سے بھی بے نیاز نظر آرہا ہے اور دوسروں کو بھی تلقین کر رہا ہے کہ اس کا بھروسہ نہ کریں۔

احساس کی شدت اور نظر کی گہرائی ان اشعار سے بھی واضح ہو رہی ہے۔

جو خار کبھی تھے ننگ چمن میں آج وہی نسرین و سمن
کہا جانئے کس جا لالہ و گل پابند نزاکت بیٹھے ہیں
میدان قیامت جیت لیا دیوانوں نے آگے بڑھ کر
ہاں سر بہ گریباں فرزانے با فہم و فراست بیٹھے ہیں

ایک غزل میں حیدرآباد کی یک جہتی اور وطنیت کا شیرازہ بکھر جانے پر اظہار افسوس کیا ہے۔کہتے ہیں:

حیرت سے دیکھتا ہوں کہ یہ گلبدن ہیں کون
کھلتا نہیں ہے ان میں سر انجمن ہیں کون
قدریں بدل چکی ہیں یہ معلوم ہی نہیں
شیریں سخن ہیں کون دریدہ دہن ہیں کون
سیکھی ہے رہبروں نے اسیروں سے رہ زنی
ارباب انبساط غریب الوطن ہیں کون

ڈاکٹر زور کی غزلوں میں ایک میٹھی کسک کا احساس بھی پایا جاتا ہے ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم اپنی گرمی سوز دروں سے چیخ اُٹھے
خوشا کہ مستی فیضِ جنوں سے چیخ اُٹھے
یہ ناز طبع بلند و بہ زعم خود نگہی
زمانہ سازی دنیاے دوں سے چیخ اُٹھے

ڈاکٹر زور نے اپنی غزلوں میں شخصی تجربات اور واردات بھی قلمبند کئے ہیں۔ کہتے ہیں:

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں
کبھی سحر کے کبھی شب کے انتظار میں ہیں
یہ راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں
وہ سوئے دار چلے ہیں جو کوے یار میں ہیں
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
فریب خوردہ خزاں میں نہ خوش بہار میں ہیں
بہ فیض سوزِ دروں اور بطرز اہل جنوں
وہی ہے منزل لیلیٰ کہ جس دیار میں ہیں

ڈاکٹر زور کے کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور اس میں ہمیں حکمت و موعظت کا درس بھی ملتا ہے۔

دل ہو بیدار تو انسان سمجھ سکتا ہے
قوتیں اور بھی ہیں دولت و ثروت کے سوا
ذوقِ پاکیزہ سے ہر چیز ہے پرلطف و حسیں
یہ نہ حاصل ہو تو بیکار ہے دنیا ہو کہ دیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آ نکلے
ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے جب دل کے قریب
اپنی کوتاہی دانش کا گلہ کیا کیجے
بارہا ہم بھی گئے تھے در زنداں کے قریب

ڈاکٹر زور کے کلام میں رجائیت کا احساس ملتا ہے۔ وہ زندہ دلی اور متحرک زندگی کے قائل ہیں۔قنوطیت اور ناامید سے وہ بیگانہ ہیں۔انسان کو دعوت عمل دیتے ہیں۔زندگی میں ایسا کچھ کر جانے کے قائل ہیں جو انھیں حیات جاویداں بنادے۔ان کی مشہور غزل کے اشعار ہمیں دعوت عمل دیتیہیں:

یوں تو کہنے کو یاں سے گزر جائیں گے
کیا بتائیں کہ آخر کدھر جائیں گے
میری آنکھیں ترستی رہیں گی ، مگر
وہ جو آئیں گے دِل میں اُتر جائیں گے
بوئے گُل ہو کہ سیلاب و برق تپاں
سعیِ انسان سلامت سنور جائیں گے
زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی
زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے
موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے [۳]

ڈاکٹر زور اگر اس میدان میں مشق سخن جاری رکھتے تو یقیناً اردو کے بلند پایہ شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔ قیام کشمیر کے دوران کہی گئی شاعری میں وہ صاحب فکر شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔موت نے اپنی مہلت نہ دی ورنہ وہ اس

میدان میں اپنے ہم عصروں سے کافی آگے نکل گیے ہوتے۔

ڈاکٹر زور نے جتنی بھی شاعری کی وہ انھیں اردو کے بلند پایہ شاعر باور کرانے کے لیے کافی ہے۔لیکن ان کی دوسری ادبی و تحقیقی کاوشوں کی بدولت شاعرانہ روپ مدھم نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر اہل قلم ادیب حضرات نے زیادہ توجہ نہیں کی۔لیکن پھر بھی ڈاکٹر زور اپنے قلیل سرمایہ کے باوجود شعراء کی صف میں مقام پانے کے ضرورت مستحق ہیں۔

زندگی ، زندہ دلی ، ذوقِ طلب ، شوقِ عمل
عہدِ پیری میں بھی اے زوؔر جواں ہیں کچھ لوگ

حواشی

۱۔ سیدہ جعفر ڈاکٹر زور حیات وخدمات ص۱۵۴
۲۔ ڈاکٹر زور۔انٹرویواز قاضی ایاز انصاری۔سب رس ۱۹۷۸ء ص۴۳
۳۔ مرسلہ: بیگم صاحبہ ڈاکٹر زوؔر۔شیرازہ،ڈاکٹر زور نمبر ص۱۵۲

اختتامیہ

اختتامیہ

تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے گزشتہ ابواب میں ڈاکٹر زور کے حالات زندگی، شخصیت، علمی وادبی کارنامے اور انفرادی طور پر بہ حیثیت ماہر لسانیات، محقق، مرتب، نقاد، سوانح نگار ومورخ، افسانہ نگار، مکتوب نگار اور شاعر کے ڈاکٹر زور کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور خاص طور سے موضوع سے متعلق ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی انداز میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت انسان ڈاکٹر زور ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ بلاشبہ دکنی تہذیب کے پرستار تھے اور دکن کی فضاؤں میں سانس لے کر انہوں نے اپنی خدمات کے ذریعے دکنی تہذیب کو اپنی تخلیقات کے ذریعے حیات جاوداں عطا کی۔ اور آج حیدرآباد دکن کی ساری دنیا میں جو ادبی اور تہذیبی شناخت ہے اس کے پیچھے یقیناً ڈاکٹر زور کی خدمات پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر زور کے والد حضرت زعمؔ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے آباء واجداد سے ڈاکٹر زور کو اسلامی تعلیمات ورثہ میں ملیں۔ جن کی پاسداری ڈاکٹر زور نے زندگی بھر کیں۔ اور اپنے بچوں کی بھی اسی نہج پر تربیت کی۔ ان کی زندگی کے سفر میں انہیں بیگم تہنیت النساء کی شکل میں ایک حقیقی رفیق سفر ملا تھا جو ایک نیک سیرت خاتون اور نعت گو شاعرہ تھیں انہوں نے ڈاکٹر زور کے علمی سفر اور کاروان حیات میں بخوبی ساتھ دیا۔ ڈاکٹر زور ایک بہترین استاذ، ایک شفیق باپ اور دوستوں میں ہر دلعزیز دوست تھے۔ وہ دکنی زبان وادب کے سچے پرستار تھے۔ اپنی علمی قابلیت سے نا مساعد حالات میں بیرون ملک جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی اپنے وطن کی زبان دکنی کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات کی شکل میں لسانیات کے شعبے میں دو شاہکار کتابیں لکھیں۔ اور اردو میں سائنسی بنیادوں پر زبان کے مطالعے کو پیش کرتے ہوئے لسانیات کے شعبے میں اولیت کا مقام حاصل کیا۔ دکنی کی لسانی خصوصیات کو انہوں نے دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ اور لسانیات کے مطالعے کے امکانات پیدا کئے۔ اردو کے آغاز اور ارتقاء کے بارے میں ان کے نظریات تحقیقی بنیادوں پر رد نہیں کئے جا سکتے۔

ڈاکٹر زور نے دوران تعلیم تحقیق کی مبادیات سیکھی تھیں۔ اس لئے انہوں نے دکنی زبان وادب کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اردو شہ پارے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ طالب وموہنی کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ تاریخ ادب اردو۔ رمز سخن۔ بادۂ سخن۔ فیض سخن۔ متاع سخن۔ مرقع سخن۔ جیسی کتابوں کے ذریعے دکن کے گمنام شعرا اور ادیبوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیقی کتابوں میں جو مطالعہ

پیش کیا ہے اسے بنیاد بنا کر دکنی کے نئے محققین اردو تحقیق کا دامن وسیع کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر زور اردو کے نامور نقاد بھی رہے۔ حالؔی نے اردو میں جدید تنقید کی شروعات کیں۔ لیکن ڈاکٹر زور نے پہلی مرتبہ مغربی تنقید کی روشنی میں اردو میں تنقید نگاری کو روشناس کرایا۔ تنقید کے باب میں ان کی تصانیف روح تنقید۔ اردو کے اسالیب بیان۔ تین شاعر۔ جواہر سخن۔ ادبی تاثرات ادبی تحریریں ان کے سائنٹفک نظریہ تنقید کو پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر زور کے تنقیدی نظریات ان کے تحریر کردہ دیباچوں اور مقدموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کا ایک اہم کارنامہ قدیم مخطوطات کے تعارف کا ہے جب کہ انہوں نے تذکرہ مخطوطات کی پانچ جلدوں میں ادارہ ادبیات اردو اور حیدرآباد میں واقع نادر مخطوطات کا مکمل تعارف پیش کیا۔ ان تذکروں کو بنیاد بنا کر مخطوطات شناسی کے ماہرین اردو تحقیق میں پیش قدمی کر سکتے ہیں اور قدیم مخطوطات میں پوشیدہ ادب کے فن پاروں کو اردو دنیا سے روشناس کرا سکتے ہیں۔ سوانح نگاری کے باب میں ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ، غالب، میر محمد مومن، حاتم اور گارساں دتاسی کی سوانح لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا۔

دکنی تہذیب سے محبت کی نشانی تھی کہ ڈاکٹر زور نے افسانہ نگاری میں بھی تاریخ دکن کی مختلف کہانیوں کو افسانوں کا روپ دیا اور ان کے افسانوی مجموعے گولکنڈے کے ہیرے اور سیر گولکنڈہ میں شامل افسانے دکن کی تہذیب کی داستان پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اپنے دوستوں کو جو مکاتیب لکھے ان میں ان کے عہد کے علمی و ادبی مسائل اور اردو زبان سے متعلق امور کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی شاعری ایک محبّ اردو کی شاعری ہے۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر زور کی ادبی تصانیف دکنی تہذیب کا خزانہ ہیں۔ اور اردو ادب میں تحقیق، تنقید، تدوین، لسانیات، افسانہ اور سوانح نگاری و تاریخ نگاری کے باب میں اہم اضافہ ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کہ علاقہ دکن میں آندھرا پردیش ریاست کی تقسیم کے بعد ریاست تلنگانہ کی تشکیل عمل میں آئی ہے اور اس کی نئی حکومت تلنگانہ تہذیب کے احیاء کے طور پر قدیم دکنی تہذیب کو پروان چڑھانے کی کوشش کر رہی ہے ایسے میں ڈاکٹر زور جیسے محبّ اردو کے لئے یہی خراج ہوسکتا ہے کہ ان کے نام پر تلنگانہ میں ایک دکنی کی یادگار قائم کیا جائے۔ دکنی زبان کے احیاء کے لئے تحقیقی مرکز قائم کیا جائے اور ڈاکٹر زور کی ادبی تصانیف کی روشنی میں دکن کی کھوئی ہوئی تہذیب کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ادبی تصانیف اور ان کی علمی و ادبی خدمات ضرور مشعل راہ ثابت ہوں گی۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم　　زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

کتابیات

کتابیات

سلسلہ نشان	نام مصنف	نام کتاب	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱۔	ابرارالباقی ڈاکٹر	تصانیف ڈاکٹر زور کی وضاحتی کتابیات	دہلی	۲۰۰۹ء
۲۔	احسان الحق محمد	کربل کتھا (مرتبہ)	لاہور	۱۹۸۰ء
۳۔	احسن فاروقی محمد (ڈاکٹر)	اردو میں تنقید	دہلی	۱۹۹۰ء
۴۔	ارم سلیم	اردو ادب میں مقدمہ نگاری کی روایت	لاہور	۱۹۸۸ء
۵۔	اطہر پرویز	ادب کا مطالعہ	علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۶۔	افتخار شفیع محمد	اصنافِ نثر	دہلی	۱۹۹۰ء
۷۔	اکبرالدین صدیقی	مشاہیر قندھار	حیدرآباد	۱۹۳۶ء
۸۔	اکبرالدین صدیقی	یادگار زور	حیدرآباد	۱۹۴۰ء
۹۔	اکبر حیدری ڈاکٹر	مطالعہ زور	لکھنو	۱۹۶۶ء
۱۰۔	انورالدین محمد پروفیسر	حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل۔حیدرآباد		۱۹۹۰ء
۱۱۔	انیس قیوم فیاض	حیدرآباد میں افسانہ نگاری	حیدرآباد	۱۹۸۰ء
۱۲۔	حفیظ قتیل ڈاکٹر	راہ رواور کارواں	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۱۳۔	خلیق انجم	محی الدین قادری زور	دہلی	۱۹۸۹ء
۱۴۔	خواجہ حمیدالدین شاہد	حیدرآباد کے شاعر	حیدرآباد	۱۹۶۴ء
۱۵۔	رشید حسن خان	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	لکھنو	۱۹۸۰ء
۱۶۔	زینت ساجدہ ڈاکٹر	حیدرآباد کے ادیب	حیدرآباد	۱۹۸۰ء
۱۷۔	سید غلام محمد شاہ رفاعی القادری، زعم۔خودنوشت سوانح		غیر مطبوعہ	
۱۸۔	سیدہ جعفر پروفیسر	دکنی نثر کا انتخاب	دہلی	۱۹۸۸ء
۱۹۔	سیدہ جعفر پروفیسر	ڈاکٹر زور	دہلی	۱۹۹۰ء
۲۰۔	سیدہ جعفر پروفیسر	کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' کی تدوین۔حیدرآباد۔		۱۹۹۲ء

۲۱۔	سیدہ جعفر پروفیسر	تاریخ ادب اردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک	حیدرآباد	۲۰۰۲ء
۲۲۔	شارب ردولوی ڈاکٹر	جدید اُردو تنقید اُصول ونظریات	لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۲۳۔	صابرہ سعید	اردو میں خاکہ نگاری	حیدرآباد	۱۹۹۰ء
۲۴۔	عبادت بریلوی، ڈاکٹر،	مقدمات عبدالحق	لاہور	۱۹۶۴ء
۲۵۔	عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقاء	علی گڑھ	۱۹۹۵ء
۲۶۔	عبداللہ سید	ادبی اصطلاحات (پروفیسر انور جمال)	اسلام آباد	۲۰۱۲ء
۲۷۔	عبدالستار دلوی	ادبی اور لسانی تحقیق (مرتبہ)	ممبئی	۱۹۸۴ء
۲۸۔	عطیہ رحمانی	ڈاکٹر زور شخصیت اور کارنامے۔	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۲۹۔	علی احمد فاطمی ڈاکٹر	تاریخی ناول فن اور اصول	الہ آباد	۱۹۸۰ء
۳۰۔	علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب	علی گڑھ	۱۹۵۱ء
۳۱۔	قاضی عبدالودود	اردو اور لسانی تحقیق	دہلی	۱۹۸۱ء
۳۲۔	گوپی چند نارنگ	ادبی تنقید اور اسلوبیات	دہلی	۱۹۸۹ء
۳۳۔	گیان چند جین پروفیسر	تحقیق کا فن	لکھنو	۱۹۹۰ء
۳۴۔	گیان چند جین پروفیسر	ذکر وفکر	لکھنو	۱۹۹۰ء
۳۵۔	گیان چند جین پروفیسر	اردو کی نثری داستانیں	کراچی	۱۹۵۴ء
۳۶۔	محمد بن عمر	ڈاکٹر زور	حیدرآباد	۱۹۵۵ء
۳۷۔	محمد علی اثر۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ نصابی کتاب عثمانیہ یونیورسٹی۔۔		حیدرآباد	۱۹۹۹ء
۳۸۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	روح تنقید	حیدرآباد	۱۹۲۵ء
۳۹۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سفرنامہ یورپ	حیدرآباد	۱۹۲۷ء
۴۰۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	طلسم تقدیر	حیدرآباد	۱۹۲۷ء
۴۱۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	اردو کے اسالیب بیان	حیدرآباد	۱۹۲۷ء
۴۲۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تنقیدی مقالات	حیدرآباد	۱۹۳۲ء
۴۳۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	فن انشا پردازی	حیدرآباد	۱۹۳۵ء
۴۴۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سیر گولکنڈہ	حیدرآباد	۱۹۳۶ء

۴۵۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	ہندوستانی لسانیات	حیدرآباد	۱۹۳۶ء
۴۶۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	اردو شہ پارے	حیدرآباد	۱۹۳۷ء
۴۷۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	گولکنڈ کے ہیرے	حیدرآباد	۱۹۳۷ء
۴۸۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	گارساں دتاسی	حیدرآباد	۱۹۴۱ء
۴۹۔	محی الدین قادری زور۔ تبصرہ ادارہ ادبیات اردو کی ۱۹۴۲ کی مصروفیات۔ حیدرآباد			۱۹۴۲ء
۵۰۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سرگذشت حاتم	حیدرآباد	۱۹۴۴ء
۵۱۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	فرخندہ بنیاد حیدرآباد	حیدرآباد	۱۹۵۲ء
۵۲۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	اردو شاعری کا انتخاب	حیدرآباد	۱۹۶۰ء
۵۳۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	دکنی ادب کی تاریخ	حیدرآباد	
۵۴۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	حیدرآباد	
۵۵۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو (مرتبہ)	حیدرآباد	
۵۶۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	داستان ادب	حیدرآباد	
۵۷۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	نجی ڈائری (غیر مطبوعہ)	حیدرآباد	
۵۸۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	حیدرآباد	
۵۹۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد دوم	حیدرآباد	
۶۰۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد سوم	حیدرآباد	
۶۱۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد چہارم	حیدرآباد	
۶۲۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد پنجم	حیدرآباد	
۶۳۔	مرزا اکبر علی بیگ پروفیسر	عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔	حیدرآباد	۱۹۸۷ء
۶۴۔	مرزا اکبر علی بیگ پروفیسر	مرزا علی لطف حیات اور کارنامے۔	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۶۵۔	مرزا خلیل بیگ	اردو زبان کی تاریخ	دہلی	۱۹۸۸ء
۶۶۔	مرزا خلیل بیگ	اردو کی لسانی تشکیل	دہلی	۱۹۸۲ء
۶۷۔	مغنی تبسم پروفیسر۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیات، شخصیت اور کارنامے۔ حیدرآباد۔			۲۰۰۵ء
۶۸۔	نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو	دہلی	۱۹۸۵ء

۶۹۔ نورالحسن نقوی فن تنقید اور اردو تنقید نگاری علی گڑھ ۱۹۸۱ء

۷۰۔ اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول

۷۱ یادگار زور۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

رسائل

سلسلہ نشان	رسالہ	مدیر	سنہ اشاعت
۱۔	سب رس زور نمبر (حیدرآباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۶۲ء
۲۔	سب رس زور نمبر (حیدرآباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۶۳ء
۳۔	سب رس زور نمبر (حیدرآباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۷۰ء
۴۔	سب رس زور نمبر (حیدرآباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۷۲ء
۵۔	سب رس زور نمبر۔ کراچی		۷۹۔۱۹۷۸ء جلد ۲ شمارہ ۲،
۶۔	سب رس زور نمبر (کراچی)	خواجہ حمید الدین شاہد	جنوری ۱۹۷۹ء
۷۔	سب رس زور نمبر (حیدرآباد)		نومبر ۱۹۸۰ء
۸۔	سب رس زور نمبر (حیدرآباد)	پروفیسر مغنی تبسم	نومبر ۱۹۹۶ء
۹۔	سب رس تہنیت۔ زور نمبر (حیدرآباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۶۳ء
۱۰۔	سب رس، حیدرآباد (تہنیت النساء بیگم زور نمبر)		نومبر ۱۹۹۸ء
۱۱۔	شیرازہ۔ دوماہی کشمیر۔ مئی ۱۹۶۳ء		
۱۲۔	سالانہ بزم اردو۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ		۱۳۴۱ فصلی ۱۳۴۲ فصلی مطابق ۳۳۔۱۹۳۲ء
۱۳۔	مجلّہ عثمانیہ جشن الماس حیدرآباد ۱۹۶۹ء		
۱۴۔	مرقع جامعہ عثمانیہ جشن الماس کراچی ۱۹۹۴ء		
۱۵۔	رسالہ ساقی لاہور۔ ۱۹۳۷ء		
۱۶۔	ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۱ء		

تحقیقی مقالے

۱۔ ڈاکٹر زور اور ان کے نامور رفقائے کار۔ فاطمہ آصف عثمانیہ یونیورسٹی

۲۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار آمنہ آفرین ۱۹۹۹ء

شخصی انٹرویو

۱۔ شخصی انٹرویو، سید رفیع الدین قادری۔ حیدرآباد۔ یکم جنوری ۱۹۹۸ء

۲۔ شخصی انٹرویو، محترمہ تسنیم زور۔ حیدرآباد۔ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۰ء

۳۔ شخصی انٹرویو، توقیر النساء بیگم۔ حیدرآباد۔ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

تلخیص مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی اردو

مقالہ نگار

نکہت آرا شاہین

نگران

پروفیسر محمد انورالدین

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔ تلنگانہ اسٹیٹ

DR ZORE KI ADABINIGARISHAT KA TAHQEQI WO TNANQUIDI JAEZA

SYNOPSIS OF THE THESIS

SUBMITTEDY BY : NIKHAT ARA SHAHEEN

GUIDED BY: PROF MOHAMMED ANWARUDDIN

DEPT OF URDU UNIVERSITY OF HYDERABAD

TELANGANA STATE- NOVEMBER 2015

ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

تلخیص مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی اردو

تعارف

سرزمین حیدرآباد دکن اور یہاں کی مادر علمیہ جامعہ عثمانیہ کو اپنے جن مایہ ناز سپوتوں پر ناز رہا ہے ان میں ایک ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، دکن کے دوسرے کوہِ نور تھے۔ دکنی زبان وادب اور دکنی تہذیب کے فروغ میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں ایک قد آور شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نامور ماہر لسانیات، بلند پایہ محقق اور نقاد، ادیب، شاعر، افسانہ نگار، مرتب ومدون، سوانح نگار، مورخ، ادارہ ادبیات اردو کے بانی اور دکنی تہذیب کے امین و پاسدار ہمہ پہلو شخصیت تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سراپا دکنی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی اردو زبان کی ترویج اور دکنی تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانے میں گذار دی۔ چنانچہ ان کی نگارشات کے تنقیدی جائزے پر مبنی تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ڈاکٹر آف فلاسفی اردو کی ڈگری کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔ مقالے میں شامل مواد کے تعارف پر مبنی تلخیص ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

مقالے کے ابواب کا تعارف

تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کے نام اس طرح ہیں۔

☆ پہلا باب۔ ڈاکٹر زور حالات زندگی، شخصیت اور کارنامے

☆ دوسرا باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات

☆ تیسرا باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق

☆ چوتھا باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد

☆ پانچواں باب۔ ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

☆ چھٹواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب

☆ ساتواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ

☆ آٹھواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار

☆ نواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

☆ دسواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

☆ کتابیات

تحقیقی مقالے ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے دس ابواب میں پیش کردہ مواد کا اجمالی تعارف اس طرح ہے۔

☆ پہلا باب۔ڈاکٹر زور حالات زندگی، شخصیت اور کارنامے

تحقیقی مقالہ کے پہلے باب میں ڈاکٹر زور کے مفصل حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔اور مختلف ضمنی عنوانات جیسے ڈاکٹر زور کے آباء واجداد، والدین۔ ڈاکٹر زورؔ کی ولادت۔ابتدائی تعلیم۔اعلی تعلیم۔ملازمت۔ڈاکٹر زورؔ کشمیر میں۔ شادی۔ شریک حیات۔اولاد۔بیماری اور وفات۔ڈاکٹر زور کی شخصیت۔سراپا۔روزمرہ کے معمولات۔غذائی عادات۔ دوست احباب سے برتاؤ۔شاگردوں سے برتاؤ۔ مزاج کی دیگر خوبیاں، سماجی وتہذیبی خدمات، دکنی تہذیب کے محافظ۔ ادارہ ادبیات اردو کا قیام۔سب رس کا اجراء اور اس کی علمی وادبی خدمات۔خانقاہِ عنایت الٰہی کا قیام۔ قلی قطب شاہ تقاریب۔ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام۔ ایوانِ اُردو کی تعمیر، مختلف ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستگی وغیرہ کے ذریعے ڈاکٹر زور کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں اور ان کی علمی وادبی خدمات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زور کا سلسلہ نسب ان کے جداعلیٰ سید شاہ سانگڑے سلطان کے وسیلے سے حضرت قطب الاقطاب سید احمد رفاعیؒ سے ملتا ہے۔سید شاہ سانگڑے سلطان کے اولاد میں چوتھی پشت کے ایک بزرگ حاجی سید عنایت اللہ شہید ڈاکٹر زور کے دادا تھے۔ان کے فرزند سید غلام شاہ قادری زعم ڈاکٹر زور کے والد تھے اور حیدرآباد کے نامور شاعر تھے۔ڈاکٹر زور کی والدہ شبیر النساء بیگم نیک سیرت خاتون تھیں۔ڈاکٹر زور ۷۔دسمبر ۱۹۰۴ء کو حیدرآباد کے محلے شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ایک بزرگ حضرت محمد عبدالوہاب نقش بندی کے کہنے پر ڈاکٹر زور کا نام محبوب سبحانی کے نام کی مناسبت سے محی

الدین قادری رکھا گیا۔ بعد میں زور تخلص اختیار کرنے کے بعد وہ سید محی الدین قادری زور اور عرف عام میں ڈاکٹر زور کے نام سے اردو دنیا میں مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر زور کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ مدرسہ مفید الانام سے مڈل کا امتحان کامیاب کیا۔ خانگی طور پر میٹرک کامیاب کیا۔ سٹی کالج سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۲۵ء میں بی اے اور ۱۹۲۷ء سے ایم اے کیا۔ حکومت آصفیہ کی جانب سے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ پر برطانیہ جانے کا موقع ملا۔ لندن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ''ہندوستانی لسانیات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ انڈیا آفس لائبریری سے دکنی ادب سے متعلق مواد جمع کیا اور اردو شہ پارے کے نام سے کتاب شائع کی۔ صوتیات کے موضوع پر خصوصی تعلیم حاصل کیا۔ ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد واپس آئے۔ ان کی تعلیمی قابلیت دیکھتے ہوئے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں ان کا تقرر بہ حیثیت ریڈر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۵ء میں انہیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ملی۔ بعد میں ان کی خدمات کو چادرگھاٹ کالج منتقل کیا گیا۔ جہاں بحیثیت پرنسپل انہوں نے خدمات انجام دیں۔ دسمبر ۱۹۶۰ء میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کشمیر کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد نے انہیں کشمیر بلایا اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کی صدارت پیش کی۔ وہاں رہ کر بھی انہوں نے اردو کے فروغ کے کام انجام دئے۔

ڈاکٹر زور کی شادی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد کے ایک ممتاز گھرانے کی خاتون تہنیت النساء بیگم سے ہوئی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور نیک خاتون تھیں۔ اور ایک اچھی نعت گو شاعرہ بھی تھیں۔ ان سے ڈاکٹر زور کو پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر زور اور ان کی اہلیہ نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اچھے انداز میں کی۔ ان کے تمام فرزندان تقی الدین قادری، سید علی الدین قادری، صفی الدین قادری، رفیع الدین قادری اور رضی الدین قادری نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر زندگی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی بیٹیوں تہذیب النسا بیگم، توقیر النسا بیگم، توفیق النساء بیگم اور تسنیم النساء کی شادیاں بھی معزز گھرانوں میں ہوئیں۔ اور انہوں نے اپنے والدین کا نام روشن کیا۔

ڈاکٹر زور ایک زندہ دل شخصیت تھے۔ اپنے دوستوں میں بے حد مقبول تھے۔ ان کے دوستوں اور شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع رہا۔ ڈاکٹر زور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ملازمت، بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج کے علاوہ وہ فروغ اردو کے کام کرتے رہے۔ انہوں نے حیدرآباد میں دکنی زبان کے علمی و ادبی سرمایے کے فروغ اور تحفظ اور اردو زبان و تہذیب کے فروغ کے لئے ادارہ ادبیات اردو قائم کیا۔ ادارے کا ترجمان رسالہ سب رس جاری کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ خانقاہ عنایت الٰہی کی بنیاد رکھی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کا اہتمام کیا۔ اور

تحقیق، تنقید، لسانیات، سوانح، تاریخ، تدوین وترتیب، افسانہ نگاری اور شاعری میں اپنی بیش بہا تخلیقات چھوڑیں۔ اور جو کام کئی افراد مل کر صدیوں نہیں کر پاتے انہوں نے اپنی ذاتی قابلیت سے تن تنہا کیا۔ کشمیر میں ان کا قیام دو سال رہا۔ مختصر سی علالت کے بعد ۲۳ اور ۲۴ ستمبر کی راست ان کا انتقال ہو گیا۔ اورد کن کی سرزمین سے اٹھنے والا یہ کوہ نور کشمیر میں خانیار شریف کی مٹی میں دفن ہو گیا۔ ڈاکٹر زور کی حیات اور ان کے علمی وادبی کارنامے رہتی دنیا تک اردو دنیا کہ لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

☆ دوسرا باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت ماہر لسانیات

تحقیقی مقالے کے دوسرے باب سے ڈاکٹر زور کی نگارشات کے جائزے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ مقالے کے اس دوسرے باب میں بہ حیثیت ماہر لسانیات ڈاکٹر زور کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لسانیات کے شعبے میں ان کی شاہکار تصانیف ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں لسانیات کی تعریف بھی دی گئی ہے کہ زبان کے سائنسی مطالعے کو علم لسانیات کہتے ہیں۔ ڈاکٹر زور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے تین سال لندن اور پیرس میں رہے اور وہاں انہیں پروفیسر آرایل ٹرنر اور ہندوستانی زبان کے ماہرین گراہم بیلی سے مشاورت کا موقع ملا۔ اپنے مطالعے کی روشنی میں ڈاکٹر زور نے اپنی شاہکار تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کو ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب مطبوعہ شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۲ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی وسابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں لسانیات کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں اردو زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کو اس بات پر اولیت حاصل ہے کہ اردو میں لسانیات کے موضوع پر انہوں نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ ڈاکٹر زور کے نزدیک لسانیات کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ زبانوں کا تجزیہ ان کی تاریخ، ان کے باہمی نقاط ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم وگروہ بندی پر غور وخوض کیا جائے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترکہ سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ میں رہے ہیں۔ اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی''۔ (ہندوستانی لسانیات ص ۹۵) اس تصنیف کا مختلف ماہرین لسانیات نے خیر مقدم کیا۔

لسانیات کے موضوع پر ڈاکٹر زور کی دوسری تصنیف ''ہندوستانی صوتیات'' ہے۔ یہ کتاب عملی لسانیات میں اہم

مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں دکنی صوتیات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دکنی صوتیات میں اس کتاب کو معتبر درجہ حاصل ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں دکنی صوتیات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی یہ دو کتابیں اردو میں لسانیات کے موضوع پر ابتدائی نقش ہونے کے سبب بے حد مقبول ہوئیں۔ اور ڈاکٹر زور ایک ماہر لسانیات کے طور پر جانے گئے۔

☆ تیسرا باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق

تحقیقی مقالے کے اس تیسرے باب میں ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور مختلف عنوانات جیسے تحقیق کی تعریف ڈاکٹر زور بہ حیثیت محقق۔ اردو شہ پارے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ طالب و موہنی کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ تاریخ ادب اردو۔ رمز سخن۔ بادۂ سخن۔ فیض سخن۔ متاع سخن۔ مرقع سخن وغیرہ کے تحت ڈاکٹر زور کی تحقیقی نگارشات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو شہ پارے تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کی پہلی تصنیف اردو شہ پارے ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ انھوں نے دکن کے کئی ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرایا۔ دکنی ادب کی تاریخ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کتاب میں دکن کے شعراء فیروز، محمود، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، احمد، خدانما، محمد قطب شاہ شوقی، خیالی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، مقیمی، سلطان، جنیدی، ابن نشاطی، میراں یعقوب، طبعی امین، فائز، لطیف نوری شاہی مرزا اور غلام علی جیسے شعراء کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعرا کے تعارف بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔

''تذکرہ گلزار ابراہیم'' ڈاکٹر زور کی ایک کامیاب تحقیقی کاوش ہے۔ جسے 1934ء میں ترتیب دے کر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو کے تحت شایع کیا۔ ڈاکٹر زور نے ''تذکرہ گلزار ابراہیم'' کو مرتب کر کے اردو کے قدیم و جدید تذکروں میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ اس تذکرہ میں 320 شعراء کا تذکرہ شامل ہے۔ ان میں سے بیشتر شعراء کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔ جیسے مرزا بیدل، تانا شاہ، ولی اللہ اشتیاق، رنگین کاشمیری، سیتا رام، عمدہ کشمیری، قبول کاشمیری منشی کشن مجروح کاشمیری وغیرہ۔

''دکنی ادب کی تاریخ'' دکن کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو دانوں میں متعارف کرانے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں بہت زیادہ طویل مباحث نہیں ہیں بلکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

''طالب وموہنی'' بھی ہے۔ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو۱۹۵۷ء میں ادارہ ادبیات اردو سے شایع کرایا۔''طالب وموہنی'' دراصل مہاراشٹرا کے ایک تاریخی شہر پرینڈہ کی پرانی داستان عشق ہے جس کو سید محمد وآلہ موسوی نے ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء سے قبل منظوم کیا تھا۔

''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' ڈاکٹر زور کا ایک اہم تحقیقی وتدوینی کارنامہ ہے۔جس سے ان کی تحقیقی وترتیب متن کی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔اس کلیات کا مقدمہ بھی بہت ہی وقیع ہے۔جس کے مطالعہ کے بغیر دکنی اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ تین حصوں پر مبنی ہے۔پہلے حصہ میں ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ۲۲۰ نظمیں اور ۱۶۳۹ اشعار ہیں۔ دوسرے حصہ میں ۲۹۶ صفحات میں ۳۱۲ غزلیں ۲۲۵۴ اشعار ہیں۔تیسرے حصہ میں دیگر اصناف سخن یعنی قصائد، رباعیات، مراثی، ریختی اور مثنویاں ۱۳۸۹ اشعار میں کہی گئی ہیں۔ڈاکٹر زور کے مقدمے سے ان کی تحقیق وتنقید اور ان کی بلند پروازی اور وسعت نظری کا پتہ چلتا ہے۔اردو ادب کی کتابوں میں جتنے مقدمے لکھے گیے ان میں ڈاکٹر زور کے مقدمہ کو مبسوط مربوط اور سیر حاصل کہا جاسکتا ہے۔اس مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے شاعر کے تمام زندگی کے پہلوؤں کو حسین انداز میں پیش کیا ہے۔کلیات محمد قلی قطب شاہ کے جائزے کے علاوہ اس باب میں ڈاکٹر زور کے دیگر تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اردو تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کی گراں بہا خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

☆ چوتھا باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت نقاد

تحقیقی مقالے کے اس چوتھے باب میں ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ابتدا میں تنقید کی تعریف اور اردو میں تنقید کی روایت بیان کی گئی ہے اس کے بعد ڈاکٹر زور کی تنقیدی نگارشات۔روح تنقید۔اردو کے اسالیب بیان۔تین شاعر۔جواہر سخن۔ادبی تاثرات۔ ادبی تحریریں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''روح تنقید'' (۱۹۲۵ء) تنقید پر ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔اس کتاب کا تعارف عمر یافعی لکھا ہے۔دیباچہ خود ڈاکٹر زور نے لکھا ہے،اس کتاب کے دو حصے ہیں۔پہلا حصہ مبادی تنقید سے متعلق ہے جس میں تنقید وادب کی تعریف، ادب کی پیدائش، ادب کی تقسیم، ادب کا مقصد، تنقید کا مقصد، تنقید نگاری کے فرائض، تنقید نگار کی نگہداشت، اصول تنقید میر حسن اور ان کی مثنوی ''سحر البیان'' پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس کتاب کا دوسرا حصہ ارتقائے تنقید سے متعلق ہے۔اس

حصہ میں مشہور یونانی اور روم کے فلاسفر کے تنقیدی تصورات کو پیش کرتے ہوئے فرانس و انگلستان میں تنقید کے ارتقا کو پیش کیا ہے۔اس کے بعد اٹھارویں صدی کے بعد تنقید کی ترقی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پھر کولرج ورڈ سورتھ، میاتھیو آرنلڈ جیسے مشہور نقادوں کی تنقیدی تصورات کو پیش کیا ہے۔آخر میں کتاب میں درج مصنفین اور مصنفات کی فہرست دی گئی ہے۔''روح تنقید''میں ڈاکٹر زور نے اردو داں طبقہ کو مغربی اصول تنقید سے واقف کرانا۔اور اس کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی تنقیدی تصورات کا سراغ لگایا۔

ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری ''اردو کے اسالیب بیان'' میں بھی ملتی ہے۔ان کی یہ تصنیف ۱۹۲۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ تصنیف اردو نثر کی تنقیدی تاریخ ہے۔اس کتاب کے میں ڈاکٹر زور نے اردو کے قدیم و جدید اساتذۂ فن کے طرز و اسلوب پر ناقدانہ رائے زنی کی ہے اور اردو نثر کے ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

''جواہر سخن'' ڈاکٹر زور کا مختصر کتابچہ ہے۔ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف بھی تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ استصنیف میں قصہ ملک مصر، قصہ لال و گوہر کو ایک ہی شاعر کی تخلیقات قرار دیا ہے۔''جواہر سخن'' دراصل ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے حکم سے مولوی محمد مبین عباسی چریا کوٹی نے چار جلدوں میں اردو شاعری کا انتخاب مرتب کیا تھا۔جس پر ڈاکٹر زور نے طویل تبصرہ کیا تھا جسے بعد میں کتابی شکل میں شایع کیا گیا۔

''ادبی تحریریں'' ڈاکٹر زور کی تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔مضامین کی تفصیل اس طرح ہے۔کشمیر اور اردو، اردو اور قومی یکجہتی، دکنی ادب، ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں، قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام، مولانا رومی اور علامہ اقبال، صف شعرا و سری نگر، رسا جاودانی، مخمور حسین بدخشی، تمکین کاظمی، بھارت چند کھنہ، بانو طاہرہ سعید، اردو ہندی اور پنجابی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان مضامین کو ترتیب دے کر شائع کیا اور ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے بحیثیت تنقید نگار فن تنقید نگاری پر اس وقت لکھا جب کہ تنقید اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ نیز انھوں نے اردو ادب کو مغربی تنقیدی تصورات سے بھی آشنا کرایا۔ڈاکٹر زور نے تنقید نگاری میں عملی تنقید اور نظری تنقید دونوں میں اپنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ڈاکٹر زور کی تنقید نگاری اردو ادب میں ایک اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے۔

☆ پانچواں باب۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری

تحقیقی مقالے کے پانچویں باب میں دیباچہ نگاری کی تعریف اور روایت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری کے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔دیباچہ نگاری کو اس وقت مقبولیت ملی جب کتابوں کی طباعت عام ہونے لگی اور

ادیب اور شاعر ماہرین ادب سے دیباچہ کی شکل میں تعارفی اور توصیفی مضامین لکھا کہ اپنی کتاب میں شامل کرنے لگے۔ ڈاکٹر زور نے بھی کئی ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کے دیباچے لکھے۔ڈاکٹر زور کی دیباچہ نگاری یا پیش لفظ ایسے ہوتے ہیں جن کے مطالعہ سے کتاب کی اصل روح سمجھ میں آجاتی ہے۔قاری کتاب کے مطالعہ سے قبل اس کا مرکزی خیال سمجھ جاتا ہے۔ان کے اکثر دیباچے عمیق مطالعے اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہیں کہیں کہیں مصروفیتوں کے باعث سرسری بھی ہیں لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ڈاکٹر زور نے جن کتابوں کے دیباچے تحریر کیے ہیں ان کے موضوعات شعر و ادبی، تاریخی معاشرتی، اقتصادی و سائنسی، تنقیدی ولسانی اور نفسیاتی اور فلسفیانہ ہیں۔ان کے علاوہ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ان تمام دیباچوں میں ان کے وسیع مطالعے اور مختلف موضوعات پر ان کی دسترس کا بین ثبوت ملتا ہے۔

☆ چھٹواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مرتب

ڈاکٹر زور نے قدیم مخطوطات کی ترتیب کا اہم کام انجام دیا۔ اور تذکرہ مخطوطات جلد اول۔تذکرہ مخطوطات جلد دوم۔تذکرہ مخطوطات جلد سوم۔تذکرہ مخطوطات جلد چہارم۔تذکرہ مخطوطات جلد پنجم کے نام سے پانچ کتابیں ترتیب دیں۔ان تذکروں کا جائزہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔اس کے چوبیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں محمد اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر دونوں کے اشتراک عمل سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ڈاکٹر زور نے نہ صرف قلمی کتابوں کی فہرست بنائی بلکہ ان مخطوطہ کے تعلق سے دستیاب مواد اور متن کو فہرست میں شامل کر دیا۔انھوں نے جو مخطوطات جمع کیے ہیں ان میں اردو، عربی، ہندی، سنسکرت زبان کے مخطوطات ہیں۔ڈاکٹر زور نے مخطوطہ کے تعارف کے سلسلہ میں احوال وکوائف کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ڈاکٹر زور کے مرتبہ تذکرے ایک عام آدمی کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہیں کیوں کہ اس میں صرف کتابوں کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ مصنف، کتابت اور متعلقہ اشخاص و مقامات کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔کئی شعراء کے کلیات اور دیوان، مذہبی کتابیں، تاریخی مواد اور تذکرے اور اصحاب علم وفن کے بیاض و یادداشتیں اور خطوط کی تفصیل بھی فراہم کر دی ہے۔ڈاکٹر زور نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ ریزی سے پانچ جلدوں میں مخطوطات کی تفصیل فراہم کر دی۔ڈاکٹر زور سے قبل بھی مخطوطات پر دیگر شخصیتوں پروفیسر سروری، شمس اللہ قادری، نصیرالدین ہاشمی وغیرہ نے کام کیا لیکن ڈاکٹر زور نے تشنہ طلب امور کو مکمل کیا اور مخطوطے کی ظاہری حالت جیسے تقطیع اوراق، نہج خط، مسطر، سنہ تصنیف، سنہ کتابت، کاتب کا نام، کاغذ روشنائی وغیرہ تک کا تذکرہ کیا اور مخطوطے تمام

ناقص پہلوؤں کی حالت کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ اس کی سدھار اور استحکام کے لیے بھی کوشش کی اور اس کو محفوظ کر دیا۔

☆ ساتواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت سوانح نگار و مورخ

تحقیقی مقالے کے اس باب میں سوانح نگاری کی تعریف اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر زور کی تحریر کردہ سوانحی تصانیف حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ۔حیات میر محمد مومن۔گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو۔ سرگذشت حاتم۔سرگذشت غالب۔ داستان ادب حیدرآباد۔فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ: اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، بانی شہر حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء۱۶۱۱ء) کی مکمل تاریخی، سوانحی اور ادبی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ایک بادشاہ کی مکمل سوانح حیات ہے۔اس کتاب کی اشاعت سے اردو کی سوانح عمری میں اضافہ ہوا اور بحیثیت مورخ ڈاکٹر زور کی شناخت ہوئی۔تاریخی موشگافیکر کے بڑی تحقیق کے بعد واقعات قلمبند کی ہیں۔قطب شاہی عہد کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشرتی زندگی ہمارے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ڈاکٹر زور نے حیات محمد قلی قطب شاہ لکھ کر اردو ادب کی دنیا میں سلطان قلی قطب شاہ کو ہمیشہ کی زندگی عطا کر دی۔

''حیات میر محمد مومن'' ڈاکٹر زور کی تاریخی سوانحی و ادبی تصنیف ہے اور ان کی تحقیقاتی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔دوسری بار ۱۹۵۸ء میں اس ادارہ سے چھپی۔کتاب اردو سوانح حیات کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہے۔میر محمد مومن قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں پیشوائے سلطنت اور وزیر اعظم تھے اور وہ اپنے وقت کے بہتر عالم، آرکیٹکٹ، معلم و سیاست داں بھی تھے۔

''گارساں دتاسی۔اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو''۔ڈاکٹر زور کی ایک اور سوانحی تصنیف ہے جس میں اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقہ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کے یورپ کی درسگاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

''سرگذشت حاتم'' استاد العشر اظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور ان کے اردو و فارسی کلام پر تبصرہ پر مبنی ہے۔اس کتاب کو ڈاکٹر زور نے ادارہ ادبیات اردو ۱۹۴۴ء میں شائع کروایا۔

''سرگذشت غالب'' ڈاکٹر زور کی ایک مختصر تصنیف ہے جس میں غالب کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کی اردو و

فارسی نثر و نظم کا اجمالاً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی حیات اور ادبی کارناموں کے علاوہ غالب کے احباب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ غالب کے شاگردوں میں ہرمہدی مجروح اور ہرگوپال تفتہ کو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر زور کی دیگر سوانحی اور تاریخی کتابوں کا جائزہ پیش کیا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے سوانحی اور تاریخی کتابیں لکھ کر ماضی کی نامور شخصیات کے کارناموں کو محفوظ کر دیا۔

☆ آٹھواں باب۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار

تحقیقی مقالے کے اس باب میں ڈاکٹر زور کی افسانوی نگارشات۔ طلسم تقدیر۔ سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈے کے ہیرے۔ میں شامل افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے یہ افسانے تاریخی ہیں۔ انہوں نے دکن کی تاریخ کو افسانوں کی شکل دی اور تاریخی افسانہ نگاری کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۲۵ء سے پہلے ہوتا ہے جب کہ انھوں نے مختلف افسانے لکھ کر ادبی رسالوں میں چھپوایا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر زور ایم اے کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر زور کے افسانوں کے کل تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ طلسم تقدیر (۱۹۲۶ء)، سیر گولکنڈہ (۱۹۳۷) اور ''گولکنڈہ کے ہیرے'' (۱۹۳۷ء)۔

''سیر گولکنڈہ'' ڈاکٹر زور کا دوسرا افسانہ ہے۔ سیر گولکنڈہ پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے سرسری مطالعہ کے طور پر نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سیر گولکنڈہ میں کل ۱۱۶ افسانے اور صفحات ۱۶۰ ہیں۔ یہ افسانے گولکنڈہ کے پس منظر میں ۱۰۱۰ھ سے ۱۰۹۸ھ کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ افسانے سن وقوع کی ترتیب کے ساتھ اس طرح درج کیے گیے ہیں۔

(۱) مشک محل ۱۰۱۰ھ (۲) مکہ مسجد ۱۰۲۳ھ (۳) کھویا ہوا چاند ۱۰۳۶ھ (۴) ملک خوشنود ۱۰۳۶ھ (۵) شہزادی کا عقد ۱۰۴۵ھ (۶) انار کے چودہ دانے ۱۰۹۰ھ (۷) اورنگ زیب و تاناشاہ (۸) کاغذی برج (۹) غیبی امداد (۱۰) آخری سرفروش (۱۱) خاصے کا وقت (۱۲) مٹی کی کلھیا۔ آخری کے چھ افسانے سقوط گولکنڈے کے متعلق ہیں۔

''گولکنڈے کے ہیرے'' ڈاکٹر زور کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں چھ افسانے ہیں۔ جس میں افسانہ بالا۔ پانچ گنڈے اور پانچ اشرفیاں وغیرہ شامل ہیں۔ اردو کے نقادوں نے ڈاکٹر زور کے تاریخی افسانوں کی ستائیش کی ہے اور

ان کے افسانوں کو تکنیک کے اعتبار سے مکمل افسانے قرار دیا ہے۔

☆ نواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

مقالے کے اس باب میں ڈاکٹر زور کی مکتوب نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر زور نے اپنے دوست احباب کو جو خطوط لکھے ان میں اپنے دور کے ادبی حالات کے علاوہ حیدرآباد کی تاریخ اور تہذیب کے بہت سے نقوش پائے جاتے ہیں جن پر ان کے خطوط کی روشنی میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

☆ دسواں باب۔ڈاکٹر زور بہ حیثیت شاعر

مقالے کے اس آخری باب میں بہ حیثیت شاعر ڈاکٹر زور کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے زور تخلص اختیار کیا اور نظمیں اور غزلیں کہیں۔ڈاکٹر زور کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک دور جامعہ عثمانیہ کا ہے یعنی ڈاکٹر زور جامعہ میں زیر تعلیم تھے۔یہ دور ان کی شاعری کا ابتدائی دور بھی ہے۔دوسرا دور قیام کشمیر کا ہے جب وہ وہاں فارسی اور اردو کے معلم تھے۔ ڈاکٹر زور کی ابتدائی شاعری میں ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر داخلی ہے اور ذوق سخن روایتی اور عمومی تھا ان میں غالب اور مومن کا سا رنگ پوری طرح نہیں چڑھا تھا۔ان کی نظموں اور غزلوں میں شب مہتاب،شب وصال،محبوب،نگہہ ناز،دیدۂ گریاں،انفاس مسیحا جیسی اصطلاحیں ہمیں ملتی ہیں۔ان کی مشہور نظم نونہالان دکن ہے۔ڈاکٹر زور کی ابتدائی نظمیں ہلکی پھلکی اور عشقیہ مزاج کی حامل ہیں۔عنفوان شباب کے لطیف اور معصوم جذبات سے معمور ہیں۔ان کی ایک اور مشہور نظم ''جامعہ عثمانیہ'' ہے۔انہوں نے غزلیں بھی کہیں۔ڈاکٹر زور کے کلام میں رجائیت کا احساس ملتا ہے۔وہ زندہ دلی اور متحرک زندگی کے قائل ہیں۔قنوطیت اور نا امید سے وہ بیگانہ ہیں۔انسان کو دعوت عمل دیتے ہیں۔زندگی میں ایسا کچھ کر جانے کے قائل ہیں جو انھیں حیات جاویداں بنا دے۔

ڈاکٹر زورؔ نے جتنی بھی شاعری کی وہ انھیں اردو کے بلند پایہ شاعر باور کرانے کے لیے کافی ہے۔لیکن ان کی دوسری ادبی و تحقیقی کاوشوں کی بدولت شاعرانہ روپ مدھم نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر اہل قلم ادیب حضرات نے زیادہ توجہ نہیں کی۔لیکن پھر بھی ڈاکٹر زور اپنے قلیل سرمایہ کے باوجود شعراء کی صف میں مقام پانے کے ضرورت مستحق ہیں۔

اس طرح تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر زور کی ادبی نگارشات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' اختتام کو پہونچتا ہے۔

اس مقالے کی تیاری کے لئے جن کتابوں،رسائل اور شخصی انٹرویو سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل کتابیات کے تحت دی جارہی ہے۔

کتابیات

سلسلہ نشان	نام مصنف	نام کتاب	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱۔	ابرار الباقی ڈاکٹر	تصانیف ڈاکٹر زور کی وضاحتی کتابیات	دہلی	۲۰۰۹ء
۲۔	احسان الحق محمد	کربل کتھا (مرتبہ)	لاہور	۱۹۸۰ء
۳۔	احسن فاروقی محمد (ڈاکٹر)	اردو میں تنقید	دہلی	۱۹۹۰ء
۴۔	ارم سلیم	اردو ادب میں مقدمہ نگاری کی روایت	لاہور	۱۹۸۸ء
۵۔	اطہر پرویز	ادب کا مطالعہ	علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۶۔	افتخار شفیع محمد	اصنافِ نثر	دہلی	۱۹۹۰ء
۷۔	اکبر الدین صدیقی	مشاہیر قندھار	حیدرآباد	۱۹۳۶ء
۸۔	اکبر الدین صدیقی	یادگار زور	حیدرآباد	۱۹۴۰ء
۹۔	اکبر حیدری ڈاکٹر	مطالعہ زور	لکھنو	۱۹۶۶ء
۱۰۔	انور الدین محمد پروفیسر	حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل۔ حیدرآباد		۱۹۹۰ء
۱۱۔	انیس قیوم فیاض	حیدرآباد میں افسانہ نگاری	حیدرآباد	۱۹۸۰ء
۱۲۔	حفیظ قتیل ڈاکٹر	راہ رو اور کارواں	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۱۳۔	خلیق انجم	محی الدین قادری زور	دہلی	۱۹۸۹ء
۱۴۔	خواجہ حمید الدین شاہد	حیدرآباد کے شاعر	حیدرآباد	۱۹۶۴ء
۱۵۔	رشید حسن خان	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	لکھنو	۱۹۸۰ء
۱۶۔	زینت ساجدہ ڈاکٹر	حیدرآباد کے ادیب	حیدرآباد	۱۹۸۰ء
۱۷۔	سید غلام محمد شاہ رفاعی القادری، زعمؔ۔ خودنوشت سوانح غیر مطبوعہ			
۱۸۔	سیدہ جعفر پروفیسر	دکنی نثر کا انتخاب	دہلی	۱۹۸۸ء
۱۹۔	سیدہ جعفر پروفیسر	ڈاکٹر زور	دہلی	۱۹۹۰ء
۲۰۔	سیدہ جعفر پروفیسر	کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' کی تدوین۔ حیدرآباد۔		۱۹۹۲ء
۲۱۔	سیدہ جعفر پروفیسر	تاریخ ادب اردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک	حیدرآباد	۲۰۰۲ء
۲۲۔	شارب ردولوی ڈاکٹر	جدید اُردو تنقید اُصول و نظریات	لکھنؤ	۱۹۸۱ء

۲۳۔	صابرہ سعید	اردو میں خاکہ نگاری	حیدرآباد	۱۹۹۰ء
۲۴۔	عبادت بریلوی، ڈاکٹر،	مقدمات عبدالحق	لاہور	۱۹۶۴ء
۲۵۔	عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقاء	علی گڑھ	۱۹۹۵ء
۲۶۔	عبداللہ سید	ادبی اصطلاحات (پروفیسر انور جمال)	اسلام آباد	۲۰۱۲ء
۲۷۔	عبدالستار دلوی	ادبی اور لسانی تحقیق (مرتبہ)	ممبئی	۱۹۸۴ء
۲۸۔	عطیہ رحمانی	ڈاکٹر زور شخصیت اور کارنامے۔	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۲۹۔	علی احمد فاطمی ڈاکٹر	تاریخی ناول فن اور اصول	الہ آباد	۱۹۸۰ء
۳۰۔	علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب	علی گڑھ	۱۹۵۱ء
۳۱۔	قاضی عبدالودود	اردو اور لسانی تحقیق	دہلی	۱۹۸۱ء
۳۲۔	گوپی چند نارنگ	ادبی تنقید اور اسلوبیات	دہلی	۱۹۸۹ء
۳۳۔	گیان چند جین پروفیسر	تحقیق کا فن	لکھنو	۱۹۹۰ء
۳۴۔	گیان چند جین پروفیسر	ذکر و فکر	لکھنو	۱۹۹۰ء
۳۵۔	گیان چند جین پروفیسر	اردو کی نثری داستانیں	کراچی	۱۹۵۴ء
۳۶۔	محمد بن عمر	ڈاکٹر زور	حیدرآباد	۱۹۵۵ء
۳۷۔	محمد علی اثر۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ نصابی کتاب عثمانیہ یونیورسٹی۔۔		حیدرآباد	۱۹۹۹ء
۳۸۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	روح تنقید	حیدرآباد	۱۹۲۵ء
۳۹۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سفرنامہ یورپ	حیدرآباد	۱۹۲۷ء
۴۰۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	طلسم تقدیر	حیدرآباد	۱۹۲۷ء
۴۱۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	اردو کے اسالیب بیان	حیدرآباد	۱۹۲۷ء
۴۲۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تنقیدی مقالات	حیدرآباد	۱۹۳۲ء
۴۳۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	فن انشا پردازی	حیدرآباد	۱۹۳۵ء
۴۴۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سیر گولکنڈہ	حیدرآباد	۱۹۳۶ء
۴۵۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	ہندوستانی لسانیات	حیدرآباد	۱۹۳۶ء
۴۶۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	اردو شہ پارے	حیدرآباد	۱۹۳۷ء
۴۷۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	گولکنڈ کے ہیرے	حیدرآباد	۱۹۳۷ء
۴۸۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	گارساں دتاسی	حیدرآباد	۱۹۴۱ء

۴۹۔	محی الدین قادری زور۔ تبصرہ ادارہ ادبیات اردو کی ۱۹۴۲ کی مصروفیات۔ حیدرآباد			۱۹۴۲ء
۵۰۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	سرگذشت حاتم	حیدرآباد	۱۹۴۴ء
۵۱۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	فرخندہ بنیاد حیدرآباد	حیدرآباد	۱۹۵۲ء
۵۲۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	اردو شاعری کا انتخاب	حیدرآباد	۱۹۶۰ء
۵۳۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	دکنی ادب کی تاریخ	حیدرآباد	
۵۴۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	حیدرآباد	
۵۵۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو (مرتبہ)	حیدرآباد	
۵۶۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	داستان ادب	حیدرآباد	
۵۷۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	نجی ڈائری (غیر مطبوعہ)	حیدرآباد	
۵۸۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	حیدرآباد	
۵۹۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد دوم	حیدرآباد	
۶۰۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد سوم	حیدرآباد	
۶۱۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد چہارم	حیدرآباد	
۶۲۔	محی الدین قادری زور ڈاکٹر	تذکرہ اردو مخطوطات جلد پنجم	حیدرآباد	
۶۳۔	مرزا اکبر علی بیگ پروفیسر	عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔	حیدرآباد	۱۹۸۷ء
۶۴۔	مرزا اکبر علی بیگ پروفیسر	مرزا علی لطف حیات اور کارنامے۔	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۶۵۔	مرزا خلیل بیگ	اردو زبان کی تاریخ	دہلی	۱۹۸۸ء
۶۶۔	مرزا خلیل بیگ	اردو کی لسانی تشکیل	دہلی	۱۹۸۲ء
۶۷۔	مغنی تبسم پروفیسر۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیات، شخصیت اور کارنامے۔ حیدرآباد۔			۲۰۰۵ء
۶۸۔	نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو	دہلی	۱۹۸۵ء
۶۹۔	نور الحسن نقوی	فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۷۰۔		اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول		
۷۱		یادگار زور۔ ادارہ ادبیات اردو		حیدرآباد

رسائل

سلسلہ نشان	رسالہ	مدیر	سنہ اشاعت
۱۔	سب رس زور نمبر (حیدر آباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۶۲ء
۲۔	سب رس زور نمبر (حیدر آباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۶۳ء
۳۔	سب رس زور نمبر (حیدر آباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۷۰ء
۴۔	سب رس زور نمبر (حیدر آباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۷۲ء
۵۔	سب رس زور نمبر۔ کراچی		۷۹۔۱۹۷۸ء جلد۲ شمارہ۲،
۶۔	سب رس زور نمبر (کراچی)	خواجہ حمید الدین شاہد	جنوری ۱۹۷۹ء
۷۔	سب رس زور نمبر (حیدر آباد)		نومبر ۱۹۸۰ء
۸۔	سب رس زور نمبر (حیدر آباد)	پروفیسر مغنی تبسم	نومبر ۱۹۹۶ء
۹۔	سب رس تہنیت۔ زور نمبر (حیدر آباد)	عبدالمجید صدیقی	۱۹۶۳ء
۱۰۔	سب رس'' حیدر آباد (تہنیت النساء بیگم زور نمبر)		نومبر ۱۹۹۸ء
۱۱۔	شیرازہ۔ دوماہی کشمیر۔ مئی ۱۹۶۳ء		
۱۲۔	سالانہ بزم اردو۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ		۱۳۴۱ فصلی ۱۳۴۲ فصلی مطابق ۳۳۔۱۹۳۲ء
۱۳۔	مجلّہ عثمانیہ جشن الماس حیدر آباد ۱۹۶۹ء		
۱۴۔	مرقع جامعہ عثمانیہ جشن الماس کراچی ۱۹۹۴ء		
۱۵۔	رسالہ ساقی لاہور۔ ۱۹۳۷ء		
۱۶۔	ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۱ء		

تحقیقی مقالے

۱۔ ڈاکٹر زور اور ان کے نامور رفقائے کار۔ فاطمہ آصف عثمانیہ یونیورسٹی

۲۔ ڈاکٹر زور بہ حیثیت افسانہ نگار آمنہ آفرین ۱۹۹۹ء

شخصی انٹرویو

۱۔ شخصی انٹرویو، سید رفیع الدین قادری۔ حیدرآباد۔ یکم جنوری ۱۹۹۸ء

۲۔ شخصی انٹرویو، محترمہ تسنیم زورؔ۔ حیدرآباد۔ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۰ء

۳۔ شخصی انٹرویو، توقیر النساء بیگم۔ حیدرآباد۔ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۰ء